علمی، ادبی، قرآنی نورانی
حقائق ودقائق، لطائف ووظائف
عجائب ونوادر، لعل وجواہر، مخفی و
ظاہر اسرار ومعانی کے علاوہ صحابہؓ وتابعینؒ،
ائمہ مجتہدینؒ، صوفیاء، مجاہدینؒ، علماء
صلحاء، اتقیاء، اذکیا کے چشم کشا بصیرت
افزاء حالات وواقعات، تاجدار گداؤں
اور بے تاج بادشاہوں کی عبرت ناک
حکایات اور اردو زبان وادب کے نامور
معماروں، قلم کاروں کے شاہکار
شہ پاروں پر مشتمل
خوب صورت گلدستہ
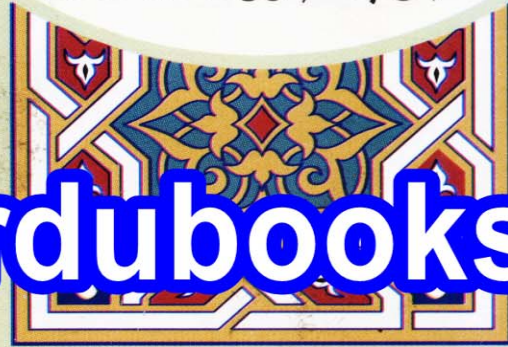
تقریظ
مولانا محمد اسلم شیخوپوری

تاثرات
ابن الحسن عباسی

ترتیب وتالیف
مولانا ثناء اللہ شجاع آبادی

علمی، ادبی، قرآنی نورانی
حقائق ودقائق، لطائف وظائف
عجائب ونوادر، لعل وجواہر، مخفی و
ظاہر اسرار ومعانی کے علاوہ صحابہؓ وتابعینؒ،
ائمہ مجتہدین، صوفیاء، مجاہدین، علماء
صلحاء، اتقیاء، اذکیا کے چشم کشا بصیرت
افزاء حالات وواقعات، تاجدار گداؤں
اور بے تاج بادشاہوں کی عبرت ناک
حکایات اور اردو زبان وادب کے نامور،
معماروں، قلم کاروں کے شاہکار
شہ پاروں پر مشتمل
خوب صورت گلدستہ

*

مولانا ثناء اللہ سعد شجاع آبادی

تقریظ

محمد اسلم شیخوپوری

تاثرات

ابن الحسن عباسی

نام کتاب .... گلہائے رنگارنگ

مرتب .... مولانا ثناءاللہ شجاع آبادی

اشاعت .... نومبر 2011

تعداد 1100

طابع .... القادر پرنٹنگ پریس کراچی

ناشر .... فیاض احمد 0334-3432345 021-34594144

مکتبہ عمر فاروق 4/491 شاہ فیصل کالونی کراچی

ای میل..... E-mail: M forooq12317@yaho.com

ملنے کے پتے

دارالاشاعت، اردو بازار کراچی
اسلامی کتب خانہ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
قدیمی کتب خانہ، آرام باغ کراچی
ادارۃ الأنور، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ کوئٹہ
کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار راولپنڈی
مکتبہ العارفی، جامعہ امدادیہ ستیانہ روڈ فیصل آباد
مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور
مکتبہ سید احمد شہید، اردو بازار لاہور
مکتبہ علمیہ، جی ٹی روڈ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ
وحیدی کتب خانہ، محلہ جنگی قصہ خوانی بازار پشاور

نقشِ آغاز

اللہ ہی کے لئے ہیں مشرق و مغرب، اور صرف مشرق و مغرب ہی نہیں شمال و جنوب بھی اللہ ہی کیلئے ہیں۔ کون و مکاں کے سب کونے کھدرے، سب نشیب و فراز، سب دشت و جبل، سب اندھیرے اُجالے اور سب ایام و شہور اللہ ہی کیلئے ہیں، یخ بستہ ہوائیں ہوں یا جلاتی جھلساتی فضائیں، موسم پت جھڑ کا ہو یا مشکبار بہاروں اور مرغزاروں کا، کون ہے جو ان پر حاکمیت اور قدرت کا دعویٰ کرے سوائے اللہ کے؟ ان کی تاثیر و تنویر، تطہیر و تبخیر اور تعجیل و تاخیر کا ریموٹ کنٹرول بھی تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

کس قدر حیرت انگیز ہے ایک مشتِ خاک کا یہ جذبہ تکبر و نخوت کہ وہ شعوری یا لاشعوری طور پر اس ذاتِ عظیم الصفات کے وجود کا انکار کرتا ہے اور کبھی اس کے مقابلے کیلئے لنگوٹ کس لیتا ہے، اس کے احکام کو توڑتا مروڑتا پھرا چھلتا، پھدکتا اور قہقہے لگاتا ہے، اللہ اگر چاہے تو اس مجسمۂ حقارت و غلاظت کے قدموں کی زمین کو دو گز نیچے لے جا کر اوپر سے برابر کر دے، اور یہ کارروائی اس قدر خفیہ رہے کہ اس کے یمین و یسار کو کانوں کان بھی خبر نہ ہو، اور اس کے ہم ذات اسے تلاش کرتے کرتے چٹانوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر خسر الدنیا والآخرہ کا مصداق بن جائیں۔

کسی فردِ واحد یا چند افراد و احزاب کی کیا مجال، اللہ اگر چاہے تو گردشِ لیل و نہار کو چند لمحوں کیلئے تھم جانے یا جم جانے کا حکم فرمائے تو کائنات کی ہر ظاہر و باہر وسعت میں اور گہرائیوں یا پنہائیوں میں خفتہ و خوابیدہ مخفی و مستور اس کے تمام اعداء اور عصر حاضر کے تمام فراعنہ و نماریدہ موسم کی برودت و جمودت یا حدت کی شدت کی تاب نہ لا کر بھسم ہو جائیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی کوئی

کارروائی قبل از وقت ہونے کیوں لگی؟ کیا ہم مسلمانوں کا اللہ ہماری طرح بے صبر اور جلد باز ہے؟ کیا اس کے انعامات اور خزائن سے کچھ کم ہو گیا ہے کہ دشمنوں پر ضائع کرنے کا اسے دکھ ہو؟ کیا ڈل کو اسے کسی کمزوری کے غالب آ جانے کا اندیشہ ہے کہ آج وہ اپنی قوت و شجاعت کی دھاک بٹھانے کیلئے جلد از جلد کوئی کارروائی ڈال کر ان نام نہاد شہ زوروں کو ملیامیٹ کر دے؟ کیا وہ حلیم و کریم، عفو غفور اور بصیر و قدیر نہیں ہے؟ اور کیا اس کی کوئی صفت زوال پذیر ہے؟ اور کیا وہ اپنے کمزور بندوں پہ ظلم ہوتا دیکھ کر اہلِ زور و زر اور ظلم و جبر کے مقابل ہر میدان میں خود اتر آئے یا اپنی خصوصی افواج کی پلٹنیں بھیج دیا کرے تو یہ "بے چارے" اور مظلوم لوگ اپنی کمزوری پر قناعت کر کے ہڈ حرام نہیں بن جائیں گے؟ ______ ان سب سوالوں پر غور فرمایئے!

......☆......
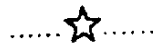
عصرِ حاضر کا مظلوم اور غریب و کمزور مسلمان جن آفات و ابتلاؤں کا شکار ہے ان میں سے ایک آفت و ابتلاء الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا کی یلغار ہے۔ بہت سارے قارئین جانتے ہوں گے اور جو نہیں جانتے وہ جان لیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے پیروکاروں 'نام لیواؤں اور دم بھرنے والوں کو "بھیڑوں" کا خطاب دیا تھا۔ آج عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی وہی بھیڑیں محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کھیتی کو چرتے چگتے ان کی امت کے ہر گھر میں داخل ہو گئی ہیں۔ ان کی اس یلغار سے ہر ڈالی اور ہر پتے، ہر خوشے ہر شگوفے، ہر پھول اور ہر پھل کو خطرہ لاحق ہے۔ اعداءِ اسلام شب و روز تاروں کے جوڑ توڑ کے ذریعے سینکڑوں چینلو سے ہمارے گھروں میں جھانکتے، اپنی نت نئی سائنسی ایجادات و اختراعات سے ہمیں مرعوب کرتے، ہماری بوریت دور کرنے کیلئے ہمیں نادھن دھن نا اور تا تا تھیا کی تعلیم دیتے، اعضاء کی شاعری کے نام پر ہماری بہنوں بیٹیوں کو اچھل کود سکھاتے، جدید فیشن کے عنوان سے نیم عریاں لباسوں سے تزئین و آرائش کا درس دیتے اور بالآخر عصمت، غیرت اور شرم و حیا کی اصطلاحات تک کو فرسودہ و دقیانوسیت قرار دیتے ہوئے خود ننگے ہو کر دکھاتے اور نوجوان نسل کے جنسی جذبات میں ہیجان برپا کر کے انہیں ننگا ہو جانے پر کھلے عام آمادہ کر جاتے ہیں۔ اور یہ طوفانِ بدتمیزی شب و روز کی ہر ساعت میں جاری رہتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارا ادیب، لکھاری، صحافی اور شاعر بھی "قبولِ عام" حاصل کرنے اور 'معاشی

استحکام" کیلئے اسی ڈگر پہ چل نکلا ہے۔ جس قوم کے فرزند از خود دشمن کے عزائم کی تکمیل میں لگ جائیں، اس کی تباہی و بربادی یقینی ہوتی ہے۔ اس سے بڑھ کر ہمارا رب ہماری کیا مدد فرمائے کہ اس نے ان حالات میں بھی ہمیں باقی رکھا ہوا ہے۔

☆

ہمیں زندہ رہنے اور سر بلند ہونے کیلئے دشمن کی ہر یلغار روکنا ہوگا۔ خالقِ کائنات کے احکام اور شریعتِ محمدیہؐ کے دائرے میں رہتے ہوئے حصہ بقدرِ جثہ ہر محاذ پر ہر مسلمان کی محنت ضروری ہے، جو شخص کسی بھی کارِ خیر کی استطاعت رکھتا ہے وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے، علم و ادب، تہذیب و ثقافت، سائنس و سیاست، حرب و ضرب سب کے سب میدان ہمارے منتظر ہیں۔ اتنی طول طویل معروضات کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ اب بھی قارئین پر زیرِ نظر مجموعے کی تالیف، ترتیب و تدوین کے جواز پر دلائل فراہم کروں۔ "للعاقل تکفیه الاشارہ"

آج فروری ۲۰۰۳ء کی ۲۱ تاریخ ہے، فصلِ بہاراں کا آغاز ہو چکا۔ اسی مناسبت سے اس مجموعے کا نام "گلھائے رنگا رنگ" تجویز کیا جا رہا ہے۔ داد و بیداد کی خواہش و خوف سے بے نیاز راقم کی محنت کا اصل ثمرہ یہی ہوگا کہ قارئین اپنے اپنے ظرف کے مطابق اپنی ذمہ داری کو پہچانتے ہوئے ملت کے اجتماعی مقاصد کی طرف متوجہ ہوں۔

کراچی سے حضرت اقدس مولانا ابن الحسن عباسی دام ظلہم، اور ملتان سے نواسۂ امیر شریعت سید محمد کفیل بخاری، سید محمد ذوالکفل بخاری بطورِ خاص شکریہ کے مستحق ہیں۔ میرے دوستوں میں سے جناب سلیم اختر قریشی، جناب ظفر اقبال ظفر، جناب سیف اللہ خالد، جناب سید حسان اکبر گیلانی، جناب سعد ملک شاہ، جناب محمد افضل خان بلوچ کی مشاورت، معاونت اور دعائیں میرے شامل رہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے دامن کو رحمت و عافیت سے بھر دے۔

ثناء اللہ سعد

سب ایڈیٹر "روزنامہ اوصاف" ملتان

مدیر اعلیٰ "گوشۂ علم و ادب" بستی منھو شجاع آباد (ملتان)

☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

تاثرات حضرت مولانا ابن الحسن عباسی مدظلہ

مولانا ثناء اللہ سعد صاحب روز نامہ ''اوصاف'' ملتان کے سب ایڈیٹر اور ایک نوجوان عالم ادیب ہیں، ان کے قلم میں شکوہ کا رنگ، جرأت و جسارت کا ڈھنگ اور جوانی کا ترنگ پایا جاتا ہے۔

پیش نظر کتاب عبوری مطالعہ کے لئے انہوں نے مختلف کتابوں سے دلچسپ حکایات، واقعات، لطائف، عبر اور ادبی عبارات و نکات منتخب کر کے مرتب کی ہے، آج کی نوجوان نسل میں ٹھوس، تحقیقی اور سنجیدہ موضوعات کے مطالعہ کا ذوق بہت کم پایا جاتا ہے، اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہلکے پھلکے اسلوب میں متنوع موضوعات سے متعلق دلچسپ چیزیں جمع کر کے کتابیں مرتب کی جائیں کہ بسا اوقات ایک ایک عام بات سمجھنے سے آدمی کی زندگی بدل جاتی ہے، کسی ایک واقعہ کا مطالعہ انقلابی تبدیلی کا سبب بن جاتا ہے اور حکمت کا کوئی قول انسان کی کایا پلٹ دیتا ہے، ایسی کتابوں کا حلقہ قارئین بھی کافی وسیع ہوتا ہے۔

انہوں نے اردو زبان کے مشہور اہل قلم، علماء اور ادیبوں و دانشوروں کی تحریریں اس میں جمع کی ہیں اور یہ کتاب اپنے نام کی طرح واقعتاً ''گلہائے رنگارنگ'' ہے۔

امید ہے کہ قاری اس میں وہ تمام چیزیں پائے گا جو عبوری مطالعہ کی تسکین کے لئے ایک انسان تلاش کرتا ہے۔

اللہ کرے یہ کتاب قارئین کے لئے مفید اور مرتب کے لئے مزید علمی نقوش کا سنگ میل ثابت ہو۔

ابن الحسن عباسی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ حضرت مولانا محمد اسلم شیخوپوری مدظلہ

کتابوں کی دنیا بھی بڑی عجیب وغریب، دلچسپ، چشمہ کشا، حیرت افزا اور حیرت انگیز دنیا ہے، جس کا اس دنیا میں دل لگ جاتا ہے، اس کا دل پھر کہیں اور نہیں لگتا، جن لوگوں نے فراغت، گوشۂ چمن اور کتاب کی آرزو کی ہے، بے جا نہیں کی، اور جس کسی نے کتاب کو زمانے بھر میں بہترین ہم نشین قرار دیا ہے تو غلط قرار نہیں دیا، اور جس اللہ کی بندی نے شوہر کے کتابی استغراق کو دیکھ کر کتاب کو سو سوکنوں پر بھاری ٹھہرایا تھا، اس دل جلی نے یونہی دل کے پھپھولے نہیں پھوڑے تھے۔ اس دنیا میں پورا کر دینے والے صحرا بھی آتے ہیں۔ اور ظلمت میں ڈوبے ہوئے دشت و بیاباں بھی ٹمٹماتے ہوئے ستارے بھی دکھائی دیتے ہیں اور دل و دماغ کو معطر اور تر و تازہ کرنے والے پھولوں پر بھی نظر پڑتی ہے، کبھی کوئی شعر تڑپا دیتا ہے اور کبھی کوئی جملہ وجد کی سی کیفیت طاری کر دیتا ہے، کبھی کوئی واقعہ ہمدرد معلم کا روپ دھار لیتا ہے اور کبھی کوئی حکایت مربی اور مرشد کا کام دے جاتی ہے، ایسے مواقع پر ایک باذوق قاری کے دل میں بے ساختہ یہ خیال آتا ہے کہ جن مناظر نے مجھے متاثر کیا ہے وہ دوسروں کو بھی دکھاؤں، جن اشعار اور جملوں نے تڑپایا ہے، وہ اوروں کو بھی تڑپائیں۔ جن واقعات و حکایات نے میرے دل کی دنیا کو تہہ و بالا کیا ہے، وہ سب کے دل پر اثر کریں، فیض رسانی اور افادۂ عام کا یہی وہ جذبہ ہے جو ''گلہائے رنگا رنگ'' جیسی کتابوں کی تالیف و ترتیب کا سبب بنتا ہے۔

کتاب کے ناشر فیاض احمد صاحب کے اصرار پر ناچیز نے یہ چند سطریں سپردِ قلم کر دی ہیں ورنہ وہ نہ تو اپنے آپ کو تقریظ کا اہل سمجھتا ہے اور نہ ہی چلتے ہوئے رواج کے مطابق اس کی افادیت کا قائل ہے۔

محتاج دعا

محمد اسلم شیخوپوری

فہرست

گلہائے رنگارنگ

باب اول
علمی لطائف ودقائق

باب اول

علمی لطائف ودقائق

اولوالعزم پیغمبر کون ہیں

بڑے بڑے اور اولوالعزم پیغمبر پانچ ہیں:۔

(۱) نوح علیہ السلام (۲) ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام (۳) موسیٰ علیہ السلام

(۴) عیسیٰ علیہ السلام (۵) خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ۔

ماں کے پیٹ سے مختون پیدا ہونے والے پیغمبر

کعب الاحبار رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جن انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے مختون پیدا کیا ہے ان کی تعداد تیرہ ۱۳ ہے:۔

(۱) ابوالبشر آدم علیہ السلام (۲) شیث علیہ السلام (۳) ادریس علیہ السلام (۴) نوح علیہ السلام

(۵) سام علیہ السلام (۶) لوط علیہ السلام (۷) یوسف علیہ السلام (۸) موسیٰ علیہ السلام

(۹) شعیب علیہ السلام (۱۰) سلیمان علیہ السلام (۱۱) یحییٰ علیہ السلام (۱۲) عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام

(۱۳) خاتم النبیین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ۔

محمد بن حبیب الہاشمی کہتے ہیں کہ وہ انبیاء جو ماں کے پیٹ سے مختون پیدا ہوئے ان کی تعداد چودہ ۱۴ ہے اور وہ یہ ہیں:۔

(۱) ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام (۲) شیث علیہ السلام (۳) نوح علیہ السلام (۴) ہود علیہ السلام

(۵) صالح علیہ السلام (۶) لوط علیہ السلام (۷) شعیب علیہ السلام (۸) یوسف علیہ السلام

(۹)موسیٰ علیہ السلام (۱۰)سلیمان علیہ السلام (۱۱)زکریا علیہ السلام (۱۲)عیسیٰ علیہ السلام

(۱۳)حنظلہ بن صفوان علیہ السلام (جو اصحاب الرث کے لئے بھیجے گئے تھے)

(۱۴)خاتم النبیین نبی آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ۔

رسول اللہ ﷺ کے صحابہ "کاتبین وحی"

(۱)ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (۲)عمر فاروق رضی اللہ عنہ (۳)عثمان غنی بن عفان رضی اللہ عنہ

(۴)علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب (۵)ابی بن کعب رضی اللہ عنہ (یہ سب سے پہلے کاتب وحی ہیں)

(۶)زید رضی اللہ عنہ بن ثابت الانصاری (۷)معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ

(۸)حنظلہ بن الربیع الاسدی رضی اللہ عنہ (۹)خالد رضی اللہ عنہ بن سعید بن العاص

بلکہ زید رضی اللہ عنہ بن ثابت اور معاویہ رضی اللہ عنہ زیادہ پابندی سے لکھا کرتے تھے۔

دور نبوت کے حفاظ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

(۱)ابی بن کعب رضی اللہ عنہ (۲)معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل (۳)ابوزید انصاری رضی اللہ عنہ (۴)ابوالدرداء رضی اللہ عنہ

(۵)زید بن ثابت رضی اللہ عنہ (۶)عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان (۷)تمیم الداری رضی اللہ عنہ

(۸)عبادہ رضی اللہ عنہ بن الصامت (۹)ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ

حضور ﷺ کے سامنے کفار کی گردن اڑانے والے صحابہ کرامؓ

(۱)سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ (۲)سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ (۳)عباد بن بشر رضی اللہ عنہ

(۴)ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ (۵)محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ عنہ

دور نبوت کے مفتیان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

(۱)حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ (۲)عمر فاروق رضی اللہ عنہ بن الخطاب

(۳)عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان (۴)علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب (۵)عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف

(۶)ابی بن کعب رضی اللہ عنہ (۷)عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (۸)معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل

(۹)عمار رضی اللہ عنہ بن یاسر (۱۰)حذیفہ رضی اللہ عنہ (۱۱)زید رضی اللہ عنہ بن ثابت (۱۲)سلمان رضی اللہ عنہ

(۱۳)ابوالدرداء رضی اللہ عنہ (۱۴)ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ

مدینہ منورہ کے سات مشہور فقہاء

(۱)سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ (۲)ابوبکر رضی اللہ عنہ بن عبدالرحمٰن بن الحرث (۳) قاسم رضی اللہ عنہ

(۴)عبیداللہ رضی اللہ عنہ (۵) عروہ رضی اللہ عنہ (۶) سلیمان رضی اللہ عنہ (۷) خارجۃ رضی اللہ عنہ

شیرخوارگی کی حالت میں گفتگو کرنے والے

(۱) صاحب جریج جس نے زنا سے برأت کا اظہار کیا تھا۔

(۲) سیدنا یوسف علیہ السلام کا گواہ جس نے زلیخا سے برأت کی تھی

(۳) ابن الماشطہ جس نے فرعون کو کفر سے ڈرایا تھا اور الماشطہ وہ خاتون ہے جس نے فرعون کو دودھ پلایا تھا

(۴) سیدنا عیسیٰ بن مریم علیہ السلام انہوں نے اپنی ماں سیدہ مریم بنت عمران پر قوم کی طرف سے زنا کی تہمت کے بعد ان کی برأت کا اظہار کیا تھا۔

موت کے بعد گفتگو کرنے والے

(۱) یحییٰ بن زکریا علیہ السلام، جس وقت ان کی قوم نے انہیں ذبح کر دیا تھا

(۲) حبیب بن النجار، انہوں نے کہا تھا یالیت قومی یعلمون (کاش میری قوم مجھے پہچان لیتی)

(۳) جعفر طیار نے کہا تھا **لا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا** (جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں شہید کر دیئے گئے ہیں انہیں مردہ مت سمجھو)

(۴) حسین بن علی رضی اللہ عنہ نے کہا تھا۔ **وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون.** ''عنقریب ظالم لوگ جان لیں گے کہ وہ کس طرح بدلتے ہیں۔''

(حیات الحیوان، علامہ کمال الدین دمیریؒ)

رحم مادر میں اصل مدت سے زائد رہنے والے

(۱) سفیان بن حیان...... یہ جس وقت پیدا ہوئے چار سال کے تھے۔ گویا چار سال ماں کے

پیٹ میں رہے۔

(۲) محمد بن عبداللہ بن حسن الضحاک بن مزاحم...... یہ جس وقت پیدا ہوئے تو ۱۲ ماہ ماں کے پیٹ میں گزار چکے تھے۔

(۳) یحییٰ بن علی بن جابر البغوی

(۴) سلیمان الضحاک۔ یہ دو سال ماں کے پیٹ میں گزار چکے تھے۔

ائمہ مذاہب اربعہ

(۱) امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت انتقال ۱۵۰ھ بغداد میں ہوا۔ عمر ستر ۷۰ سال کی ہوئی

(۲) مالک بن انس ۹۰ھ میں پیدا ہوئے اور مدینہ منورہ میں ۱۷۹ء میں انتقال ہوا

(۳) امام شافعی ابوعبداللہ محمد بن ادریس ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ مصر میں اواخر رجب ۲۰۴ھ میں انتقال ہوا۔

(۴) امام احمد بن حنبل، کنیت ابوعبداللہ تھی، بغداد میں ۱۲۴ھ ربیع الثانی میں انتقال ہوا۔

جلیل القدر محدثین کرام

(۱) امام ابوعبداللہ البخاریؒ بروز جمعہ ۱۳/شوال ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے اور عیدالفطر کی رات ۲۵۲ھ میں انتقال ہوا۔

(۲) امام مسلمؒ نیشاپوری ۲۵ رجب ۲۶۱ میں انتقال ہوا۔ عمر ۵۵ سال کی تھی۔

(۳) امام ابوداؤد بصرہ میں ماہ شوال ۲۷۵ھ میں انتقال ہوا۔

(۴) امام ابوعیسیٰ الترمذی۔ ۱۳/رجب ۲۶۹ھ میں ترمذ میں انتقال ہوا۔

(۵) امام ابوالحسن الدارقطنی ۳۰۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ماہ ذی قعدہ ۳۸۵ھ میں بغداد میں وفات پائی۔

(۶) ابوعبدالرحمٰن النسائی ۳۰۳ھ میں وفات پائی۔

نمرود نامی چھ بادشاہ

(۱) نمرود بن کنعان بن حام بن نوح علیہ السلام...... جوان بادشاہوں میں تھا جن کو ساری

دنیا کی بادشاہت نصیب ہوئی اور یہ بادشاہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کا ہے۔

(۲) نمرود بن کوشش بن کنعان بن حام بن نوح علیہ السلام...... یہ صاحب المنسو رتھا اس کا واقعہ مشہور ہے۔

(۳) نمرود بن ماش بن کنعان بن حام بن نوح علیہ السلام

(۴) نمرود بن سنجار بن نمرود بن کوش بن کنعان بن حام بن نوح علیہ السلام

(۵) پانچویں نمرود بن ساروع بن اغو بن نالخ

(۶) نمرود بن کنعان بن المصاص بن نقطا۔

تین فراعنہ مصر

(۱) فرعون سنان بن الاشعل بن علوان بن العمید بن عملیق...... یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں تھا۔

(۲) فرعون ریان بن الولید...... یہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے زمانے کا ہے

(۳) فرعون الولید بن مصعب...... یہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا ہے۔

✿✿✿✿✿

عقل کا دائرۂ کار

علامہ ابن خلدونؒ فرماتے ہیں کہ عقل کی مثال اس ترازو کی سی ہے کہ جس سے سونا اور جواہرات تولے جائیں۔ اگر اس ترازو سے سونے چاندی کا وزن معلوم کرنا چاہو تو صحیح وزن معلوم کر سکتے ہو لیکن اگر اس ترازو سے پہاڑوں کو تولنا چاہو تو یہ ناممکن اور محال ہے۔

اسی طرح عقل سے اس کی دائرہ کی چیزیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ لیکن اگر یہ چاہو کہ اس بے چاری اور کمزور عقل سے خداوند ذوالجلال کی ذات وصفات اور عالم غیب اور عالم ملکوت کی چیزوں کو معلوم کر لو تو یہ امر محال ہے۔ اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عقل بے کار ہے ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ بارگاہِ قدس اور عالم غیب کی چیزوں کے ادراک اور معرفت میں قاصر اور درماندہ ہے۔ اپنے محدود دائرہ کی چیزوں کے معلوم کرنے کی صحیح میزان ہے اس میں بے کار نہیں جیسے سونے چاندی تولنے کی ترازو فی حد ذاتہ صحیح میزان اور صحیح ترازو ہے سونے اور چاندی کا وزن ٹھیک بتلاتی ہے لیکن اس سے پہاڑوں کے وزن کا تصور کرنا حماقت ہے۔

(مقدمہ ابن خلدونؒ ص ۴۵۰، بحث علم الکلام)

☆

امتِ محمدیہ ﷺ کے علوم ومعارف

اسی طرح محمد رسول اللہ ﷺ کا ایک ایسی جاہل قوم کو کہ جو ہر قسم کی جہالت اور گمراہی میں گھری ہوئی تھی تعلیم دے کر ظلم اور تعدی کو عدل اور انصاف سے اور ان کے خشونت اور درشت مزاجی کو حلم اور بردباری سے اور ان کی جہالت کو علم اور معرفت سے اور ان کے باہمی بغض اور عداوت کو محبت اور الفت سے اور ان کی شقاوت اور ضلالت کو سعادت اور ہدایت سے اور ان کے عصیان کو اطاعت سے اور تفرق اور تشتت کو اجتماع سے ضعف کو قوت سے۔ خیانت کو امانت سے، اور فحش اور بے حیائی کو غیرت اور عفت اور احسان سے، رذائل کو شمائل سے بدل دینا اور علوم الٰہیات اور علوم نبوات اور علوم معاش ومعاد اور علوم اخلاق اور علوم عبادات اور علوم معاشرت اور علوم معاملات اور علوم

سیاست ملکیہ اور مدنیہ میں رشک افلاطون اور استاذ حکماء عالم بنا دینا کیا یہ آنحضرت ﷺ کے کمال علم ومعرفت کی روشن اور کھلی دلیل نہیں۔

اعتبار نہ ہو تو علماء اسلام کی تصانیف کا تمام دنیا کے علماء مذاہب کی تصانیف سے مقابلہ اور موازنہ کرلیں اور خوب کرلیں وہ حقائق اور دقائق جو علماء اسلام کی تصانیف میں دریا کی طرح بہہ رہے ہیں ان کا ایک قطرہ بھی دیگر علماء مذہب کی تصانیف میں تا قیامِ قیامت انشاءاللہ العزیز ہرگز ہرگز نہ مل سکے گا۔

امت محمدیہ میں اس قسم کے علوم ومعارف اسرار ولطائف انوار وبرکات خوارق وکرامات کا موجود رہنا یہ اس امر کی بین اور روشن دلیل ہے کہ ہنوز آپ کی نبوت باقی ہے اور آپ کی شریعت ابدی اور دائمی ہے۔ اس لیے کہ یہ سب کچھ آپ ہی کی نبوت کی تصدیق کی برکت اور آپ ہی کی شریعت کے اتباع کا ثمرہ ہے۔ اگر شریعت موسویہ عیسویہ ابدی ہے تو پھر بتلائیں کہ یہود ونصاریٰ کیوں ان علوم ومعارف اور انوار وکرامات سے یکسر محروم اور تہی دست ہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آپ کی شریعت تحریف وتبدیل سے بالکل پاک ہے اس لیے کہ تبدیل شدہ شریعت کا اتباع موجب خیر وبرکت نہیں ہوسکتا بلکہ وہ موجب لعنت ونقمت ہے۔

پس جس نبی کی امت کے علوم ومعارف کا یہ حال ہے تو اندازہ کرلو کہ خود اس نبی کے علوم ومعارف کا کیا حال ہوگا۔ امت تو اپنے نبی کے اجمالی علوم کی شرح اور تفصیل ہے ساڑھے تیرہ سو برس گذر گئے کہ امت محمدیہ کے علماء اپنے نبی امی فداہ نفسی وابی وامی کے علوم کی شرح اور اسی کی تفصیل اور اسی کی توضیح وتلویح میں لگے ہوئے ہیں مگر ہنوز شرح ناتمام ہے۔ دنیا کی تمام قومیں ساری امتیں مل کر یہ چاہیں کہ اپنے مذہب میں ابوحنیفہؒ اور مالکؒ جیسا فقیہ اور مجتہد اور بخاریؒ اور مسلمؒ جیسا حافظ اور حسن بصریؒ اور معروف کرخیؒ جیسا عابد وزاہد اور ابوالحسن اشعریؒ اور غزالیؒ اور رازیؒ جیسا متکلم دکھلاسکیں تو ناممکن اور محال ہے اور اگر ہے تو دکھلائیں اور بتلائیں، خدا کی قسم نہیں دکھلا سکتے۔

"وتلک یمین لست فیها باثم" (یہ وہ قسم ہے جس میں میں جھوٹا اور گناہ گار نہیں)

(علم الکلام، شیخ المحدثین مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ)

......☆......

حب جاہ و مال کی کثرت

زمین کے مزاج میں جب کوئی خرابی آتی ہے تو اس کی وجہ سے زمین پر زلزلے آتے ہیں۔ جس سے زمین شق ہو جاتی ہے۔ بہت سے لوگ اس میں قارون کی طرح دھنسا دیئے جاتے ہیں اور بہت سی بستیاں اس میں بیٹھ جاتی ہیں یہ زلزلہ زمین کے حق میں بمنزلہ تپ اور لرزہ کے معلوم ہوتا ہے ایک ہی زمین ہوتی ہے کہ اس میں عرصہ تک خوب پیداوار ہوتی ہے مگر چند سال کے لیے پیداوار رک جاتی ہے کسی سال میں درخت ثمردار خوب بارآور ہوتا ہے اور کسی سال ایسا نہیں ہوتا۔ یہ تمام صورتیں زمین کے مزاج میں فساد آنے کے باعث پیدا ہوتی ہیں۔ برسات کا کثرت سے ہونا، اولے پڑنا پانی کے مزاج کی خرابی پر دلالت کرتے ہیں اور بجلی کا گرنا اور دمدار ستاروں کا نظر آنا کرۂ نار یعنی طبقۂ آگ کی خرابی پر دلالت کرتا ہے۔

اور چاند سورج کا گہن یہ عالم کے لیے بمنزلہ آشوب چشم کے ہے اور جس طرح انسان ظاہری امراض کے علاوہ باطنی امراض میں مبتلا ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ عالم بھی ان ظاہری امراض کے علاوہ جن کا اوپر ذکر ہوا باطنی امراض میں مبتلا ہوتا ہے بلکہ باطنی امراض ظاہری امراض سے کہیں زائد ہیں۔ اکثر بنی آدم کا بداخلاق ہونا اور ان سے افعال ناپسندیدہ کا سرزد ہونا یہ عالم کے حق میں باطنی امراض ہیں۔ دنیا میں زنا اور سرقہ کی اتنی کثرت نہیں جتنا کہ حب جاہ اور حب مال اعجاب اور استکبار تحاسد اور تباغض تفاخر اور تنافر وغیرہ کی کثرت ہے۔ دنیا میں اگر کوئی مرض بھی نہ ہو تو حق جل شانہٗ سے غفلت بھی ایک ایسا مرض ہے کہ ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے۔ (ایضاً)

☆

مادر مہربان اور رب رحمان

جس ماں نے بچے کو ہزار ناز و نعمت میں پرورش کیا ہو اگر وہ بچہ ماں کی اطاعت نہ کرے تو ماں اس کو گھر سے نکال کر دروازہ بند کر لیتی ہے لیکن اگر وہ بچہ یہ سمجھ کر کہ میں نے غلطی کی۔ مادر مہربان سے زائد میرے لئے کوئی شفقت اور مہربانی کرنے والا نہیں۔ یہ سمجھ کر نہایت ندامت اور

شرمساری کے ساتھ واپس ہوا، اور دروازہ کی چوکھٹ پر سر رکھ کر نہایت ندامت کے ساتھ اپنے قصور کی معذرت کرنے لگا، اور یہ کہنے لگا کہ اے ماں تجھ سے زائد میرا کوئی شفیق اور مربی نہیں مجھ سے قصور ہوا آئندہ سے ایسا نہ ہوگا اس وقت ماں کی مسرت اور خوشی کا حال نہ پوچھو کہ اس کا بھاگا ہوا لخت جگر اور نورِ بصر پھر واپس آ گیا۔ فرط مسرت اور جوش محبت میں بچے کو سینہ سے چمٹا لیتی ہے۔ اور یہ کہتی ہے کہ اے میرے نادان بچے تو کہاں چلا گیا تھا۔ میرے سوا تیرا کہاں ٹھکانہ تھا۔ مجھ سے زائد تیرا کون شفیق اور مہربان اور خیر خواہ اور ہمدرد تھا۔

اسی طرح جب خدا کا بھاگا ہوا بندہ اور اس کا حبیب مخصوص اس کے جود و کرم اور اس کے بے شمار آلاء و نعم کو یاد کر کے پھر واپس آتا ہے اور خدا کے در پر سر رکھ کر نہایت تضرع اور زاری اور عجز و انکساری، ندامت اور شرمساری سے اپنے قصور کی معافی چاہتا ہے اور یہ عرض کرتا ہے کہ اے میرے پروردگار تیرے سوا میرا کوئی ماویٰ و ملجا نہیں تیرے سوا میرا کوئی سہارا اور پناہ نہیں۔ تو ارحم الراحمین اور تواب و رحیم اور جواد کریم ہے۔ ہم تیرے فضل کے محتاج ہیں اور تو ہمارے عقاب سے مستغنی اور بے نیاز ہے۔ تیری بارگاہ میں عفو انتقام سے زیادہ محبوب ہے رحمت عقوبت سے زیادہ پسندیدہ ہے فضل عدل سے زیادہ تجھ کو عزیز اور پیارا ہے۔

اس وقت حق جل شانہٗ کی رحمت واسعہ کا دریا اس قدر جوش میں آ جاتا ہے کہ ماں کے جوش محبت کو اس کے دریائے رحمت سے وہ نسبت بھی نہیں ہوتی جو ایک قطرہ کو دریا کے ساتھ ہے کیونکہ وہ ارحم الراحمین ماں سے کہیں زائد مہربان ہے۔

(علم الکلام، از مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ)

☆

ایک منکر حدیث سے گفتگو

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ (م ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء) فرماتے ہیں:

''میں ایک دفعہ یہیں پاکستان میں کراچی سے لاہور آ رہا تھا۔ ریل کا سفر تھا۔ اسی گاڑی

میں ایک صاحب سوار ہوئے جو اپ ٹو ڈیٹ قسم کے آدمی تھے۔ انہوں نے اس قدر نیازمندی سے میرے ساتھ برتاؤ کیا اور اتنی خدمت کی کہ ذرا میں لوٹے کی طرف ہاتھ بڑھاؤں تو فوراً پانی بھر کر لائیں اور کسی چیز کا اشارہ بھی کروں سمجھ جائیں، وہ لا کر رکھ دیں۔ بہت بڑی خدمت کی، خیر کئی گھنٹے تک وہ بچارے محبت سے خدمت کرتے رہے۔ میرے دل میں قدر ہوئی کہ بھئی بالکل ہی جدید تعلیمیافتہ اور نو فکر آدمی اور اس طالب علم کے آگے اس قدر محبت سے پیش آئے، بڑی دل میں قدر ہوئی۔

وہ تھے اصل میں منکرِ حدیث۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مجھے انکارِ حدیث (کی بحث و تمحیص) کے اوپر لائیں۔ اس لیے خدمت کو انہوں نے پیش خیمہ بنایا اخیر میں انہوں نے اپنا مقصد ظاہر کیا ____ احادیث پر کچھ اعتراضات کرنے شروع کیے کہ وہ قابلِ اعتبار نہیں۔ اک تاریخ کا درجہ رکھتی ہیں۔

''میں نے کہا، آپ کسی چیز کو مانتے بھی ہیں؟ کہنے لگے قرآن ____ مَیں نے کہا، قرآن کا قرآن ہونا آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ کیا آپ پر وحی آ گئی تھی کہ یہ قرآن ہے۔ کیسے پتہ چلا؟ کہنے لگے اللہ کے رسول کے ارشاد سے ____ میں نے کہا، وہ ارشاد ہی تو حدیث ہے، تو قرآن کا قرآن ہونا تو حدیث پر موقوف ہے۔ حدیث کا آپ انکار کر دیں گے تو کون سی شرط ہے قرآن کے قرآن ہونے کی؟ کیسے آپ انکار کرتے ہیں؟ تو وہ چپ ہو گئے۔

کہنے لگے کہ دل سے تو حدیث کا انکار واقعی مشکل ہے۔ باقی حدیثیں ایسی بھی ہیں کہ بعض قابلِ اعتبار نہیں ____ تو میں نے کہا کہ جس کو تو آپ نے مان لیا آپ مصر کیوں ہیں کہ حدیث کی قسمیں ہیں ____ میں نے کہا جہاں تک حدیث کی قسمیں ہیں محدثین نے خود ان کی صراحت کی ہے ____ کہ ہر حدیث کا ایک درجہ نہیں ہے۔

جو حدیث متواتر ہے اور تواتر سے ثابت ہے وہ مورثِ یقین ہے اس کا انکار ایسا ہی ہے جیسے قرآن کا انکار۔ قرآن کی ایک آیت کا آدمی انکار کر دے تو اسلام سے خارج ہو جاتا ہے حدیثِ متواتر کے انکار سے بھی دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

دوسرے درجہ کی حدیث، حدیثِ مشہور ہے۔ وہ اگر مورثِ یقین نہیں تو ظنِ غالب کی

مورث تو ہے ہی۔ ظنِ غالب تو پیدا ہوگا اور ظنِ غالب پر ہزاروں احکام کا مدار ہے تو وہ بھی حجت ہو گی۔

تیسرا درجہ خبرِ واحد کا ہے۔ وہ اگر ظنِ غالب نہیں تو مطلق ظن تو پیدا کرتی ہے اور ظن سے انکار نہیں کیا جا سکتا ___ بہت سے احکام ظن اور گمان پر مبنی ہیں کہ آدمی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ وضو میں پیروں کا دھونا ضروری ہے اور ذرا بھی خشک رہ جائے وضو نہیں ہوگا، لیکن آپ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ایڑی دھل گئی ہے یا نہیں؟ آپ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ ظنِ غالب ہی تو ہوتا ہے کہ پیر دُھل گیا۔ اس ظنِ غالب پر شریعت بھی حکم دیتی ہے کہ ہاں دُھل گیا۔ وضو ہو گیا ___ تو بہت سے احکام کا مدار ظن پر بھی ہوتا ہے، تو حدیث اگر ظن ہی پیدا کر دے وہ بھی حجت کی شان رکھتی ہے۔ آپ کا گمان جب فعل کے جائز ہونے پر حجت بن جاتا ہے تو حدیث اگر ظن ہی پیدا کرے تو وہ کیوں حجت نہیں بنے گی؟ تو میں نے کہا یہ تو خود محدثین نے تصریح کر دی ہے کہ ہر حدیث ایک درجے کی نہیں ہے ___ تو جنسِ حدیث کو آپ نے مان لیا۔ اقسامِ حدیث قابلِ اعتراض ہیں تو خود محدثین ہی تقسیم کرتے ہیں۔ اب آپ کو اعتراض کیا ہے؟ کہنے لگے اب تو کچھ اعتراض نہیں۔ میں نے کہا اب حدیث ___ کا انکار نہیں کرو گے؟ کہنے لگے نہیں اب نہیں کروں گا ___ تو لاہور آتے آتے ان کا خیال درست ہو گیا۔"

(خطباتِ حکیم الاسلام ج ا ص ۷۷ تا ۷۹)

......☆......

اسلامی اعتقادات کی سائنسی تصدیقات

امتِ مسلمہ نے اعتقادات کا یہ مسئلہ پیش کیا کہ قیامت کے دن انسان کے تمام اعضاء بدن اپنے کئے ہوئے اعمال پر خود بول اٹھیں گے اور بدن کا رواں رُواں انسانی کرتوتوں پر گواہ بن جائے گا تو مادہ پرست معترض ہو گئے کہ بدن کی کھال ہڈیاں اور گوشت پوست کیسے بول سکتے ہیں؟

لیکن گراموفون کی ایجاد نے انہیں سمجھا دیا کہ مسالہ کے ایک سیاہ رنگ ریکارڈ کو اگر ایک چھوٹی سی سوئی سے چھیڑ دیا جائے تو وہ فوراً سب کچھ بتلا دیتا ہے جو اس میں بھر دیا گیا ہے، تو کیا بعید

ہے کہ انسانی جسم بھی جو اِس کی پوری زندگی کا ایک پورا ریکارڈ ہے، قدرت الٰہی کی سوئی لگتے ہی بجنا شروع ہو جائے اور وہ سب کچھ اگل دے جو انسان نے اپنے اعمال سے اس میں بھر دیا ہے۔

(تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام، حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ)

......(۲)......

واقعۂ معراج کی برق رفتاری پر بھی اعتراض کیا گیا' لیکن موجودہ دور کے بلند پرواز سائنس دانوں اور ماہرین ہیئت نے نہ صرف انسان کو چاند پر پہنچا دیا بلکہ خلا میں بستیاں آباد کرنے کے منصوبے بنانے شروع کر دیئے اور اس طرح ایک عام انسان کے خلائی سفر کے ثبوت مہیا کر دیئے۔ (ایضاً)

......(۳)......

حضرت عمر نے جب سینکڑوں میل دور مصروف جنگ اپنے سپہ سالار ''ساریہ'' کو اپنی آواز پہنچا کر کہا! ''اے ساریہ پہاڑ کی آڑ لے لے'' تو عقیل رو حیں اس کا ادراک نہ کر سکیں لیکن وائرلیس کی ایجاد نے انہیں اس غیر معمولی کارنامہ کو ماننے پر مجبور کر دیا۔

......(۴)......

قرآن نے ہمیں یقین دلایا کہ تم نے اور تم سے پہلے سارے انسانوں نے جو کچھ بھی زبان سے نکالا ہے' وہ محفوظ ہے اور بالآخر وہ تمام آوازیں تمہارے سامنے آ جائیں گی' جو چودہ سال بعد سائنس دانوں نے یہ ثابت کر دیا کہ دنیا کی اب تک کی آوازیں فضا میں موجود ہیں جو جدید آلات کے ذریعے ہمارے کانوں تک آنے لگی ہیں' کیا عجب کہ ایک دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وہ خطبہ دریافت ہو جائے جو انہوں نے اپنے حواریوں کو دیا تھا' گویا اس انکشاف نے نہ صرف آوازوں کا محفوظ ہونا تسلیم کرا لیا' بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ آمد کی تمہید بھی ڈال دی۔ (ایضاً)

......(۵)......

اسلام نے خبر دی کہ درخت تسبیح وصلوٰۃ میں مصروف ہوتے ہیں' اس کو ماہرین نباتات نے ثابت کر دیا اور کہا کہ پودے دیکھتے ہیں' سنتے ہیں آپس میں گفتگو کرتے ہیں' بیمار و تندرست ہوتے ہیں' سوتے، جاگتے ہیں' حتیٰ کہ عشق ومحبت کے جذبات بھی ان میں سرایت کرتے ہیں۔ (ایضاً)

......(۶)......

اسی طرح فرمایا گیا کہ "تمہارے وہ اعمال جنہیں کرنے کے بعد تم ہوا میں گمشدہ اور معدوم تصور کرتے ہو' اسی طرح محفوظ ہیں اور یوم حشر انہیں تولا جائے گا"

آج کل ہر چیز تولی جارہی ہے بلکہ ہوا تولی جانے لگی ہے اور وزن کر کے بھری جاتی ہے۔

(ایضاً)

......(۷)......

اسی طرح روایت صحیحہ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک چاک کر کے فرشتوں نے اس میں علم وحکمت اور نور معرفت بھرا اور پھر سینہ مبارک بدستور درست کر دیا' آج کل بعینہ یہی کچھ ہو رہا ہے' ماہر سرجن انسانی سینہ چاک کرتے ہیں، دل' جگر' پتہ اور دیگر متاثرہ اعضا کی مرمت کرتے ہیں اور پھر سینے کو بند کر کے برابر کر دیتے ہیں' یوں جوں جوں انکشافات کا سلسلہ وسیع ہوتا جارہا ہے اسلام کی حقانیت واضح اور اس کے دعوے پایۂ ثبوت کو پہنچتے جارہے ہیں۔

(تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام از قاری محمد طیب مہتمم دار العلوم دیوبند)

......☆......

قرآن کے سائنسی خیالات

قرآن کے سائنسی خیالات نے مجھے محو حیرت کر دیا۔ اس وقت تک میں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ تیرہ سو سال پہلے کی تحریریں جس میں انتہائی مختلف النوع مضامین بیان ہوئے ہیں' جدید سائنسی معلومات سے کلی طور پر ہم آہنگ ہوں گے۔ میری رائے میں اس کے لئے کوئی تاویل ممکن نہیں کہ جس زمانہ میں "ڈیگو گوبرت" (۶۳۹ ـ ۶۲۹ء) فرانس میں حکومت کر رہا تھا' اس وقت جزیرۃ العرب کا ایک باشندہ بعض موضوعات پر ایسی سائنسی معلومات رکھتا ہو جو ہمارے زمانے سے بھی دس صدی بعد کے دور سے تعلق رکھتی ہوں۔

میں نے کوشش کی ہے کہ قرآن میں ان حوادث کا ذکر بھی تلاش کروں جن تک انسانی فہم وادراک کی رسائی ہے لیکن جن کو جدید سائنس نے تسلیم نہیں کیا' میرے خیال میں مجھے قرآن میں

کائنات کے ایسے سیارگان کا ذکر ملا ہے جو کرۂ ارض کے مشابہ ہیں اور یہاں یہ اضافہ کر دینا ضروری ہے کہ بہت سے سائنسدان اس کو مکمل طور پر قابلِ عمل سمجھتے ہیں۔

قرآن کا یہ مطالعہ اگر تیس سال پہلے کیا ہوتا تو اس کے ساتھ خلا کی تسخیر کے واقعہ کا اضافہ کرنا ضروری ہوتا' جس کی پیشین گوئی قرآن میں کی گئی ہے۔اسی طرح قرآن کی ایک آیت کی طرف بالکل جائز طور پر زیادہ توجہ دی جاسکتی ہے۔جس میں بتایا گیا ہے کہ حیات کی ابتداء پانی سے ہوئی۔

اس وقت ہم ان پانچ مخصوص نکات کا جائزہ لیں گے جن پر تخلیق سے متعلق قرآن میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

۱۔ آسمان و زمین کے چھ ادوار' قرآن کے بموجب اجرام سماوی اور زمین کی تشکیل اور مؤخرالذکر کی ترقی پر محیط ہیں۔ یہاں تک کہ وہ (مع اپنے سامان زیست کے) انسان کا مسکن بنی اور جہاں تک زمین کا تعلق ہے اس کے جن حوادث کا قرآن میں ذکر کیا گیا ہے وہ چار ادوار میں رونما ہوئے غالباً ان سے وہ چار اراضیاتی ادوار مراد لئے جائیں گے جن کا جدید سائنس میں ذکر ہے۔ لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ اجرام سماوی اور زمین کی تشکیل جیسا کہ سورۃ ۴۱ کی آیات ۹ تا ۱۲ میں بیان کیا گیا ہے دو کیفیات کی طالب ہے۔ اگر ہم سورج اور اس کی ذیلی تخلیق زمین کو بطور مثال سامنے رکھیں تو اس کے بارے میں سائنس ہمیں یہ اطلاع بہم پہنچاتی ہے کہ ان کی تشکیل ابتدائی قسم کے ''سدیم'' کے انجماد اور بعد میں ان کے ایک دوسرے سے علیحدگی کے عمل سے ہوئی۔

یہ وہی بات ہے جس کو قرآن نہایت صاف طور پر بتاتا ہے جب وہ ایک سماوی دخان سے شروع کر کے اس عمل کا حوالہ دیتا ہے۔جس سے مختلف مادوں کی آمیزش (رتق) ہوئی جس کے نتیجہ میں وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔(فتق)

۲۔ سائنس ایک ستارے (جیسے سورج) اور اس کے طفیلی (جیسے زمین) کی تشکیل کے دو مدارج کے باہم ملے ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ آپس کا یہ تعلق قرآن کے متن میں یقیناً نہایت نمایاں ہے۔

۳۔ کائنات کے ابتدائی مرحلے میں ''دخان'' کی موجودگی جس کا حوالہ قرآن میں موجود ہے اور جس سے مراد مادہ کی زیادہ ترگیسی حالت ہے۔صریحاً اس ابتدائی ''سدیم'' کے تصور سے مطابقت رکھتا ہے۔جو جدید سائنس نے پیش کیا ہے۔

۴۔ سماوات کا تعدد جس کی تعداد قرآن نے سات بتائی ہے۔ سماوات اور ارض کے بیچ میں ایک درمیانی تخلیق کے وجود کو جس کا ذکر قرآن میں ہوا ہے۔ مادہ کے ان ''قناطر'' یعنی پلوں کی دریافت سے مماثل قرار دیا جاسکتا ہے۔ جو باقاعدہ فلکیاتی نظاموں کے ماوراء موجود ہے۔

ان کے علاوہ علم ہیئت' اجرام سماوی کی نوعیت' چاند سورج کے مداروں کا وجود' وسعت کائنات کرہ باد میں بجلی' عالم حیوانی اور عالم نباتات' عمل تخلیقِ انسانی کی تشریح' طوفانِ نوح' اور دیگر کئی اہم موضوعات پر قرآن کی توجیہ اور تشریح سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن کے لئے کوئی بشری توضیح وتشریح ممکن نہیں۔ (بائبل' قرآن اور سائنس۔ از موریس بوکائیے)

☆

''قرآن'' میں خداوند کریم نے فرعون کے متعلق فرمایا! (ترجمہ)

''اب ایمان لاتا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے تک تو نافرمانی کرتا رہا اور فساد کرنے والوں میں سے تھا۔ اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے۔ تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشانِ عبرت بنے' اگرچہ بہت سے ایسے انسان ہیں جو ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں۔''

جدید سائنس نے اس فرعون کی ممی دریافت کر کے دنیا کو حیرت زدہ کر دیا' جو لوگ صحف مقدس کی صداقت کے لیے جدید معلومات میں ثبوت تلاش کرتے ہیں وہ مصری عجائب گھر قاہرہ کے شاہی ممی خانہ کا معائنہ کر کے فرعون کے جسم سے متعلق آیاتِ قرآنی کی ایک شاندار مثال کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

(بائبل' قرآن اور سائنس۔ از موریس بوکائیے)

☆

فقیہ الامت مفتی محمود الحسن گنگوہی کے ملفوظات

دار العلوم دیوبند میں ایک دیہاتی میواتی کی تقریر

حضرت مولانا الیاس صاحبؒ ایک مرتبہ دار العلوم دیوبند تشریف لائے۔ بڑے جوش میں تھے تمام اساتذہ دار العلوم کو جمع فرمایا پھر ایک میواتی دیہاتی کو جو آپ کے ساتھ تھا تقریر کے لئے کہا' اس نے معذرت کی' حضرت کے مقرر فرمانے پر وہ کھڑا ہوا' اور کہا دیکھو جی تقریر تو مجھے کرنی آتی نا' حضرت کا حکم ہے وہ امیر ہیں اور امیر کی اطاعت ضروری' اس لئے کھڑا ہو گیا ہوں ایک بات تم سے کہتا ہوں۔ وہ یہ کہ اگر کسی زمیندار کے دو چھورے ہوں ایک بڑا چھورا ایک چھوٹا چھورا اور وہ بڑے کو کہے کہ یہ مٹکی مکھن کی تقسیم کرو اور وہ یہ کہہ دے میں تو کام میں لگا ہوا ہوں مجھے فرصت نا' اور واقعۃً ہے بھی وہ کام میں لگا ہوا' پھر وہ چھوٹے چھورا کو کہے جس سے اس مٹکی کا اٹھنا مشکل ہے اور وہ اٹھا کر لائے مگر ہاتھ سے درمیان میں چھوٹ کر گر پڑے اور پھوٹ جائے تو تم بتاؤ زمیندار کس پر خفا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ بڑے چھورا پر خفا ہوگا کہ کام اس کے کرنے کا تھا...... اسی طرح آپ لوگ بڑے چھورا ہو اور ہم چھوٹے چھورا ہیں اب یہ دین کی مٹکی تم اٹھاتے نا...... عذر کرتے ہو کہ ہمیں فرصت نا...... ہم دوسرا کام کر رہے ہیں' ہم کمزوروں نے اٹھالی ہے گرے گی تو پکڑ تمہاری ہوگی ہم سے تو وہ خراب ہی ہوگی۔

......☆......

مرض نسیان کے چھ اسباب

ارشاد فرمایا کہ شامی ص ج ۱ ۱۵۰ پر ہے "ست تورث النسیان" یعنی چھ ۶ چیزیں نسیان پیدا کرتی ہیں۔

(۱) چوہے کا جھوٹا کھانا۔

(۲) زندہ جوں کا زمین پر چھوڑ دینا۔

(۳) ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنا۔

(۴) اونٹوں کی قطار کے درمیان آنا۔

(۵) مصطگی چبانا۔

(۶) ترش سیب کھانا۔

بعض لوگوں نے ان کے علاوہ بھی کچھ چیزیں ذکر کی ہیں ان میں سے دنیا کے سبب رنج وغم ہے' تیز گرم روٹی کھانا ہے' معاصی میں مبتلا ہونا ہے' پھر فرمایا کہ حضرت امام شافعیؒ نے اپنے استاذ حضرت وکیعؒ سے سوءحفظ کی شکایت کی تھی تو انہوں نے ترک معاصی کی تلقین کی جس کو امام شافعیؒ نے اس طرح نظم کیا ہے۔

شکوت الی وکیع سوء حفظی
فاوصانی الی ترک المعاصی
فان العلم نور من الٰهی
ونور الله لایعطی لعاصی

☆
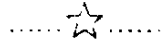
ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کے بارے میں اکابر کا قول

ارشاد فرمایا کہ اکابر نے ابن تیمیہؒ اور ان کے تلمیذ ابن قیمؒ کے بارے میں کہا ہے "علمهما اكثر من عقلهما" کہ ان کا علم ان کی عقل سے زائد ہے۔ جس کا مطلب ظاہر ہے جس حدیث میں حق تعالیٰ شانہ کے سمائے دنیا پر نازل ہونے کا تذکرہ ہے اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا نزول اس طرح ہوتا ہے۔ اور منبر کے اوپر کی سیڑھی پر بیٹھ کر اس سے اتر کر بتاتے ہیں گویا حق تعالیٰ کا نزول اس طرح ہوتا ہے۔ اور منبر کے اوپر کی سیڑھی پر بیٹھ کر اس سے اتر کر بتاتے ہیں گویا حق تعالیٰ شانہ بشانہ کے لئے جسم ثابت کرتے ہیں۔ تجسیم کے قائل ہیں۔

☆

ابن خلکانؒ کی وجہ تسمیہ

فرمایا کہ مورخ ابن خلکان کو اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ موصوف کا تکیہ کلام کان تھا وہ بات بات میں کان کہتے تھے ان سے اس کان کو چھوڑانے کے لیے کہا گیا خل کان اس سے ان کا یہ نام مشہور ہو گیا۔

☆

جمل اور ابل کی تفسیر

فرمایا کہ مولانا عبدالحق صاحب حقانی بھی مولانا گنج مرادآبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو فرمایا کہ آپ بڑے مفسر ہیں قرآن شریف کی تفسیر (تفسیر حقانی) بھی آپ نے لکھی ہے پھر پوچھا کہ اچھا آپ نے سورۂ اعراف کی آیت "**ولایدخلون الجنة حتی یلج الجمل فی سم الخیاط**" میں جمل کی کیا تفسیر کی ہے عرض کیا اونٹ سے۔ فرمایا کہ اس جگہ اونٹ مرادنہیں موٹا رسا مراد ہے اس لئے کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہونے والی چیز کی جنس سے نہیں البتہ موٹا رسا جس سے رسی باندھی جاتی ہے اس کی جنس سے ہے اس لئے جمل سے یہاں اونٹ مرادنہیں موٹا رسا مراد ہے۔ پھر پوچھا کہ اچھا سورۂ غاشیہ کی آیت "**افلاینظرون الی الابل کیف خلقت**" میں ابل کی کیا تفسیر کی ہے؟ عرض کیا اونٹ سے تفسیر کی ہے۔ تو فرمایا کہ یہاں بھی اونٹ مرادنہیں بلکہ بادل مراد ہے اس لئے کہ یہاں کائنات کی عظیم ترین اشیاء سماوات وارض وجبال کا تذکرہ ہے ان کے ساتھ اونٹ کا کیا جوڑ؟ البتہ بادل ان کے مناسب ہے کہ آسمان وزمین کے درمیان معلق رہتا ہے اس کے بعد حضرت دام مجدہ نے فرمایا کہ جمل کے معنی اونٹ اور موٹا رسہ اسی طرح ابل کے معنی اونٹ اور بادل دونوں کتب لغت میں ذکر کئے گئے ہیں۔

☆

"اللہ میاں" لکھنے پر مولانا احمد رضا کا اعتراض اور اسکا جواب

فرمایا رضا خانیوں نے ایک مناظرہ میں کہا فتاویٰ رشیدیہ میں جگہ جگہ لکھا ہوا ہے اللہ میاں'

اللہ میاں۔ اللہ تعالیٰ کو اللہ میاں کہنا ناجائز ہے۔ میں نے کہا بھئی کیوں ناجائز ہے؟ انہوں نے کہا کہ مولانا احمد رضا خانصاحب نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو میاں کہنا بے ادبی اور گستاخی ہے کیونکہ ''میاں'' کے تین معنی ہیں۔ ایک معنی ہیں ''شوہر''۔ یہاں یہ معنی مراد لینا غلط ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کا شوہر نہیں۔ دوسرے معنی ''دلال'' ہیں جو کسی مرد اور عورت کے درمیان ناجائز تعلقات کرائے ادھر سے بھی فیس لے اُدھر سے بھی فیس لے۔ یہ معنی بھی درست نہیں۔ تیسرے معنی ہیں ''آقا''۔ یہ معنی صحیح ہو سکتے ہیں۔ مگر جب اوّل دو معنی شانِ خداوندی کے خلاف ہیں تو ایسا موہم لفظ بولنا درست نہیں۔ جیسے "یاایھا الذین امنوا لا تقولوا راعنا" (الآیہ) راعنا کے ایک معنی صحابہ مراد لیتے تھے (یعنی ہماری رعایت کیجئے) وہ صحیح تھے۔ ایک معنی یہودی مراد لیتے تھے (ہمارے چرواہے) وہ غلط تھے۔

حق تعالیٰ نے ایسا لفظ بولنے سے منع کر دیا کیونکہ دوسرے غلط معنی کا احتمال ہے۔ لہٰذا فتاویٰ رشیدیہ میں جو لکھا ہے اللہ میاں' اللہ میاں یہ غلط اور ناجائز ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خانصاحب نے اپنے دو بیٹوں کو کچھ وصیتیں کی ہیں۔ اس میں لکھتے ہیں بڑے میاں' چھوٹے میاں۔ بڑے بیٹے کو بڑے میاں' چھوٹے بیٹے کو چھوٹے میاں۔ پہلے معلوم ہو چکا میاں کے تین معنی ہیں۔ ایک معنی شوہر۔ وہ تو یہاں مراد ہو نہیں سکتے۔ اس واسطے کہ خانصاحب بھی مرد' بیٹے بھی مرد۔ مرد کا شوہر مرد نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں کہا گیا ہے "نساء کم حرث لکم" تمہاری عورتیں تمہارے لئے حرث (کھیتی) ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ مرد حرث نہیں لہٰذا یہ معنی تو یہاں مراد ہو نہیں سکتے۔ نیز ارشاد ہے "فانکحوا ما طاب لکم من النساء" مردوں کو حکم ہے کہ عورتوں سے نکاح کریں۔ یہ نہیں کہا گیا کہ مرد مردوں سے نکاح کریں۔ اور اگر خانصاحب کو عورت فرض کیا جائے تو بھی یہاں یہ معنی مراد نہیں ہو سکتے اس واسطے کہ خانصاحب ہو گی بیوی' بیٹے ہوں گے شوہر ماں کو بیوی بنانا لازم آئے گا جو سخت گالی ہے۔ عوام میں بھی مشہور ہے' قرآن پاک میں بھی ہے "حرمت علیکم امھتکم" تم پر تمہاری مائیں حرام ہیں۔ پس خانصاحب عورت اور بیٹے شوہر فرض کئے جائیں تو بھی یہ نکاح ناجائز ہے۔

علاوہ ازیں ایک وقت میں ایک عورت کے دو شوہر ہو بھی نہیں سکتے دوسرے معنی آقا

کے ہیں۔وہ بھی یہاں مراد نہیں ہو سکتے کیونکہ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ بیٹے ہوئے آقا اور اعلیٰ حضرت غلام ہوئے۔سوال ہوگا یہ غلام بیٹوں کی ملکیت میں کہاں سے آیا۔کہیں بازار سے خرید کر لائے یا کہیں سے میراث میں ملا' یا جہاد میں گرفتار کر کے لائے آخر اس عبد مشترک کی کیا حیثیت ہے۔پس یہ معنی بھی مراد نہیں ہو سکتے۔لامحالہ وہ تیسرے معنی ''دلال'' کے متعین ہو گئے۔ جس سے پتہ چلا گھر میں آمدنی کا ذریعہ کیا تھا۔پھر فرمایا کہ ہمارے ایک دوست تھے ایک دفعہ انہوں نے کہا لغت کی کتابیں منگاؤ تا کہ میاں کے معنی دیکھوں۔میں نے کہا بگھارتے رہنے آپ لغت کی کتاب۔میاں کے معنی تلاش کرتے رہئے مگر آپ کو ملنے کے نہیں۔

☆

بکرے کی حلت اور سؤر کی حرمت پر پنڈت سے گفتگو

ارشاد فرمایا کہ ایک مرتبہ ایک پنڈت میرے پاس آیا۔کبھی کبھی آیا کرتا تھا۔کہنے لگا مولوی صاحب آپ کے مذہب میں ایک مسئلہ بڑا عجیب ہے میں نے کہا ہم سارے ہی عجیب ہیں آپ نے دیکھا ہی کیا ہے بتلائیے؟اس نے کہا دو جانور ایک صورت شکل کے ایک کو آپ حلال کہتے ہیں ایک کو حرام کہتے ہیں یعنی بکرا اور سور ایک طرح کے ہیں مگر آپ ایک کو حلال کہتے ہو ایک کو حرام اس کی کیا وجہ ہے؟میں نے کہا پنڈت جی ذرا جواب کڑوا ہے ناگوار نہ گزرے'اس نے کہا ہوگا ہی نہیں جواب'میں نے کہا جواب تو ایسا ہے کہ اگر سمجھ میں آ گیا تو ناک کے بال بھی جل جائیں گے منہ سے حلق تک سب چھل جائے گا اور زندگی بھر کبھی یہ سوال زبان پر نہیں لاؤ گے۔لیکن چونکہ آپ سے تعلق ہے اس لئے زیادہ کڑوے اجزاء نکال کر ہلکی کڑواہٹ کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔سنئے۔کون اندھا ہے جو بکرے اور سور کو ایک جیسا کہہ دے گا(میں نے اپنی طرف اشارہ کر کے کہا)

بکرے کے داڑھی ہے سؤر کے داڑھی نہیں۔

بکرا گھاس پات کھاتا ہے۔سور پاخانہ اور دوسری غلاظتیں کھاتا ہے۔

بکری کے تھن دو ہوتے ہیں اور سورنی کے زیادہ بکری کے تھن دونوں رانوں کے بیچ ہوتے ہیں اور سورنی کے سینے پر ہوتے ہیں۔

بکرے کے سینگ ہوتے ہیں سؤر کے سینگ نہیں ہوتے۔

غرض صورت اور اعضاء کی خلقت دونوں کی الگ الگ ہے۔لیکن ہم نے مانا کہ دنیا میں اندھے بھی رہتے ہیں ان کی رعایت بھی ضروری کرنی ہے (جن کو یہ فرق نظر نہیں آتا) اچھا آپ بتلایئے کہ آپ کی والدہ زندہ ہے۔

اس نے کہاں ہاں زندہ ہے۔

میں نے پوچھا بہن ہے کوئی ؟

اس نے کہا ہاں ہے۔

میں نے کہا بیوی ہے؟ کہا ہاں۔

میں نے پوچھا کہ بچے بھی ہیں؟ اس نے بتایا دو بچے ہیں۔

میں نے کہا کس سے؟

اس نے کہا کس سے کا کیا مطلب؟

میں نے کہا بھئی آپ کے گھر میں تین عورتیں ہیں ایک آپ کی والدہ اور دوسرے آپ کی بہن تیسرے آپ کی بیوی۔ وہ دو بچے آپ کے کس عورت سے ہیں؟

اس پر غصہ میں جواب دیا بیوی سے ہیں اور کس سے ہوتے۔

میں نے کہا آپ کی بیوی والدہ بہن تینوں عورتیں ہیں شکل وصورت بھی ایک ہی ہے۔ دونوں ایک جیسی ہیں۔ دو آنکھیں ان (بیوی) کے دو آنکھیں ان (والدہ) کے دو کان دو ہاتھ دو پیر بیوی کے بھی والدہ کے بھی شکل بھی ایک اعضاء بھی ایک خلقت بھی ایک لیکن کیا وجہ ہے آپ اپنے لئے بیوی کو حلال سمجھتے ہیں اور والدہ کو حرام؟ (ان کی پیشانی پر تغیر آیا) پھر بیوی اور ماں میں تو عمر کا فرق بھی ہے۔ بیوی اور بہن میں کوئی خاص فرق نہ ہو گا عمر بھی ایک جیسی ہو گی۔ کیا وجہ ہے کہ آپ بہن کو اپنے لئے حرام سمجھتے ہیں اور بیوی کو حلال سمجھتے ہیں۔

پنڈت جی غصہ میں آ کر کہنے لگے دیکھئے۔ یہ ہیں مسلمان' یہ ہیں ان کے اخلاق' یہ ہے ان کی تمیز' پہنچ گئے ماں بہن پر۔

میں نے کہا توبہ توبہ پنڈت جی آپ غلط سمجھ گئے۔ میں آپ کی ماں بہن پر نہیں پہنچ رہا

ہوں آپ ایسا سمجھے تو بے واقعی غصہ کی بات۔ کسی شریف آدمی کی ماں بہن کے پاس کوئی غیر آدمی پہنچ جائے تو غصہ آ ہی جاتا ہے آپ کا غصہ بالکل صحیح ہے لیکن سمجھے آپ غلط۔ (آپ ہی نے سوال کیا تھا کہ ایک ہی شکل وصورت کے دو جانور ہیں اسلام عجیب ہے کہ ایک کو حلال ایک کو حرام کہہ دیا اسی کا جواب سمجھا رہا ہوں) بس اب اول فول بکنا شروع کیا۔

میں نے کہا دیکھئے میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ جواب بہت زیادہ کڑوا ہے تاہم اس میں سے بہت کڑوے اجزاء میں نے نکال لئے تھے۔ کہنے لگے۔ کہہ دو وہ بھی کہہ دو۔ میں نے کہا کہہ دوں؟ اس نے کہا ہاں۔ میں نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ اب کچھ تحمل کا مادہ پیدا ہو گیا ہے۔ تو سنئے مجھ میں اور آپ میں کوئی فرق تو نہیں' کیا وجہ ہے کہ آپ اپنی بیوی کو خود کے لئے حلال سمجھتے ہیں اور میرے لئے حرام' مجھے اجازت دو اور دو بچے مجھ سے بھی جنوا دو اسی طرح مجھ میں اور آپ کے بہنوئی میں کوئی فرق نہیں کیا وجہ ہے کہ اپنی بہن کو اپنے بہنوئی کیلئے آپ جائز سمجھتے ہیں اور میرے لئے ناجائز اسی طرح کیا وجہ ہے کہ اپنی والدہ کو اپنے والد کے لئے حلال سمجھتے ہیں اور میرے لئے حرام کہتے ہو۔ حالانکہ بظاہر مجھ میں اور آپ کے والد میں کوئی فرق نہیں بلکہ پرانی وضع قطع کے ہوں تو شاید ان کے بھی داڑھی ہو۔ غرض ہم دونوں ایک سے ہیں کیا وجہ ہے کہ ان کے لئے آپ کی والدہ حلال میرے لئے حرام؟ پنڈت جی بہت بہت شرمندہ ہوئے اور جتنے الفاظ ان کی ڈکشنری میں تھے غصہ میں سارے ہی کہہ دیئے۔ میں نے کہا پنڈت جی اب بہت ہو گیا اب ذرا سنبھل کر بیٹھو آپ کا غصہ اور ناراض ہونا حماقت اور جہالت ہے۔ آپ اپنے مذہب سے واقف نہیں جو ناراض ہو رہے ہیں۔ آپ کی کتاب ستیارتھ پرکاش ص ۱۲۹ میں لکھا ہے کہ جو شخص روپیہ حاصل کرنے کے لئے یا علم حاصل کرنے کے لئے باہر پردیس میں گیا ہو اور اس کے پیچھے اس کی بیوی کو اولاد حاصل کرنے کی خواہش ہو تو اس کے واسطے جائز ہے کہ اپنے پڑوسی سے حاصل کرلے۔ میں نے کتاب کھول کر دکھا دی۔ اس کے بعد میں نے کہا اب بتایئے میں نے کیسے خلاف کیا اگر کوئی آپ کے پڑوس میں رہتا ہو اور آپ کہیں باہر گئے ہوں اور آپ کی بیوی کو اولاد حاصل کرنے کی خواہش ہو تو آپ کی کتاب کی رو سے بلاتکلف جائز ہے کہ غیر سے اولاد حاصل کرلے بس اب اٹھ کر چل دیئے۔ میں نے کہا پنڈت جی معاف کرنا سور کا جواب تو ایسا ہی ہو۔ اس نے کہا ہاں اب سور بھی مجھے کہہ دو میں نے کہا کہ میں تو بہت دیر سے کہہ رہا ہوں کوئی نہ سمجھے تو میں کیا کروں۔ (ملفوظات فقیہ الامت سے ماخوذ)

ادیبوں کے لطیفے

ایک روز نواب مرزا داغ دہلوی (۱۸۳۱ء ۔ ۱۹۰۵ء) نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک صاحب ان سے ملنے آئے اور انھیں نماز میں مشغول دیکھ کر لوٹ گئے۔ اس وقت داغ نے سلام پھیرا۔ ملازم نے کہا "فلاں صاحب آئے تھے اور چلے گئے"۔ فرمانے لگے "دوڑ کر جا ابھی راستے میں ہونگے"۔ وہ بھاگا بھاگا گیا اور ان صاحب کو بلا کر لایا۔ داغ نے ان سے پوچھا کہ "آپ آکر چلے کیوں گئے؟" وہ کہنے لگے "آپ نماز پڑھ رہے تھے اس لئے میں چلا گیا۔" داغ نے فوراً کہا "حضرت! میں نماز پڑھ رہا تھا۔ لاحول تو نہیں پڑھ رہا تھا جو آپ بھاگے۔"

----------------------*-----------*-----------

الہ آباد میں ایک ایٹ ہوم میں اکبرالہ آبادی (۱۸۴۶ء ۔ ۱۹۲۱ء) خان بہادر سید اکبر حسین اکبر بھی شریک ہوئے۔ وہاں طرح طرح کے انگریزی لباس پہنے ہوئے ہندوستانی جمع تھے۔ ایک کالے صاحب بھی تھے۔ ان کو انگریزی لباس جچتا نہ تھا۔ ان پر حضرت اکبر پھبتی کستے ہیں۔

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے
بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی، صابون بھی ہے
لیکن میں پوچھتا ہوں تجھ سے ہندی
یورپ کا تیری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

----------------------*-----------*-----------

ایک دن حضرت اکبر اس راہ سے گزرے جس طرف کلال تھے۔ آپ کی نظر جو پڑی، وہاں مسلمانوں کو مجمع دوسری قوم کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ اس پر فرمایا:

مسجدیں چھوڑ کے جا بیٹھے ہیں میخانوں میں
واہ کیا جوشِ ترقی ہے مسلمانوں میں

----------------------*-----------*-----------

ایک مرتبہ حضرت اکبرالہ آبادی کے ایک دوست نے انھیں ایک ٹوپی دکھائی جس پر قل ہو اللہ کڑھا ہوا تھا آپ نے دیکھتے ہی فرمایا۔ "بھئی بہت عمدہ ہے، کسی دعوت میں کھانا ملنے میں دیر ہو جائے تو یہ ٹوپی پہن لیا کرو

سمجھ لیں گے کہ انتڑیاں قل ہواللہ پڑھ رہی ہیں۔"

--------------------------*-------------*-------------*

ایک بار مشاعرہ ہو رہا تھا، ایک مسلم الثبوت استاد جگر مراد آبادی (۱۸۹۰ء تا ۱۹۶۰ء) اٹھے اور انھوں نے طرح کا ایک مصرع دیا۔

ع چمن سے آ رہی ہے بوئے کباب

بڑے بڑے شاعروں نے طبع آزمائی کی لیکن کوئی گرہ نہ لگا سکا، ان میں سے ایک شاعر نے قسم کھالی کہ جب تک گرہ نہ لگائیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے، چنانچہ وہ ہر صبح دریا کے کنارے نکل جاتے اونچی آواز سے الاپتے۔

چمن سے آ رہی ہے بوئے کباب

ایک روز ادھر سے ایک لڑکا گزرا' جونہی شاعر نے یہ مصرع پڑھا' وہ لڑکا بول اٹھا

ع کسی بلبل کا دل جلا ہوگا

شاعر نے بھاگ کر اس لڑکے کو سینے سے لگایا۔ یہی لڑکا بڑا ہو کر جگر مراد آبادی کے نام سے مسلم الثبوت استاد بنا۔

--------------------------*-------------*-------------*

محترمہ بیگم حمیدہ سلطان صاحبہ پنڈت ہری چند اختر (۱۹۰۰ء تا ۱۹۵۸ء) جنرل سیکریٹری انجمن ترقی اُردو (دہلی) کے ہاں علی منزل میں ایک شعری نشست میں مرحوم ناروی غزل سنا رہے تھے۔ ردیف تھی' کیا کیا' نوح صاحب نے اپنی مخصوص تحت اللفظ طرز ادا میں جب یہ مصرع پڑھا:

یہ دل ہے' یہ جگر ہے' یہ کلیجہ

تو پنڈت ہری چند اختر بے ساختہ کہہ اٹھے۔

قصائی لایا ہے سوغات کیا کیا

سامعین تو کیا خود حضرت نوح کا ہنستے ہنستے بُرا حال تھا۔ حال آنکہ نفسی اور حضرت نوح میں اینٹ اور کتے والا بیر تھا۔

چراغ حسن حسرت ولادت: (۱۹۰۵ء ۱۹۵۵ء) (ایڈیٹر ''شیرازہ'' لاہور) کا قد لمبا تھا۔ ایک روز بازار گئے' آموں کا موسم تھا ایک دکاندار سے بھاؤ پوچھا۔ دکاندار نے کہا۔ پانچ آنے سیر۔ حسرت نے کہا ''میاں آم تو بہت چھوٹے ہیں''

دکاندار نے کہا۔ ''میاں نیچے بیٹھ کر دیکھو آم چھوٹے ہیں یا بڑے۔ قطب مینار سے تو بڑی شے چھوٹی نظر آتی ہے۔

------------------------*------------*------------

کسی صاحب نے ایک بار اسرار الحق مجاز (۱۹۱۱ء ۱۹۵۵ء) سے پوچھا۔ ''کیوں صاحب! آپ کے والدین آپ کی رندانہ بے اعتدالیوں پر کچھ اعتراض نہیں کرتے؟'' مجاز...... ''جی نہیں۔!'' ''کیوں......؟'' مجاز ''لوگوں کی اولاد سعادت مند ہوتی ہے لیکن خوش قسمتی سے میرے والدین سعادت مند ہیں۔''

------------------------*------------*------------

حیدرآباد دکن میں ''قاف'' کی جگہ عام طور پر لوگ ''خ'' بولتے ہیں۔ کسی حیدرآبادی نے مجاز کو ایک دعوت پر مدعو کرتے ہوئے کہا۔ ''مجاز صاحب! کل میری فلاں عزیزہ کی تخریب (تقریب) ہے غریب خانے پر تشریف لائیے۔'' مجاز نے خوفزدہ ہو کر جواب دیا۔ ''نہیں صاحب مجھ سے یہ دردناک منظر نہیں دیکھا جا سکے۔''

------------------------*------------*------------

ایک ادب نواز مجسٹریٹ نے مجاز کو بستی آنے کی دعوت دی۔ مجاز نے کہا۔ ''کچھ کام کی بات بھی ہوگی۔'' اس نے جواب دیا ''تم آؤ تو نہلا دونگا۔'' مجاز مسکرا کر بولے۔ ''خیر وہاں تو نہلا دو گے۔ یہاں کم از کم وضو تو کرواہی دو۔''

------------------------*------------*------------

ڈاکٹر تاثیر اور احسان دانش (۱۹۱۱ء ۱۹۸۲ء) ریل میں اکٹھے سفر کر رہے تھے۔ ایک اسٹیشن پر تاثیر کے ایک دوست اسی ڈبے میں داخل ہوئے۔ تاثیر نے ان سے احسان دانش کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ آپ ہیں اُردو کے مشہور شاعر' مصور فطرت' شاعرِ مزدور' حضرت احسان دانش کاندھلوی۔ اس دوست نے پوچھا ہی جو

مزدوروں کے بارے میں نظمیں لکھتے رہتے ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں وہی۔ وہ دوست کہنے لگا'' خدا کی قسم ان کی نظمیں پڑھ کے یہ جی چاہتا ہے کہ صبح کو اٹھتے ہی ہر مزدور کے سر سو جوتے لگائے جائیں۔''

------------------------*------------*------------*

ہری پور ہزارہ میں قتیل شفائی (۱۹۱۹ء) اور انکے دوستوں نے ۱۹۳۹ء میں ڈاکٹر اقبال کی پہلی برسی کے سلسلے میں مشاعرے کا اہتمام کیا۔ چندہ اکٹھا کرنے کے سلسلے میں جب ایک دکاندار کو انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر اقبال کی برسی کے سلسلے میں یہ مشاعرہ ہو رہا ہے تو اس نے آبدیدہ ہو کر پوچھا کیا سچ مچ ڈاکٹر اقبال وفات پا گئے ہیں؟ اس پر قتیل شفائی نے حیران ہو کر پوچھا کیا آپ انھیں جانتے تھے۔ اس پر انھوں نے فرمایا۔ کیوں نہیں ابھی دو سال پہلے میری بھینس بیمار ہوگئی تھی انھوں نے بڑی توجہ سے اس کا علاج کیا تھا۔ یہ سننا تھا کہ سب کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

------------------------*------------*------------*

ایک مشاعرے کی نظامت کے فرائض بشیر بدر (۱۹۳۵ء) کر رہے تھے۔ شاعر کو داد دی جا رہی تھی۔ واہ واہ کے ساتھ مجمع کے کسی شریر لڑکے نے کتوں کی طرح بھوں بھوں کر کے داد دی۔ بشیر بدر نے کہا کہ ہر شخص کو اپنی مادری زبان میں داد دینے کا حق حاصل ہے۔

------------------------*------------*------------*

مشہور عالم آفاقی، کمال جعفری اور شان بھارتی ذکریا اسٹریٹ سے پیدل ہی چاندنی چوک جا رہے تھے۔ چلتے چلتے جدیدیت پر بات چل نکلی اور لوگ اس قدر مستغرق ہوئے کہ بجائے چاندنی چوک کے دھرم تلہ کے قریب پہنچ گئے۔ اس کا احساس سب سے پہلے شان بھارتی کو ہوا۔ انھوں نے کمال جعفری سے کہا'' بھئی ہم لوگ شاید دوسرے راہ پر آ گئے ہیں۔'' یہ سنتے ہیں مشہور عالم آفاقی نے کہا۔'' جدیدیت جو سوار تھی۔ اس لئے بے راہ روی تو ہوگی ہی۔''

------------------------*------------*------------*

عربی کے مشہور شاعر ابونواس کے پاس ایک مرتبہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا۔ ''ابونواس' میں سارے عرب کا سفر کرنا چاہتا ہوں۔ تم مجھے ایک رقعہ لکھ کر دے دو' جسے میں عرب کے امیروں کو دکھلاؤں' تا کہ وہ میری مدد

کریں۔'' ابونواس نے رقعہ لکھا اور اسے بند کر کے اس کے حوالے کر دیا۔ وہ چلا گیا۔ تھوڑی دور جا کر اس نے لفافہ کھولا پڑھا تو اس میں لکھا تھا۔ '' یہ شخص مکار ہے میرے نام سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ لہٰذا کوئی اس کی امداد نہ کرے۔''

رقعہ پڑھتے ہی اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور واپس آیا۔ اور غصہ سے خطاب کرتے ہوئے بولا۔ '' ابونواس! یہ کیا فریب کاری ہے۔'' ابونواس نے جواب دیا۔ '' گھبراتے کیوں ہو یہ ہماری سوسائٹی کے اصطلاحی الفاظ ہیں۔ جس کی امداد مقصود ہوتی ہے اسے ہم اسی قسم کے الفاظ لکھ کر دیتے ہیں۔ یہ سنتے ہی اس نے کہا '' ابونواس تم بڑے بے ایمان ہو دغا باز ہو۔'' انھوں نے کہا '' بھائی مجھے میرے احسان کے بدلے میں گالیاں کیوں دیتے ہو۔'' اس نے کہا '' گھبراتے کیوں ہو یہ میری سوسائٹی کے اصطلاحی الفاظ ہیں جو شکریہ کے ہم معنی ہوتے ہیں۔''

------------------------*------------*------------*

مولانا سمیع اللہ کی دکان پر اکثر شاعروں اور ادیبوں کی محفلیں ہوتی تھیں ایک دن کچھ ادیب تذکرہ کر رہے تھے کہ فلاں پبلشر رائلٹی نہیں دیتا۔ شاہراہ والے پرکاش پنڈت کو وقت پر تنخواہ نہیں دیتے وغیرہ۔ اس پر مولوی سمیع اللہ بولے کہ ہمارے رائٹر اچھے ہیں جو ہم سے کبھی معاوضے یا رائلٹی کا مطالبہ نہیں کرتے۔ اس پر سب نے حیران ہو کر یک زبان پوچھا میاں ایسے کون سے شاعر و ادیب ہیں جو بغیر معاوضے کے کام کرتے ہیں۔ اس پر سمیع اللہ صاحب بولے کہ اللہ۔ رسول۔ (کیونکہ مولانا صاحب قرآن شریف اور سورے وغیرہ شائع کرتے تھے

کر لے جو کرنا ہے آخر موت ہے

ابونعیم نے اپنی کتاب ''الحلیہ'' میں مجاھد کے حالات میں تحریر کیا ہے کہ انہوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے قول ''اینما تکونوا یدرککم الموت ولو کنتم فی بروج مشیدہ'' یعنی جہاں کہیں بھی تم ہوگے موت تم کو آجائے گی اگر چہ تم مضبوط قلعوں میں بھی ہو۔ کی تفسیر میں فرمایا کہ تم سے پہلے لوگوں میں ایک عورت تھی اور اس کے یہاں ایک تنخواہ دار ملازم تھا۔ اس عورت کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس نے نوکر سے کہا کہ کہیں سے آگ لے آ۔ چنانچہ جب نوکر آگ لینے کے لئے گھر سے نکلا تو اس کو دروازہ پر ایک شخص کھڑا ہوا ملا۔ اس نے نوکر سے پوچھا کہ اس عورت کے ہاں کیا پیدا ہوا ہے؟ نوکر نے جواب دیا کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ یہ سن کر اس شخص نے کہا کہ یہ لڑکی جب تک سو۱۰۰ مردوں سے زنا نہیں کرائے گی ہرگز نہیں مرے گی اور آخر میں اپنے نوکر سے نکاح کرے گی اور اس کی موت ایک مکڑی کے ذریعہ واقع ہوگی۔ یہ پیشین گوئی سن کر نوکر نے اپنے دل میں کہا کہ میں ایسی لڑکی سے نکاح کر کے کیا کروں گا جو سو۱۰۰ امردوں سے زنا کر چکی ہو۔ لہٰذا اس لڑکی کو قتل کر دینا بہتر ہے۔ چنانچہ اس نے ایک چھری لی اور اندر جا کر اس لڑکی کا شکم چاک کر دیا اور وہاں سے فرار ہو گیا اور ساحل پر پہنچ کر ایک جہاز میں سوار ہو گیا۔

ادھر لڑکی کے زخم کاری نہیں لگا تھا لہٰذا لڑکی کے پیٹ میں ٹانکے لگوائے گئے اور اس طرح وہ چند دن کے بعد تندرست ہوگئی۔ پھر وہ جوان ہوگئی اور اس کا رنگ روپ نکھرا تو اپنے وقت کی نہایت حسین وجمیل عورتوں میں اس کا شمار ہونے لگا۔ کچھ دن بعد اس لڑکی نے جسم فروشی کا دھندہ شروع کر دیا اور ساحل سمندر کے قریب سکونت اختیار کر لی اور مسلسل مذموم کام میں مشغول رہی۔

اتفاق کی بات وہ ملازم ایک عرصہ کے بعد اس شہر میں واپس آیا اور ساحل پر اس جہاز سے اترا۔ اب اس کے پاس کافی دولت تھی جو کہ اس نے اس عرصہ میں دوسرے شہروں سے کمائی تھی۔ چنانچہ اپنے شہر کے ساحل پر اتر کر اس نے اہل ساحل سے کہا کہ میرے لئے کوئی حسین عورت تلاش کرو تا کہ میں اس سے نکاح کر سکوں۔ اہل ساحل کی عورتوں میں سے ایک عورت نے کہا یہاں ساحل پر ایک حسین وجمیل عورت رہتی ہے مگر وہ جسم فروشی کا دھندہ کرتی ہے۔ اس ملازم نے کہا کہ اچھا ذرا اس کو میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ یہ عورت اس لڑکی کے پاس گئی اور تمام ماجرا بیان کیا۔ لڑکی نے جواب دیا کہ

میں نے اب جسم فروشی کا دھندہ چھوڑ دیا ہے اگر وہ مجھ سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

غرضیکہ اس ملازم اور لڑکی کا اہل ساحل نے نکاح کرادیا اور اس طرح اس شخص کی پیشین گوئی کا پہلا جزو پورا ہو گیا۔ ملازم کو یہ لڑکی بہت پسند آئی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا اور ایک دن اس نے اپنی بیوی کو آپ بیتی سنائی اور یہ بھی اس کو بتادیا کہ میں ایک نوزائیدہ لڑکی کو قتل کر کے یہاں سے کافی عرصہ پہلے بھاگا تھا۔ بیوی نے یہ ماجرا سن کر کہا کہ میں وہی نوزائیدہ لڑکی ہوں اور اپنا پیٹ کھول کر شوہر کو چھری کے زخموں کے نشانات دکھائے اور اپنے زانیہ ہونے کا بھی اعتراف کرلیا اور کہا کہ مجھ کو یہ اندازہ نہیں کہ میں نے سو مردوں کے ساتھ یہ فعل کیا ہے۔ شوہر نے بیوی کے تمام حالات سننے کے بعد کہا کہ تمہاری موت کا سبب ایک مکڑی بنے گی۔

اس کے بعد اس کے شوہر اور بیوی نے جنگل میں ایک مضبوط محل بنوایا اور چونا اور گچ سے اس کو مزید پختہ کرایا تاکہ کوئی موذی جانور اور مکڑی وغیرہ اس میں نہ گھس سکے اور تمام اطراف سے اطمینان کرلینے کے بعد یہ دونوں میاں بیوی اس محل میں رہنے لگے۔ ایک دن شوہر نے چھت میں ایک زہریلی مکڑی دیکھی تو اس نے بیوی سے کہا کہ یہ دیکھنا یہ وہی مکڑی تو نہیں ہے جو تیری موت کا سبب ہوسکتی ہے۔ بیوی نے مکڑی کو دیکھ کر کہا کہ ہاں یہ مکڑی ہی ہے مگر میں اس کو ابھی مارڈالتی ہوں۔

چنانچہ اس نے مکڑی کو گرا کر اپنے پیر کے انگوٹھے سے رگڑنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ مکڑی نے اچانک اچھل کر اس کے انگوٹھے میں کاٹ لیا جس سے اس کا زہر بیوی کے جسم میں سرایت کر گیا اور اس کا پاؤں سیاہ پڑ گیا اور دھیرے دھیرے تمام خون زہر آلود ہو گیا جس سے اس کی موت واقع ہو گئی۔

کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا واقعہ ہی آیت مذکورہ بالا کا شان نزول ہے۔ لیکن اکثر مفسرین کا قول ہے کہ یہ آیت غزوہ احد کے موقع پر منافقین مدینہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ کیونکہ منافقین نے شہداء احد کے بارے میں کہا تھا:

"لو کانوا عندنا ما ماتوا وما قتلوا"

یعنی یہ لوگ اگر ہمارے ساتھ ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے۔"

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اسی قول کا جواب اس آیت میں دیا ہے یعنی

"اینما تکونوا یدرککم الموت"

عیسائیت میں پاپائیت کا کام اور مقام

عیسائیت کو سرکاری مذہب کا مقام قسطنطین شہنشاہ روما نے عطا کیا اس لحاظ سے مذہبی اور دنیاوی امور یکجا ہو گئے اور حکومت روما مقدس بن گئی اس دور میں کلیسا کا انتظام پانچ بڑے پادریوں کے ذمے تھا جنہیں (Patriachs) کہا جاتا تھا۔ جو انگریزی میں فادر کے ہم معنی ہے۔ کلیسا دو تھے مغرب میں روم کا اور مشرق میں قسطنطنیہ کا۔ رومی کلیسا کو اس بات پر ناز تھا کہ پطرس اور پولوس نے روم میں ہی وفات پائی تھی اور وہی عیسائیت کی اصل روایات کا علمبردار تھا۔ دوسری طرف قسطنطنیہ کا کلیسا بھی اپنے آپ کو کم اہم نہ سمجھتا تھا۔ اس لئے کہ اس دور میں قسطنطنیہ ہی سلطنت روما کا دارالحکومت یا مرکزی مقام تھا۔ اس لئے وہ رومی کلیسا پر برتری رکھتا تھا۔ دونوں کلیساؤں میں اختلافات کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ دونوں کی زبانیں مختلف تھیں۔ رومی کلیسا میں لاطینی اور قسطنطنیہ میں یونانی۔ دونوں کی تعلیمات کا ترجمہ جب ایک زبان سے دوسری زبان میں ہوتا تو مطالب ومفہوم میں اختلاف پیدا ہو جاتا۔ اور دونوں میں بحث چھڑ جاتی۔ ان ہی وجوہات کی وجہ سے دونوں میں اختلافات کی خلیج اس حد تک وسیع ہوئی کہ دونوں کبھی متحد نہ ہو سکے اور مذہب کے ایک منظم ادارے کی حیثیت سے کلیسا کا نظام پارہ پارہ ہو گیا۔ اس پر مزید ستم یہ کہ صلیبی جنگوں کے دوران عیسائی افواج نے کلیسائے قسطنطنیہ کے علاقوں کو تخت وتاراج کیا جس سے اختلافات اور بڑھ گئے۔

وہ شخص جس نے سب سے پہلے پاپائی نظام کو مستحکم بنیادوں پر استوار کیا۔

گریگوری اول (۵۴۰ء تا۶۰۹) تھا۔اس دور میں بہت سی وحشی اقوام عیسائیت میں داخل ہوئیں جس سے پوپ کی قوت میں اضافہ ہوا۔وہ دینوی اور دنیاوی دونوں طاقتوں کا منبع و سرچشمہ قرار دیا گیا اوراس سلسلے میں اسے غیر محدود اختیارات حاصل ہو گئے حتیٰ کہ بڑے بڑے عیسائی بادشاہوں کو پوپ کی حمایت حاصل کئے بغیر چارہ نہ رہا۔

پوپ کی زبردست طاقت کا یہ دور ۸۰۰ء سے شروع ہوا۔جب رومتہ الکبریٰ کی مقدس سلطنت کے پہلے شہنشاہ شارلی مان کو روما میں پوپ نے مذہبی رسوم کے ساتھ اپنے ہاتھ سے تاج پہنایا۔اسی تاج پوشی کے بعد سے ہی سلطنت روما کا نام ''مقدس سلطنت روما'' رکھ دیا گیا۔جب پوپ نے شارلی مان کو اس سلطنت کا فرمانروا بنایا تھا اس وقت اس کی حدود میں وہ تمام ممالک شامل تھے جو آج کل فرانس، جرمنی، اٹلی اور وسط یورپ کی ریاستوں یوگوسلاویہ اور رومانیہ کے نام سے موسوم ہیں۔یہ وہ زمانہ تھا جب بحر روم سے لے کر بحر ہند تک دولت عباسیہ کے سلاطین کا آفتاب اقبال جگمگا رہا تھا اور اسپین میں عرب سلاطین کے ہاتھوں قرطبہ وغرناطہ کی بنیادیں رکھی جارہی تھیں۔

۸۰۰ء کے بعد پوپ ہی یورپ کا معنوی فرمانروا تھا۔اس تاریخ کے بعد سے سولہویں اور سترہویں صدی عیسویں تک یورپ کے بادشاہوں کا تخت وتاج عملاً پوپ کے ہاتھ میں تھا۔وہ جسے چاہتا تخت پر بٹھا سکتا اور جسے چاہتا تخت سے محروم کرسکتا تھا چنانچہ شارلی مان کی وفات کے بعد جب اس مقدس سلطنت روما میں انتشار پیدا ہو گیا اور ہر چھوٹا حکمران اپنی جگہ خود مختار بن بیٹھا تو یہ پوپ ہی تھا جس کی مداخلت سے آٹو اعظم کو باقاعدہ تاجدار تسلیم کیا گیا۔اس تاج پوشی کے بعد یورپ کے تمام سرداروں جاگیرداروں اور چھوٹے بڑے سب فرمانرواؤں نے یہ طے کیا کہ آئندہ سے بادشاہ کی تاجپوشی پوپ یا اس کے مقرر کئے ہوئے نائب ہی کیا کریں گے۔یہ تعداد بعد میں محدود ہو کر سات تک رہ گئی۔ان میں تین پاپائیت کے نمائندے ہوتے تھے اور چار رؤسا کے۔ان رؤسا پر بھی پوپ کا اثر رسوخ ہوتا۔ گویا بادشاہت کا پورا اختیار پوپ کے ہاتھوں میں تھا۔تیرھویں اور چودھویں صدی میں

پورے یورپ میں صرف پوپ ہی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ یورپ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام چھوٹے بڑے فرمانروا اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھے۔ پوپ کا قانون ہی سب کچھ تھا۔

پوپ کے اثر واقتدار کا اندازہ اس بات سے لگالیجئے کہ پوپ صرف شہنشاہ ہی نہیں تھا بلکہ ظاہری شان وشوکت کے لحاظ سے بھی اس کا دربار بڑے بڑے حکمرانوں کے دربار کو شرماتا تھا۔ پوپ کا بھی باقاعدہ تاج ہوتا جس پر لاکھوں کے جواہرات ٹکے ہوتے اور جب بھی نیا پوپ مقرر ہوتا ——————

—————— تو اسے وہ تاج انہیں مذہبی رسوم کے ساتھ پہنایا جاتا جو بادشاہوں کی تاجپوشی کے وقت ادا کی جاتی تھیں **پوپ کے صرف مصاحب خاص کے لئے** جو جاگیر تھی اس کا رقبہ تیرھویں صدی عیسوی میں سترہ ہزار مربع میل تھا۔

پاپائیت کا مرکز روم تھا۔ جہاں ''ٹی کن'' مقام پر پوپ کا محل ہے۔ اسے ۱۳۷۷ء میں پوپ گریگوری یازدہم نے اپنا مستقر بنایا تھا اور جو اس وقت سے آج تک پاپائیت کا مستقر ہے۔ یہ اپنی وسعت کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی عمارت ہے۔ یہ محل گیارہ سو اکاون فٹ لمبا اور سات سو چھتر فٹ چوڑا ہے۔ اس کے کمروں کی تعداد چار ہزار کئی منزلیں ہیں۔ جن پر جانے کے لئے بے شمار زینے ہیں۔ بیسیوں ایوان ہیں متعدد پائیں باغ ہیں اور چند در چند بڑے ہال ہیں۔

پوپ کے ایک ہاتھ میں یورپ کے بادشاہوں کے تاج تھے تو دوسرے ہاتھ میں عوام کے دل ودماغ کی باگ ڈور' سیاسی قوت اور مذہبی اثر' پھر دولت نے کلیسا کو وقت کا اہم ترین ادارہ بنادیا تھا۔ لیکن کلیسا نے ان اختیارات کا صحیح استعمال نہ کیا اگر بادشاہ کلیسا کے احکام سے سرتابی کی جرات کرتے تو وہ تخت وتاج سے محروم کردیئے جاتے اور اگر عوام میں سے کسی کے سر میں سرکشی کا سودا سماتا تو اسے الحاد و بے دینی کی سزا دی جاتی تھی۔ جب اس قسم کے سرکش افراد کی تعداد کچھ بڑھنے لگی تو ۱۲۴۸ء میں پوپ انوسینٹ چہارم (Innocent IV) نے عدالت تفتیش (Ihquisi Tion) کے نام سے استیصال الحاد

کے لئے ایک عدالت قائم کی جس کی شاخیں پورے یورپ میں تھیں پندرہویں صدی عیسوی میں یہ عدالت اپنے شباب پر تھی ہر وہ شخص جس کے خلاف پوپ کی بے چون و چرا اطاعت سے سرتابی کرنے کا شبہ ہوتا اسے فوراً گرفتار کر کے اس عدالت کے ججوں کے سامنے لایا جاتا۔ مگر ملزم کو نہ تو الزام لگانے والے کا پتہ ہوتا اور نہ اسے صفائی کا موقع دیا جاتا۔ مقدمے کی کاروائی بند کمرے میں ہوتی دوٹوک فیصلہ ہوتا۔ ملزم اقرار کرے یا انکار دونوں صورتوں میں موت اس کی منتظر تھی۔ ملزم اگر اقرار جرم نہ کرتا تو سمجھ لیا جاتا کہ جھوٹ بول رہا ہے۔ سچ بلوانے کے لئے اس پر ہولناک سختیاں کی جاتیں۔ بالآخر وہ اقرار جرم کر لیتا ____________________ ایک اندازے کے مطابق ۱۴۸۱ سے ۱۸۰۸ء تک ان احتسابی عدالتوں نے تقریباً تین لاکھ چالیس ہزار آدمیوں کو مختلف سزائیں دیں۔ ان میں سے صرف ۳۲ ہزار وہ تھے جنہیں دہکتی آگ کی نذر کیا گیا۔ جن لوگوں کو سزائیں دی گئیں ان میں گلیلیو جیسے ماہرین سائنس شامل تھے۔ اٹلی کے مشہور سائنس دان برونو کو بھی اشاعت علم کے جرم میں آگ کی نذر کر دیا گیا۔

کلیسا کے ان ہی مظالم کی بناء پر بہت سے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مذہب اور سائنس ایک دوسرے کے مخالف ہیں اور اسی پس منظر کی بناء پر آج بھی بعض لوگ مذہب اور سائنس کو متضاد تصور کرتے ہیں۔

عیسائیت میں کفارے کے عقیدہ کا بانی پولوس یا سینٹ پال قرار دیا جاتا ہے۔ عہد نامہ جدید میں پولوس کے خطوط میں یہ عبارت نہایت واضح ہے کہ:

''تمہیں ایمان کے وسیلہ سے ہی نجات ملی ہے اور یہ تمہاری طرف سے نہیں۔ خدا کی بخشش ہے اور نہ اعمال کے سبب سے ہے۔..... (افسیوں ۲:۹۔۸)

''چنانچہ ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان' شریعت کے اعمال کے بغیر ایمان کے سبب سے راست باز ٹھہرتا ہے''..... (رومیوں کے نام ۳،۲۸)

پھر پوپ کے متعلق یہ بھی طے ہوا تھا کہ اس کا فیصلہ غلط نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اس کے کسی حکم پر بحث و تمحیص کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ وہ خدا کا نائب تھا اور عیسیٰ مسیح کا قائم مقام' وہ

گنہگاروں کے گناہ معاف کراسکتا تھا اور خدا کی رحمت و بخشش کے دروازے لوگوں پر کھول سکتا تھا۔ اسی عقیدے نے رفتہ رفتہ معافی ناموں (Indul Gences) کی صورت اختیار کر لی اور ان کی ابتدا یوں ہوئی کہ صلیبی جنگوں کے دوران میں پوپ اربن دوم نے حکم جاری کیا کہ جو لوگ بذات خود جنگ میں شریک نہیں ہو سکتے۔ وہ اپنی طرف سے کسی اور کو بھیج دیں اور اس کے بدلے میں انہیں معافی نامہ دے دیا جائے گا جو ان کی نجات کا کفیل ہوگا۔

پھر سولہویں صدی عیسوی میں جب پوپ کو سینٹ پیٹر کے نام کا گرجا بنوانے اور اپنے محل کی رونق بڑھانے کے لئے روپے کی ضرورت پیش آئی تو اس نے دستاویز مغفرت (معافی نامے) فروخت کرنے شروع کر دیئے۔ صلائے عام تھی ان گنہگاروں کے لئے جو اپنے گناہ معاف کرانا چاہیں۔ اپنے گناہوں کی مقدار کے مطابق ان دستاویزوں میں سے ایک دستاویز خرید لے۔ ہر گناہ کی بخشش کی قیمت مقرر تھی اور ہر قیمت کی دستاویز تیار۔ کہا جاتا ہے کہ خدا کی رحمت کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوسکتا اور پوپ کے ہاتھ میں اس خزانے کی کنجی ہے۔ اس لئے وہ جسے چاہے رحمت و بخشش سے مالا مال کرسکتا ہے۔ معافی نامے یا دستاویز مغفرت کی عبارت یہ تھی۔

''تم پر خداوند یسوع مسیح کی رحمت ہو اور وہ تمہیں اپنے مقدس ترحم سے (گناہوں کی سزا سے) آزاد کرے۔ میں اس کی اور اس کے بابرکت شاگرد پولوس اور مقدس پوپ کی اس سند کی رو سے جو مجھے انہوں عطا فرمائی ہے۔ تمہیں آزاد کرتا ہوں سب سے پہلے کلیسا کی تمام علامتوں سے خواہ وہ کسی مشکل میں ہوں۔ پھر تمہارے ہر ایک گناہ' حدود شکنی اور زیادتی سے' خواہ وہ کیسے ہی مہیب اور شدید کیوں نہ ہو اور میں وہ سزا تم سے اٹھالیتا ہوں جو تمہیں تمہارے گناہوں کی پاداش میں جہنم میں ملنے والی تھی۔ تاکہ تم جب مرو تو جہنم کے دروازے تم پر بند ہوں اور جنت کی راہیں کشادہ' باپ' بیٹے اور روح القدس کے نام پر۔''

اس معافی نامے میں مختلف گناہوں کی قیمتیں مختلف تھیں۔ معافی نامے کے ہر

ایجنٹ کے پاس ان کی فہرست موجود تھی جس کی اصل (Tax of the Sacred Roman Chancery) کی کتاب میں محفوظ رکھی جاتی تھی۔ چند ایک گناہوں کی معافی کی قیمتیں بھی ملاحظہ فرمالیجئے:

۱۔ اسقاط حمل..............................۳ شلنگ ۶ پنس

۲۔ چوری..............................۹ شلنگ

۳۔ عفیفہ کی عصمت دری..............................۹ شلنگ

۴۔ زنا کی بھیانک صورتوں میں..............................۷ شلنگ ۶ پنس

۵۔ قتل..............................۷ شلنگ ۶ پنس

یہ معافی نامے صرف اپنے گناہوں کی بخشش کے لئے ہی نہ تھے بلکہ مردوں کے گناہوں کے لئے بطور کفارہ بھی خریدے جاسکتے تھے۔ چنانچہ ان معافی ناموں کے ایجنٹ کچھ اس قسم کی آوازیں لگایا کرتے تھے۔

''آؤ بڑھو! جنت کے دروازے کھل رہے ہیں اگر تم اب داخل نہ ہوگے تو کب داخل ہوگے تم بارہ پنس کے عوض اپنے باپ کی روح کو جہنم سے نکلوا سکتے ہو۔ کیا تم ایسے ناخلف ہو کہ اپنے باپ کیلئے اس قدر سستی نجات بھی نہیں خرید سکتے۔ اگر تمہارے پاس اور کچھ نہیں ایک کوٹ ہے تو وہی اتار دو تا کہ اس متاع گراں بہا کو خرید سکو۔''

(See Bucks Theologkal Dictionary Ndulgeces)

چنانچہ اسی دور سے نصرانیت کا پانچواں بنیادی رکن ''اپنی سیاہ کاریوں کا پادری کے سامنے اعتراف'' ٹھہرا۔

اب ایک عیسائی کے لئے کافی ہے کہ جو چاہے کرے' کیونکہ پادری کے سامنے گناہوں کا اعتراف گناہوں کی بخشش اور ان کے عقیدے کے مطابق بلاحساب کتاب ملکوت اعلیٰ میں داخلے کی ضمانت ہے۔ اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے الشیخ ابراہیم سلمان جبہان نے مزید کئی گوشے وا کئے ہیں، ان کی کتاب سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

''پادری کے سامنے اعتراف اس مذہب کے اعجوبوں میں [illegible]

ہے جس کے عجائبات کی کوئی حد نہیں مثلاً ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر عیسائی آخر میں عفریت کے پنجے میں ہوتا ہے اور اس وقت اس کے انجام کا انحصار پادری کے ہونٹوں پر ہوتا ہے۔وہ چاہے تو اس کے لئے بخشش کا پروانہ صادر کر دے اور چاہے تو محرومی کا ٹھپہ لگا دے۔ پہلی صورت میں ان کے عقیدے کے مطابق جنت کا نگران فرشتہ (رضوان) اپنی ایک جماعت کے ساتھ اس متوفی کے اعزاز کے لئے انتظار میں ہوتا ہے اور دوسری صورت میں اس کے گناہ کوئی نہیں بخش سکتا۔

یہ بخشش اور محرومی کے پروانے کے تمسخر کا فیصلہ اس کانفرنس میں ہوا جو ۱۲۱۵ء میں روما میں منعقد ہوئی۔ وہاں کلیسا کو اختیار دیا گیا کہ وہ جسے چاہے بخشش کا اور جسے چاہے محرومی کا پروانہ دے سکتا ہے۔اس مسخرے پن کا نتیجہ یہ ہوا کہ پروانوں کے ذریعے جنت کی خرید و فروخت کی عام لہر چل نکلی اور پادریوں اور ان کے دم چھلوں کو سادہ لوح اور مغفل قسم کے لوگوں کو ورغلانے اور لوٹنے کا خوب موقع مل گیا۔ایک یہودی نے اس مسخرے پن کا پردہ چاک کرنے کے ارادے سے پوپ کو پیشکش کی کہ وہ اس سے دوزخ خریدنا چاہتا ہے۔ پوپ نے ایک خاص رقم کے عوض اس کے ساتھ دوزخ کا سودا کر دیا اور اس کا پروانہ لکھ کر اسے دے دیا۔ یہودی نے یہ پروانہ اپنے قبضے میں لینے کے بعد اعلان کر دیا کہ اب دوزخ اس کی ملکیت ہے،وہ اس پر قفل لگا دے گا اور کسی شخص کو اس میں نہیں جانے دے گا اس لئے اب لوگ جو چاہیں کریں انہیں کسی سزا کا کوئی خطرہ نہیں۔ پوپ کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ سخت پریشان ہوا۔اسے اپنی فاش غلطی کا احساس ہوا کہ اس نے تو تاریخ میں ہمیشہ کے لئے عیسائیت کا جنازہ نکال دیا ہے۔اس نے یہودی کے پیچھے آدمی بھیجا کہ جتنی رقم تم نے بھیجی ہے اس سے کئی گنا زیادہ رقم ہم سے لے لو اور یہ پروانہ واپس کر دو۔ہم سودا منسوخ کرتے ہیں۔ یہودی نے کافی لیت و لعل کے بعد یہ پیش کش قبول کر لی۔ چنانچہ کئی گنا رقم لے کر اس نے پروانہ واپس کر دیا۔اگر وہ یہودی پروانہ واپس نہ کرتا اور تاریخی ریکارڈ میں وہ محفوظ رہ جاتا تو آج تاریخ کا رنگ کچھ اور ہوتا۔اور عیسائیت کا نام صرف قرون ماضیہ کی ایک یاد کے طور پر باقی ہوتا۔

اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ وہ پوپ کو تو معصوم سمجھتے ہیں اور ان

کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کے گناہ بخشنے کا اختیار بھی رکھتا ہے لیکن اللہ کے نبیوں کو وہ چور سمجھتے ہیں...... کاش موتی اپنے آپ کو ہضم کر لیتی۔

(مسیحیت اور سامراج کے اسلام دشمن عزائم ص ۱۱۲)

ذرا اس پادری کی حالت کا تصور کیجئے جس کا مذہب اس پر ظلم کرتے ہوئے غیر فطری طور پر اس کے لئے لازم ٹھہراتا ہے کہ وہ قانوناً شادی نہیں کر سکتا پھر ایسے فتنوں میں مبتلا کرتا ہے اور ایک زانیہ کے لئے وہ ضروری قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کی مغفرت کے لئے اس غیر شادی شدہ پادری کے پاس اپنے اس جرم کا اعتراف کرے۔ اس اعتراف کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ عورت اس پادری کو خلوت میں تفصیل سے بتائے کہ فلاں شخص پر وہ فریفتہ ہوئی۔ فلاں کے ساتھ اس نے عشق کیا۔ عشق کے ان مراحل میں اسے یہ اور یہ واقعات پیش آئے۔ اتنی مرتبہ اس نے اپنا جسم شیطان کے حوالے کیا اور اتنی مرتبہ اس نے معمولی معاوضے پر اپنی عصمت دری کرائی۔

میں کہتا ہوں کہ ذرا تصور تو کیجئے کہ پادری کی اس وقت کی کیفیت کیا ہوتی ہوگی۔ جب وہ یہ سب کچھ اتنی تفصیلات کے ساتھ سنتا ہوگا۔ اس وقت تو کوئی بھی انسان اللہ کی مدد اور خاص توفیق کے بغیر اپنے فطری جذبات پر قابو نہیں پا سکتا۔ اس وقت پردے کے پیچھے کیا ہوتا ہے میں اس کی تفصیل میں نہیں جا سکتا کیونکہ اس میں حیا مانع ہے۔ اس زانیہ کو اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ اپنی وارداتوں میں پادری صاحب کے ساتھ ایک واردات کا اضافہ کر لے جب کہ بخشش کا پروانہ اس کے لئے اور اس ایسی ہزاروں دوسری فاحشہ عورتوں کے لئے کافی ہے۔

اسی طرح چوروں، ڈاکوؤں، دھوکہ بازوں، رشوت خوروں اور دوسرے حرام کمانے والوں کو اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ اپنی حرام کمائی کے ایک نہایت قلیل حصے کے عوض بخشش کا پروانہ حاصل کر لیں جو ان کے لئے بلا حساب جنت میں داخلے اور رہائش کے پاسپورٹ اور ویزے کی حیثیت رکھتا ہے۔ (ایضاً)

بخشش کے پروانوں کا اگر ہم مطالعہ کریں تو ان حقائق کا انکشافات ہوتا ہے کہ

عیسائی معاشرے میں روحانی افلاس، فکری اضطراب اور اخلاقی فساد کا دور دورہ ہے۔ عیسائیوں کے ہاں الفاظ کے مفہوم اور قدروں کے پیمانے بدل چکے ہیں اور وہ ذہنی و فکری انتشار اور اخلاقی انحطاط کی اتھاہ گہرائیوں میں گر چکے ہیں۔

پروانۂ مغفرت کی عبارت یہ ہے:

''اے فلاں! ہمارا رب یسوع مسیح تم پر رحم کرے اور اپنی رحمت کاملہ سے تجھے طہارت عطا فرمائے۔ مجھے جو پیغمبرانہ اختیارات تفویض کئے گئے ہیں، ان کے ذریعے میں تجھے تمام احکام، ہر قسم کے قصاص اور کلیسا کے سارے واجبات سے سبکدوش کرتا ہوں۔ تو نے جو بھی زیادتیاں کیں، تجھ سے جو بھی لغزشیں سرزد ہوئیں، تو نے جن جن گناہوں کا ارتکاب کیا، وہ گناہ کتنے ہی بڑے اور بھیانک کیوں نہ ہوں، میں نے وہ سب معاف کر دیئے۔ تو نے ہمارے مقدس بابا یا منصب رسالت کے بارے میں بھی کوئی زیادتی کی ہو اُسے بھی میں معاف کرتا ہوں۔ میں تیرے تمام گناہوں کی غلاظتوں کو صاف کرتا ہوں۔ اس وقت ملامت کی جتنی بھی علامتیں تو اپنے اندر پاتا ہے، میں ان سب سے تجھے پاک کرتا ہوں، میں تمام قصاص، جو تم پر واجب ہیں، منسوخ کرتا ہوں۔ میں پاک لوگوں کے زمرے میں تجھے شامل کرتا ہوں اور طہارت اور نیکی کی وہ کیفیت پیدا کرتا ہوں جو بپتسمہ کے وقت تیرے اندر تھی۔ موت کے وقت تیرے سامنے وہ دروازہ بند کر دیا جائے گا جس سے خطاکار عذاب وعقاب کی جگہ داخل ہوتے ہیں اور جنت کا دروازہ تیرے سامنے کھول دیا جائے گا۔ اگر تو لمبی مدت تک نہ مرا، تو بھی یہ نعمت اسی طرح باقی رہے گی۔ یہاں تک کہ باپ، بیٹے اور روح القدس کے نام پر تیری آخری گھڑی آ جائے۔''

اس پروانے کو پڑھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اسے جاری کرنے کی جرأت وہی کر سکتا ہے جسے خدا ہونے کا دعویٰ ہو۔ کیونکہ جو شخص یہ سمجھتا اور کہتا ہو کہ وہ لوگوں کی قسمتوں کے فیصلے کرنے اور اپنی مرضی سے جنت اور دوزخ کے دروازے کسی کے لئے کھولنے اور کسی کے لئے بند کرنے کے اختیارات رکھتا ہے، وہ درحقیقت اپنی الوہیت اور اللہ کے اقتدار میں شریک ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ (ایضاً)

بیک وقت ہنسانے اور رُلانے والے والی بات یہ ہے کہ کوئی بھی شخص قتل' خونریزی اور بدکاری جیسے جرائم کے ارتکاب کے بعد بھی چند سکوں کے عوض مغفرت کا پروانہ حاصل کرسکتا ہے اور یہ پروانے لکھنے اور بیچنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں اپنے ہاتھ کی محنت سے کما کر کھانا پڑے تو وہ روکھی سوکھی روٹی سے اپنا پیٹ نہ بھر سکیں۔

جس شخص کے پاس پروانہ خریدنے کے لئے دولت نہ ہو' وہ دوزخ میں داخل ہونے کے لئے تیار ہوجائے کیونکہ اس الٹی منطق کے مطابق جنت سرمایہ داروں اور بورژواؤں کے لئے مختص ہوگی اور مزدوروں میں سے کوئی اس میں قدم بھی نہیں رکھ سکے گا' اب کارل مارکس اور اس کے پیرو اپنے سر دیوار سے ٹکرائیں۔

گھر کے بھیدی کی گواہی

سینٹ جروم عیسائیت کے مراکز میں فساد کے سرچشموں کی نقاب کشائی کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

''اہل کلیسا کے تعیش کے سامنے امراء اور دولت مندوں کی عیش وعشرت بھی شرماتی ہے۔ خود پوپ اخلاقی انحطاط میں مبتلا تھے اور دولت کی ہوس اور مال کا عشق تو ان پر اتنا غالب تھا کہ منصب اور عہدے معمولی سامان تجارت کی طرح بکتے تھے اور کبھی کبھی ان کا نیلام ہوتا تھا' جنت کے قبالے جائداد کی معمولی دستاویزوں کی طرح' مغفرت کے پروانے' نقض قانون کے اجازت نامے اور نجات کے سرٹیفکیٹ بے تکلف بکتے تھے۔ مذہبی عہدہ دار سخت راشی اور سود خور تھے' فضول خرچی اور اسراف کا یہ حال تھا کہ پاپائے انوسینٹ ہشتم نے پاپائی کا تاج رہن رکھا اور پاپائے یہودنہم کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے تین پاپاؤں کی آمدنی اڑاڈالی۔ یعنی سابق پوپ نے جو دولت چھوڑی تھی' پہلے وہ خرچ کی' اس کے بعد اپنی دولت اور پھر اپنے جانشین کی آمدنی پہلے سے وصول کر کے صرف کرڈالی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مملکت فرانس کی پوری آمدنی بھی ان پاپاؤں کے اخراجات کے لئے کافی نہ ہوتی تھی۔''

(معرکۂ مذہب وسائنس بحوالہ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر ص ۲۵۹)

پادری عام لوگوں پر ٹیکس عائد کیا کرتے تھے۔ پھر امیروں اور غریبوں سے اس کی وصولی کے لئے نہایت ہی بھونڈے اور تکلیف دہ طریقے اختیار کرتے تھے۔ وہ یہ ٹیکس ان طوائفوں سے وصول کرنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے جو اپنی عزت وعصمت بیچ کر روٹی کماتی تھیں، بلکہ وہ ان بیسواؤں کو بخشش کے پروانے جاری کر کے عصمت فروشی کے لئے ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور جو طوائفیں عصمت فروشی کو پیشے کی حیثیت سے اختیار کرنا چاہتی تھیں ان کے لئے وہ اس سلسلے میں آسانیاں پیدا کرتے تھے۔

صرف ایک پوپ کے زمانے میں اکیلے روما شہر میں جن عورتوں نے اس مقصد کے لئے اجازت نامے حاصل کئے ان کی تعداد سولہ ہزار (۱۶۰۰۰) تھی۔

(اضواء علی المسیحیۃ بحوالہ مسیحیت اور سامراج ص ۱۲۰)
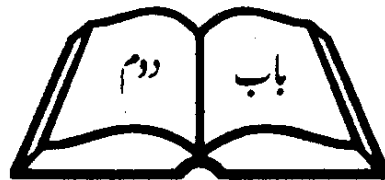
شاہوں اور گداؤں کی حکایات

شاہوں اور گداؤں کی حکایات

امام ابن سیرینؒ اور خوابوں کی تعبیرات

حضرت انس بن مالکؓ (خادم النبی صلی اللہ علیہ وسلم) کے ایک آزاد کردہ غلام جنہیں دنیاءِ علم وفن علامہ ابن سیرینؒ کے نام سے جانتی ہے، امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ میں سب سے بڑے معتبر مانے جاتے ہیں،

آپ کے زہد وتقویٰ کا یہ عالم تھا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت وصیت فرمائی کہ ابن سیرین ہی آکر مجھے غسل دیں وہی کفن پہنائیں اور وہی میری نماز جنازہ پڑھائیں۔ چنانچہ حضرت انسؓ کا انتقال ہوا تو ابن سیرین قید خانہ میں بند تھے۔لوگوں نے حاکم وقت سے اجازت لے کر آپ کو قید خانہ سے نکالا۔آپ نے وصیت کے مطابق تجہیز وتکفین کردی اور فارغ ہوکر پھر قید خانہ میں چلے گئے گھر نہیں گئے۔

آپؒ مشہور تابعین میں سے ہیں۔آپ کی تعبیرِ خواب کے چند واقعات ملاحظہ ہوں:

بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے کہ ابن سیرین کے پاس ایک شخص آیا اور بیان کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک کبوتر نے ایک موتی نگل لیا اور پھر وہ موتی اس کے پیٹ سے جیسا وہ موتی تھا ویسا نکلا یعنی گھٹا یا بڑھا نہیں۔ پھر ایک تیسرا کبوتر آیا اور اس نے بھی ایک موتی نگل لیا مگر اس کے پیٹ میں وہ موتی چھوٹا ہو کر نکلا۔امام ابن سیرین نے خواب سن کر اس کی تعبیر یہ

دی کہ وہ موتی جو پیٹ سے بڑا ہو کر نکلا اس سے مراد امام حسن بصریؒ ہیں۔ حسن بصریؒ حدیث سنیں گے اور اپنی زبان سے اس میں جدت پیدا کریں گے اور اپنے مواعظ کے ذریعے اس میں تسلسل پیدا کردیں گے۔ یعنی کسی بات کو سن کر اسے اپنی منطق سے عمدہ بنالیتے ہیں اور پھر اس میں اپنی نصائح میں شامل کرلیتے ہیں اور دوسرا موتی جوں کا توں نکلا اس سے مراد قتادہ ہیں جو حدیث کے بہترین حافظ ہیں اور عظیم حافظہ کے مالک ہیں۔ اور تیسرا موتی جو چھوٹا ہو کر نکلا اس سے مراد خود ابن سیرین ہیں کیونکہ وہ حدیث کو سنتا ہے مگر اس کو مختصر کردیتا ہے یعنی جو بات سنتے ہیں اس کو کم کر کے بیان کر دیتے ہیں۔

ابن خلکان نے محمد ابن سیرینؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک شخص آپ کے پاس خواب کی تعبیر پوچھنے آیا اور بیان کیا کہ میں نے خواب میں پڑوسی کی کبوتری پکڑی اور اس کے بازو توڑ دیئے۔ یہ سن کر ابن سیرین کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور فرمایا کہ آگے بیان کر! پھر اس شخص نے کہا کہ اس کے بعد ایک سیاہ کوا آیا اور میرے مکان کی پشت پر بیٹھ گیا اور پھر اس کوے نے مکان میں نقب لگائی اور اس میں گھس گیا۔ علامہ ابن سیرینؒ نے پورا جواب سن کر فرمایا کہ کس قدر جلد تیرے رب نے تجھ کو تنبیہ فرمادی۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ تو اپنے پڑوسی کی بیوی کے پاس ناجائز طور پر آتا جاتا ہے اور وہ کالا کوا ایک حبشی غلام ہے جو تیری بیوی کے ساتھ ناجائز تعلق رکھتا ہے۔

......☆......

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص محمد بن سیرینؒ کے پاس آیا اور بیان کیا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ ایک مرغ نے گھر میں داخل ہو کر جَو کے دانے چگ لئے۔ ابن سیرینؒ نے جواب دیا کہ اگر تمہارے گھر سے کوئی چیز غائب ہو جائے تو مجھے اطلاع کرنا۔ کچھ دن کے بعد اس شخص نے آ کر عرض کیا کہ میرے گھر کی چھت پر سے ایک چٹائی چوری ہو گئی۔ ابن سیرینؒ نے کہا کہ وہ موذن نے چوری کی ہے۔ چنانچہ جب تحقیق کی گئی تو یہی واقعہ نکلا۔

ایک شخص نے ابن سیرینؒ سے آ کر عرض کیا کہ میں نے خواب میں مرغ کو اللہ اللہ کہتے ہوئے دیکھا ہے۔ ابن سیرینؒ نے جواب دیا کہ تیری زندگی کے صرف تین دن باقی رہ گئے ہیں چنانچہ تین روز کے بعد وہ شخص مر گیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا تقویٰ

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی زوجہ محترمہ کو ان کے والد خلیفہ عبدالملک بن مروان نے ایک بیش قیمت گوہر دیا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز جب امیر المومنین ہوئے تو انہوں نے فرمایا۔ اپنا تمام زیور بیت المال میں داخل کر دو ورنہ میں تم سے الگ ہو جاؤں گا۔ کیونکہ مجھے گوارا نہیں کہ تم اور تمہارے زیور (جو رعایا کے روپے سے بنے ہیں) اور میں ایک گھر میں رہ سکیں وہ بھی نیک بخت بیوی تھی اس نے سارا زیور بیت المال میں داخل کر دیا۔

عمر بن عبدالعزیز کے بعد جب یزید بن عبدالملک بادشاہ ہوا تو اس نے اپنی بہن یعنی آپ کی زوجہ محترمہ سے کہا۔ آپ چاہیں تو اپنا زیور واپس لے سکتی ہیں۔ انہوں نے فرمایا۔ جو چیز اپنی خوشی سے میں ان کی حیات میں داخل خزانہ کر چکی ہوں اب میں ان کے بعد واپس لے کر کیا کروں

عمر بن عبدالعزیز کے صاحبزادے کہتے ہیں کہ مجھ سے ابو جعفر منصور (خلیفہ دوم عباسیہ) نے پوچھا تمہارے والد کی کیا آمدنی تھی۔ کہا کل چار سو دینار۔ یہ آمدنی رفتہ رفتہ کم ہو رہی تھی۔ اگر وہ اور زندہ رہتے تو اور بھی کم ہو جاتی۔

عمر بن مہاجر (جن کو آپ نے کوتوال شہر مقرر کیا تھا) کہتے ہیں آپ کی تنخواہ دو درہم روزانہ مقرر تھی۔ آپ کا چراغ دان تین لکڑیوں کو کھڑا کر کے اس پر مٹی رکھ کر بنایا جاتا تھا۔ جب اراکین سلطنت آپ کے پاس رات کو جمع ہوتے اور معاملات سلطنت میں گفتگو کرتے تو آپ بیت المال کا چراغ جلائے رکھتے جب دربار برخاست ہو جاتا تو اس کو گل کر کے اپنا چراغ جلا لیتے۔

جب آپ خلیفہ ہوئے تو آپ نے گھر کے اخراجات کم کر دیئے گھر سے شکایت ہوئی۔ آپ نے فرمایا میری تنخواہ میں اس قدر وسعت نہیں ہے۔ کہ تمہارا سابق خرچ جاری رکھوں۔ باقی رہا بیت المال اس میں تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا اور مسلمانوں کا۔

ایک دن بنو مروان یعنی شاہی خاندان کے لوگ آپ کے رشتہ برادری والے آپ کے مکان پر آئے آپ کے بیٹے سے ملے اور کہا خلیفہ سے جا کر کہو کہ آپ سے پہلے جس قدر خلفا ہوئے ہیں سب ہمارے لئے عطایات اور جاگیریں مخصوص کرتے رہے ہیں۔ آپ نے ہم پر تمام چیزیں

حرام کردیں کیا بوجہ قربت بھی ہمیں کچھ حق نہیں پہنچتا۔آپ نے جواب دیا۔ جاگیریں اس لئے بند ہیں اور عطایا اس لئے موقوف ہیں کہ بیت المال میں غریبوں اور امیروں سب کا روپیہ جمع ہے تمہیں جاگیریں دے دوں اور روپیہ تمہارے عیش وعشرت کے لیے وظیفوں کی صورت میں بانٹ دوں تو یتیموں' بیواؤں' مسکینوں اور حق داروں کو کیا دوں اور خدا کی نافرمانی کر کے قیامت کے عذاب سے کس طرح نجات حاصل کروں۔ باقی رہا حق قرابت۔ تو میرے نزدیک اس معاملے میں تم اور ایک ادنیٰ مسلمان (جس کو تم ادنیٰ سمجھتے ہو) برابر ہو۔

سلیمان بن عبدالملک بن مروان کے دو نمایاں کام

امام محمد بن سیرین کہتے ہیں کہ سلیمان بن عبدالملک کی خوبی یہ ہے کہ اس نے دو نمایاں کام کئے اوّل یہ کہ خلافت پر ممکن ہوتے ہی نماز اوّل وقت میں پڑھنے کی زندہ مثال قائم کی۔ دوسرے یہ کہ اپنی خلافت کے خاتمہ پر اپنا بہترین خلیفہ اور جانشین بنایا اور وہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز ہیں۔

مفضل وغیرہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ سلیمان جمعہ کے دن غسل کر کے حمام سے باہر آیا۔ سبز جوڑا پہنا' سبز ہی عمامہ باندھا' سبز فرش پر بیٹھا اور اردگرد سبز رنگ کی چیزیں رکھ دی گئیں۔ پھر اس نے اپنی صورت آئینہ میں دیکھی تو وہ اس وقت خوب جچ رہا تھا۔ نشاط میں آکر کہنے لگا کہ ہمارے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول تھے۔ ان کے جانشین خلیفہ اوّل ابوبکر صدیق اکبرؓ نرم دل تھے۔ خلیفہ ثانی عمرؓ حق و باطل میں فرق کرنے والے تھے۔ عثمان ذی النورین شرم وحیا کے پیکر تھے۔ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ دلیر و بہادر اور امیر معاویہؓ بردبار' یزید صبر وتحمل کے عادی تھے' عبدالملک مدبر سیاست دان تھے اور ولید بن عبدالملک جابر و ظالم تھا اور میں ایک نوجوان بادشاہ ہوں۔ یہ کہہ کر جمعہ کی نماز کے لئے چل پڑا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ گھر کے صحن میں ایک باندی یہ اشعار گنگنا رہی ہے۔

انت نعم المتاع لو کنت تبقی غیر ان لا بقاء للانسان

آپ بہترین سامان ہیں کاش ہمیشہ رہتے۔ لیکن انسان کے لئے بقاء اور دوام نہیں ہے۔

لیس فیما بد النامک عیب عابه الناس غیر انک فان

جو بھی آپ نے ہمارے لئے کیا اس میں کوئی عیب نہیں۔ لوگوں نے آپ میں سوائے

فنا ہونے کے اور کوئی عیب نکالا"۔

جب سلیمان نماز جمعہ سے فارغ ہو گئے تو گھر آئے آپ نے باندی سے پوچھا کہ جس وقت میں نماز کے لئے جا رہا تھا تو کیا پڑھ رہی تھی کیا گا رہی تھی تو اس نے کہا میں تو کچھ بھی نہیں گا رہی تھی، سلیمان نے کہا تو عنقریب میری ملکیت سے نکل جائے گی، اس نے کہا کیسے نکل سکتی ہوں تو سلیمان نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون' تو نے مجھے موت کی اطلاع دے دی ہے۔ پھر اس کے بعد جمعہ بھی نہیں گزرا تھا کہ سلیمان کی وفات ہو گئی۔ (حیات الحیوان، علامہ کمال الدین دمیریؒ)

مامون الرشید کی پیدائش کا عجیب واقعہ

عیون التاریخ میں لکھا ہے کہ ایک دن خلیفہ مامون الرشید، ملکہ زبیدہ ام امین کے پاس سے گزر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ زبیدہ ہونٹوں کو خاموشی سے حرکت دے رہی تھی۔ کہنے لگا اے ماں! کیا آپ میرے لئے بددعا کر رہی ہیں محض اس لئے کہ میں نے تمہارے بیٹے کو قتل کر کے اس کی سلطنت چھین لی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ نہیں اے امیر المومنین! ایسا نہیں کر رہی۔ مامون نے کہا اچھا پھر آپ کیا کہہ رہی تھیں؟ ماں نے کہا امیر المومنین جان بخشی فرمایئے' ضرورت محسوس ہوئی ہونٹ حرکت کرنے لگے ورنہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ مامون نے کہا نہیں آپ ضرور کچھ نہ کچھ کہہ رہی تھیں۔ زبیدہ نے کہا میں یہ کہہ رہی تھی کہ مجبور کن حالات کا برا ہو۔ مامون نے کہا وہ کیسے؟ تو زبیدہ نے کہا کہ ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں ہارون رشید کے ساتھ برضا ورغبت شطرنج کھیل رہی تھی تو وہ مجھ سے جیت گئے۔ میں ہار گئی۔ انہوں نے مجھے یہ حکم دیا کہ ننگے ہو کر محل کا چکر لگا کر آؤں، میں نے ان سے معافی چاہی۔ لیکن انہوں نے مجبور کیا۔ چنانچہ میں نے محل کا برہنہ طواف کیا۔ حالانکہ طبیعت نفرت کر رہی تھی۔ پھر ہم دوبارہ کھیلنے لگے تو اس مرتبہ میں جیت گئی وہ ہار گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ مطبخ جا کر سب سے بدصورت باندی سے جماع کریں۔ انہوں نے مجھ سے معاف کرنے کو کہا۔ میں نے بھی معاف نہیں کیا۔

انہوں نے جماع نہ کرنے کے عوض مجھے عراق ومصر کا خراج بھی دینے کی پیشکش کی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ پھر میں نے انہیں اتنا مجبور کیا کہ ہاتھ پکڑ کر مطبخ لے گئی۔ چنانچہ تیری ماں مراجل سے زیادہ کوئی بھی بدصورت باندی میں نے نہیں دیکھی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ اس

سے جماع کریں تو انہوں نے اس سے صحبت کی۔ چنانچہ تم اس طرح پیدا ہوئے۔ اور اب میرے بیٹے امین کے قتل اور اس سے ملک چھیننے کا سبب بن گئے۔ (ایضاً)

قاہر باللہ سے اللہ ''قہار'' کا انتقام

مقتدر باللہ کے بعد ان کے بھائی ابو منصور محمد بن معتضد باللہ تخت نشین ہوئے۔ جب انہیں خلیفہ بنایا گیا تو انہوں نے اپنے بھتیجے مکتفی باللہ کو ایک ایسے گھر میں بند کر دیا جسے اینٹوں اور گچ سے بند کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ مکتفی اسی حالت میں انتقال کر گیا۔ قاہر نے مقتدر کی ماں سیدہ کو بھی گرفتار کرا لیا اور ان سے اتنے زیادہ فدیہ کا مطالبہ کیا جو ان کی طاقت وسکت سے زیادہ تھا۔ ان کو ڈرایا دھمکایا، مارا، اذیتیں دیں، طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا کیا یہاں تک کہ سیدہ کو الٹا لٹکایا کہ پیشاب بہہ کر منہ میں آتا تھا اور سیدہ یہ کہتی تھیں کہ کیا میں اللہ کی کتاب کی رو سے تمہاری ماں نہیں ہوں؟ کیا میں نے پہلی مرتبہ اس سے قبل اپنے بیٹے سے تجھے نجات نہیں دلوائی؟ اس کے باوجود تم مجھے سزائیں دے رہے ہو۔ فدیہ اس وقت مانگ رہے ہو جب کہ میرے پاس مال ودولت ختم ہو گیا ہے...... چنانچہ تھوڑے دنوں کے بعد سیدہ کا انتقال ہو گیا۔ اب خدا کی کرنی دیکھئے کہ کچھ دنوں کے بعد قاہر باللہ کے فوجیوں نے بغاوت کر دی اور فساد برپا کر کے محل پر حملہ کر دیا۔ آخر کار قاہر غسل خانہ کی چھت پر بھاگ کر کسی جگہ چھپ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد فوجیوں نے آکر قید کر لیا۔ خلافت سے معزول کر کے آنکھیں نکال لیں۔ غالباً یہ حادثہ ماہ جمادی الثانیہ ۳۲۲ھ میں پیش آیا۔

ایک صاحب بیان کرتے ہیں کہ میں بغداد کی جامع مسجد منصور میں نماز پڑھ رہا تھا کہ اچانک میں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ اس کا چہرہ مسخ ہے جسم پر زرد رنگ کا جبہ اور روئی کا گدا ہے۔ اور وہ آدمی صدا لگا رہا ہے کہ لوگو! تم میری صدقات وغیرہ سے مدد کرو۔ کل میں امیر المومنین تھا اور آج میں مسلمانوں میں سب سے زیادہ فقیر ہو گیا ہوں۔ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ بھائی ان کے بارے میں کیا معلومات ہیں تو مجھے یہ بتایا گیا کہ یہ قاہر باللہ ہے۔

قاہر باللہ کی خلافت ۶ سال ۶ ماہ ایک ہفتہ رہی۔ قاہر زبردست بے ہودہ، خوں ریز، شہ باز خلیفہ تھا۔ اس کے پاس ایک نیزہ تھا جب تک یہ اس کے ذریعہ سے کسی کو قتل نہیں کر دیتا تھا اسے نہیں رکھتا تھا اگر سلیم الطبع دربان موجود نہ ہوتے تو یہ لوگوں کو تباہ کر دیتا۔ (حیات الحیوان)

حضرت فروخؒ کا ایمان افروز واقعہ

حضرت فروخؒ تابعین میں سے ہیں، مسجد میں ترغیب ہوئی کہ کون ترکستان کیلئے تیار ہے؟ انہوں نے اپنا نام پیش کیا۔ گھر میں آئے، کہنے لگے بیگم! میں نے ترکستان کیلئے اللہ کے راستے میں نام دے دیا ہے، ان کی بیوی حاملہ تھیں، کہنے لگی میرا کیا بنے گا؟ میں تو حاملہ ہوں؟ کہا تو اور جو کچھ تیرے اندر ہے اللہ کے حوالے۔ کہنے لگی، اچھا ٹھیک ہے جاؤ، میرا اللہ وارث ہے، میرا تم سے کوئی مطالبہ نہیں، ساٹھ ہزار درہم دیئے اور اللہ کے راستے میں نکل گئے، ان کی بیوی نے خود تیار کروایا' گھوڑے پر زین رکھی اور روانہ کیا۔

انتظار کی گھڑیاں شروع ہو گئیں ..... کیا گھنٹے ..... کیا گھڑیاں ..... کیا دن ..... کیا ہفتے ..... کیا مہینے ..... کیا سال پہ سال ..... دن پہ دن ..... ہفتوں پہ ہفتے ..... مہینوں پہ مہینے ..... سال پہ سال، سورج چڑھ چڑھ کے ڈوبتا پر فروخؒ کی کوئی خبر نہیں، کتنی بہاریں آئیں، کتنی خزائیں آئیں، بہار خزاں سے، خزاں بہار سے بدلی، گرمی سردی سے سردی گرمی سے بدلی، پر فروخؒ آیا نہ خبر ملی، کبھی پتہ چلے شہید ہوا، کبھی پتہ چلے قید ہوا، کبھی پتہ چلے زندہ ہے، کوئی موت کی پکی خبر ہوتی تو آگے دوسری شادی کرتیں، اسی ادھیڑ بن میں چلتے چلتے اس کی جوانی کی بہار ہی خزاں میں بدل گئی اور سر میں سفید چاندی آ گئی اور وہ رات کی سیاہی گئی اور بڑھاپے نے آ کے ڈیرے جمائے، ساری جوانی دیواروں کے ساتھ گزار دی اور سارا دکھ اپنے سینے پہ جھیلا، اپنے اوپر جھیلا، بچے کو پڑھایا، پروان چڑھایا، اسے عالم بنایا، تیس برس گزر گئے ..... تین چلے نہیں ..... ایک سال نہیں ..... سات مہینے نہیں ..... چلہ نہیں ..... چار مہینے نہیں ..... تیس سال گزر گئے اور نہ وہ آیا نہ اس کی خبر' اور اس کی جوانی بڑھاپے میں بدل گئی اور

مدت سے لگ رہی تھی لب بام ٹکٹکی
تھک تھک کے گر گئی نظر انتظار آج

ان کی نگاہیں تھک تھک کے، آخر گر گئیں، لوٹ گئیں، تیس برس گزرے۔

آج ایک اندھیری رات ہے، ایک بڑے میاں گھوڑے پہ سوار خاموش چال کے ساتھ، مدینے میں داخل ہوئے، ایک نسل ختم ہو چکی ہے، کوئی پتہ نہیں یہ کون بڑے میاں آ گئے؟ یہ کون

بوڑھا آ گیا، یہ وہ بوڑھا ہے جو یہاں سے تیس برس پہلے خوبصورت جوان بن کے نکلا تھا، یہ وہ جوان ہے جو اپنی جوانی کو اسلام پہ بوڑھا کر کے آیا، اپنی ہڈیوں کا گودا سارا ختم کر کے آیا، اپنی جوانی کی بہار کو اللہ کے نام پہ لٹا کے آیا اور یہ تھکن سے چور، بدحال، پریشان، پتہ نہیں میری بیوی، زندہ کی خبر ملے گی یا مردہ کی خبر ملے گی، بچہ ہوا، بیٹی ہوئی، گھر اسی جگہ موجود ہے، ساتھی زندہ موجود، انہی خیالات میں حیران ہیں، پریشان ہیں، دروازے پر پہنچے، اندر داخل ہوئے، کہنے لگے میرا ہی گھر لگتا ہے، اندر داخل ہوئے گھوڑے کی آواز، اترنے کی آواز، ہتھیاروں کی آواز، ان کے بیٹے سو رہے برآمدے میں، آنکھ کھلی دیکھا ایک بڑے میاں، چاند کی چاندنی اور ہتھیار سجے ہوئے آئے تو ان کو ایک دم غصہ آیا، اٹھے جھپٹے، گریبان سے پکڑا جھنجھوڑا، بڑے میاں تجھے شرم نہیں آتی، مسلمان کے گھر میں بغیر اجازت کے داخل ہوتے ہوئے؟ ایسا جھٹکا دیا، وہ تو پہلے ہی شک میں تھے کہ پتا نہیں میرا گھر ہے بھی سہی کہ نہیں؟ میری دنیا اجڑی ہے کہ آباد ہے؟ وہ گھبرا گئے، کہنے لگے بیٹا معاف کر دینا، مجھے نہیں پتا چلا میں سمجھا یہ میرا گھر ہے، تو وہ کہنے لگے اچھا ایک چوری ایک سینہ زوری، ایک بغیر اجازت کے آتے ہو، ایک اوپر سے کہتے ہو میرا گھر ہے۔ کس ظالم سے جھوٹ بولا، اس بڑھاپے میں شرم نہیں آتی، یہ جھوٹ بولتے ہوئے۔ اتحاکمک الی القاضی ...... چل میں ابھی تجھے قاضی کے پاس لے چلتا ہوں، اب یہ جان چھڑانے کو اور وہ پکڑنے کو، اور یہ دب رہے اور وہ چڑھ رہے۔ اسی چھینا جھپٹی میں ان کی ماں چوبارے پہ سوئی، اس کی آنکھ کھل گئی، اس نے یوں کھڑکی کو کھولا کہ یہ نیچے کیا ہو رہا ہے؟ خاوند کا چہرہ یوں سامنے تھا، یوں جو جھانکا تو تیس سال زمانہ پیچھے لوٹ آیا، ایک سیکنڈ میں اور سارے ماضی کے در، کھڑکیاں کھلتے کھلتے، سارے دریچے جو کھلے، تو تیس سال پرانا فروخ" گھوڑے پہ سوار الوداع ہوتا نظر آیا، تو اس کی چیخ نکلی، کہا ربیعہ کیا ہوا؟ کہا جانتے ہو کون ہے؟ کہا نہیں جانتا ہوں! کہا ارے ظالم یہی تو تیرا باپ ہے جس کے لئے تیری ماں کی جوانی دیواروں کے ساتھ گزر گئی۔

گر گئے قدموں میں، پاؤں چوم رہے، کیا ملاقات ہے باپ بیٹے کی؟ کیا منظر ہے؟ زمین آسمان دیکھ رہا، کس طرح اللہ کے لئے لوگ جدا ہوئے۔ کیا جدائی اور کیا ملاپ ہے؟ آہاہا...... جس زمین و آسمان نے اس امت کا یہ منظر دیکھا ہو، وہ زمین و آسمان آج دیکھ کے روئے گا نہیں تو

اور کیا کرے گا؟ باپ بیٹے میں معافیاں ہو رہی، کہانیاں ہو رہی، رات بیت گئی آنکھوں میں، فجر کی اذان میں پہنچے، بیٹے پہلے چلے گئے یہ بعد میں پہنچے۔

نماز ہو چکی، نماز پڑھی، حضور پاک ﷺ کے روضے پر درود و سلام پڑھا، یوں دیکھا تو مسجد بھری ہوئی تھی اور ایک نوجوان حدیث پڑھا رہے، نظر کمزور ہو چکی، نظر نہیں آ رہے، پیچھے بیٹھ گئے سنتے رہے، درس ختم ہوا ساتھ والے سے پوچھا، بیٹا یہ کون درس دے رہا ہے؟ اس نے کہا چچا آپ انہیں نہیں جانتے، آپ مدینے کے نہیں ہیں، کہا نہیں بیٹا مدینے کا ہوں، آیا بڑی دیر سے ہوں، کہا یہ تو ربیعہ ہیں مسلمانوں کے امام، وہ تیزی میں باپ کا نام نہیں جوڑ سکا، عرب تو باپ بیٹے کا نام ساتھ جوڑتے ہیں۔ کہا یہ ربیعہ ہیں مسلمانوں کے امام، کہا بیٹا! اس کا باپ کون ہے؟ کہا اس کے باپ کا نام فروخ ہے جو اللہ کے راستے میں کہیں نکل گیا تھا، پھر کبھی لوٹ کے نہیں آیا۔

میرے بھائیو! یہ کہانیاں پڑھو تو پھر آپ کو پتہ چلے کہ یہ امت کس کام کے لئے آئی اور کہاں چلی گئی؟ ہم کوئی نیا سبق نہیں دہرا رہے، پرانا سبق ہے، پرانی دھن ہے، پرانا سر ہے، پر کان نا آشنا ہو گئے، گانے بجانے میں ڈوب گئے تو یہ نغمہ کہاں سے سمجھ میں آئے گا؟ ہم اس کو یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کو پھیلانے کیلئے سیکھنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ تو بھئی اس کیلئے ارادے فرماؤ۔

اللھم صل علی محمد و علی الہ و اصحابہ و بارک وسلم

(مولانا طارق جمیل کی تقریر سے انتخاب)

☆

حضرت امام ابو حنیفہؒ کی دہریے سے گفتگو

ایک ملحد مادہ پرست خلیفہ ہارون رشید کے پاس آیا اور کہا:

اے امیر المؤمنین! تیرے عہد کے علماء مثلاً امام ابو حنیفہؒ نے اس پر اتفاق کیا کہ اس دنیا کا کوئی خالق ضرور ہے ان میں سے جو عالم و فاضل ہو اسے یہاں ضرور حاضر ہونے کا حکم دیا جائے تا کہ میں تیرے سامنے اس کے ساتھ بحث کروں کہ "دنیا کا کوئی بنانے والا نہیں۔"

ہارون الرشید نے امام ابوحنیفہؒ کے پاس پیغام بھیجا اور کہا:

''اے تمام مسلمانوں کے امام! آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں ایک مادہ پرست آیا ہوا ہے اور وہ دعویٰ کرتا ہے کہ دنیا کا صانع کوئی نہیں اور وہ آپ کو مناظرے کی دعوت دیتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ میں ظہر کے بعد جاؤں گا۔ وقت مقررہ پر خلیفہ نے امام صاحب کا استقبال کیا، آپ کو ساتھ لایا اور بلند مقام پر جگہ دی۔ امرا اور رؤسا دربار میں جمع ہوئے، ملحد نے کہا:

اے ابوحنیفہ! آپ نے آنے میں دیر کیوں کردی؟

امام صاحب نے کہا:

مجھے ایک عجیب بات درپیش آئی۔ اس لئے دیر ہوگئی۔ وہ یہ کہ میرا گھر دریائے دجلہ کے اس پار ہے۔ میں اپنے گھر سے نکلا اور دجلہ کے کنارے آیا تا کہ اسے عبور کردوں۔ میں نے دجلہ کے کنارے ایک پرانی اور شکستہ کشتی دیکھی، جس کے تختے بکھر چکے تھے، جونہی میری نگاہ اس پر پڑی تختوں میں اضطراب پیدا ہوا، پھر انہوں نے حرکت کی اور اکٹھے ہو گئے۔ ایک حصہ دوسرے کے ساتھ پیوست ہو گیا اور بغیر کسی بڑھئی کے سالم کشتی تیار ہوگئی، میں اس کشتی پر بیٹھا، پانی عبور کیا اور یہاں آ گیا۔

ملحد نے کہا:

اے رئیسو! جو کچھ تمہارا پیشوا اور امام اور تمہارے عہد کا افضل انسان کہہ رہا ہے اسے سنو! کیا تم نے اس سے زیادہ جھوٹی بات کبھی سنی ہے۔ یہ تو خالص جھوٹ ہے جو تمہارے فاضل ترین عالم سے ظاہر ہوا ہے۔

یہ سن کر امام ابوحنیفہ مخاطب ہوئے اور فرمایا:

تمہارا کیا خیال ہے میں غلط کہہ رہا ہوں؟

ملحد نے کہا، جی ہاں! کیا غلط نہیں تو یہ صحیح ہے کہ کشتی بغیر بنانے والے کے بن جائے۔ آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا۔

امام اعظم نے فرمایا:

سن اے کافر مطلق! اگر کسی کارندے اور بڑھئی کے بغیر کشتی حاصل نہیں کی جاسکتی تو یہ

کیسے ممکن ہے کہ اس قدر عظیم نظام دنیا بغیر کسی خالق کے وجود میں آ جائے اور بغیر کسی چلانے والے کے چل سکے۔ تو صانع کی نفی کا کیسے قائل ہو گیا۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

(ماخوذ از مخزن اخلاق)

☆

قیصر روم نے ایک دفعہ خلیفہ منصور کے پاس اپنا وزیر اس غرض سے بھیجا کہ وہاں کے علماء و فضلاء کو جمع کر کے ان سے تین سوالات دریافت کرے۔ اگر وہ ان کے مسکت اور تسلی بخش جواب دے دیں تو ٹھیک ورنہ خلیفہ کو کہنا کہ آئندہ خراج ادا کرنا ہوگا۔

خلیفہ منصور نے دربار لگایا اور علماء کو جمع کیا ان میں امام ابو حنیفہؒ بھی شامل تھے۔ رومی وزیر منبر پر بیٹھا اور اپنے سوال پیش کئے۔ مختلف اصحابِ علم نے جواب دیئے مگر بات قاطع نہ ہو سکی۔ آخر امام ابو حنیفہؒ نے جوابات دینے کی اجازت حاصل کی۔

امام ابو حنیفہؒ (رومی وزیر سے) تم اس وقت سائل کی حیثیت میں ہو اور میں مجیب (جواب دینے والا) پس منبر پر بیٹھنا سائل کا نہیں بلکہ مجیب کا منصب ہے۔

خلیفہ: ہاں یہ بات بہت درست ہے (اس پر رومی وزیر منبر سے اتر آیا اور امام ابو حنیفہؒ اس جگہ اطمینان سے بیٹھ گئے۔ اس ڈرامائی صورت واقعہ سے مجلس کا ماحول تبدیل ہو گیا۔)

امام ابو حنیفہؒ: (رومی وزیر سے) اب اپنے سوالات پیش کرو۔

رومی وزیر: میرا پہلا سوال یہ ہے کہ خدا سے پہلے کیا چیز تھی؟

امام ابو حنیفہؒ: تم ایک، دو، تین، چار، پانچ کی گنتی تو جانتے ہو۔ ذرا یہ بتاؤ کہ ایک سے پہلے کون سا عدد ہے؟

رومی وزیر: ایک سے پہلے کوئی عدد نہیں۔ یہی سب سے پہلے ہے۔

امام ابو حنیفہ: تو پھر جب محض حسابی عدد "ایک" کا حال یہ ہے کہ اس سے پہلے کسی عدد کا تصور نہیں کیا جا سکتا تو خدا جو حقیقت میں واحد (ایک) ہے اس سے پہلے کوئی چیز کیسے ہو سکتی ہے؟

رومی وزیر: میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ خدا کا منہ کس طرف ہے؟

امام ابوحنیفہ: پہلے یہ بتاؤ کہ چراغ کی روشنی کا منہ کس طرف ہے؟

رومی وزیر: چاروں طرف

امام ابوحنیفہ: اب سوچو کہ آگ جو عارضی نور ہے جب اس کے لئے کوئی خاص سمت معین نہیں کی جا سکتی کہ اس کا منہ فلاں طرف ہے تو پھر اس اصلی نور یعنی خدا کے لئے کوئی خاص رخ کیوں کر معین ہو سکتا ہے۔

رومی وزیر: میرا تیسرا سوال یہ ہے کہ خدا اس وقت کیا کر رہا ہے؟

امام ابوحنیفہؒ: اس وقت اس نے اپنے دوسرے کاموں کے ساتھ ایک کام یہ بھی انجام دیا ہے کہ اس نے تمہیں منبر سے اتار کر میرے سامنے کھڑا کر دیا ہے اور تمہاری جگہ مجھے منبر پر بٹھا دیا ہے۔

رومی وزیر ساکت ہو گیا اور اس کا سر جھک گیا۔ خلیفہ منصور اور مجمع علماء حضرت امام ابوحنیفہ کی حاضر جوابی اور نکتہ رسی پر حیران رہ گئے۔ (اسلامی انسائیکلو پیڈیا۔ منشی محبوب عالم)

امام ابو یوسفؒ کا دلچسپ واقعہ

حضرت امام ابو یوسفؒ کے والد ابراہیم ان کے بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے ان کی والدہ نے فکر معاش کی وجہ سے انہیں ایک دھوبی کے حوالے کر دیا' لیکن انہیں پڑھنے کا شوق تھا' یہ جا کر امام ابوحنیفہؒ کے درس میں بیٹھنے لگے۔ والدہ کو علم ہوا تو انہوں نے منع کیا' اور اس بناء پر کئی روز امام ابوحنیفہؒ کے درس میں نہ جا سکے۔ ذہین اور شوقین طالب علم کی طرف استاذ کی توجہ طبعی بات ہے۔ جب کئی دن کے بعد وہ درس میں پہنچے تو امام صاحبؒ نے غیر حاضری کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے درس کے بعد انہیں بلایا' ایک تھیلی حوالے کی جس میں سو درہم تھے۔ اور فرمایا کہ "اس سے کام چلاؤ' اور جب ختم ہو جائیں تو مجھے بتانا۔" حضرت امام ابو یوسفؒ خود فرماتے ہیں کہ اس کے بعد کبھی مجھے امام صاحب کو یہ بتانے کی نوبت نہیں آئی کہ تھیلی ختم ہو چکی ہے' ہمیشہ جب پیسے ختم ہو جاتے' امام صاحبؒ خود ہی مزید پیسے عطا فرما دیتے' جیسے انہیں ختم ہونے کا الہام ہو جاتا ہو۔

ان کی والدہ شاید یہ سمجھتی ہوں گی کہ یہ سلسلہ کب تک چل سکتا ہے؟ کوئی مستقل ذریعۂ معاش ہونا چاہئے۔ اس لئے ایک مرتبہ انہوں نے امام ابوحنیفہؒ سے کہا یہ یتیم بچہ ہے میں چاہتی ہوں کہ کوئی کام سیکھ کر کمانے کے لائق ہو جائے۔ اس لئے آپ اسے اپنے درس میں شریک ہونے سے روکئے۔ لیکن حضرت امام ابوحنیفہؒ نے جواب دیا کہ: ''یہ تو پستے کے گھی میں فالودہ کھانا سیکھ رہا ہے۔'' والدہ نے اسے مذاق سمجھا اور چلی گئیں۔

لیکن امام ابویوسفؒ خود فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اسی علم کی بدولت وہ قدر و منزلت عطا فرمائی کہ میں قضاۃ کے منصب تک پہنچا' اور اس دوران بکثرت خلیفۂ وقت ہارون رشید کے دستر خوان پر کھانا کھانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ ایک روز میں ہارون رشید کے پاس بیٹھا تھا کہ اس نے ایک پیالہ مجھے پیش کیا' اور بتایا کہ ''یہ بڑی خاص چیز ہے جو ہمارے لئے بھی کبھی کبھی بنتی ہے۔'' میں نے پوچھا ''امیر المومنین! یہ کیا ہے؟'' کہنے لگے کہ ''یہ پستے کے روغن میں بنا ہوا فالودہ ہے۔'' یہ سن کر مجھے حیرت کی وجہ سے ہنسی آ گئی۔ ہارون رشید نے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو میں نے اسے سارا قصہ سنایا' وہ بھی حیرت زدہ رہ گیا' اور کہنے لگا کہ

''اللہ تعالیٰ امام ابوحنیفہؒ پر رحم فرمائے' وہ اپنی عقل کی آنکھ سے وہ کچھ دیکھتے تھے جو چشم سر سے نظر نہیں آ سکتا۔''

(تاریخ بغداد للخطیب ص ۲۴۵' ج ۱۴)

امام شافعیؒ کا علمی سفر

امام شافعیؒ فرماتے ہیں جب میں مکہ سے روانہ ہوا تو میری عمر چودہ برس تھی' میرے جسم پر صرف دو یمنی چادریں تھیں۔ ''ذی طویٰ'' پہنچا تو ایک پڑاؤ دکھائی دیا' میں نے وہاں جا کر صاحب سلامت کی تو ایک ضعیف العمر شخص میری طرف بڑھا اور مجھے کھانے کی دعوت دی' میں نے بے تکلفی سے وہ دعوت قبول کر لی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اللہ تعالیٰ کا اور اس بوڑھے میزبان کا شکریہ ادا کیا۔

میری باتیں سن کر میزبان نے سوال کیا ''کیا تم مکی ہو؟''

میں نے اثبات میں جواب دیا

پھر اس نے پوچھا "کیا تم قریشی ہو؟"

میں نے جواب میں ہاں کہہ کر ان سے پوچھا "اچھا آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں "مکی" اور "قریشی" ہوں۔

انہوں نے جواب دیا کہ شہری ہونا تمہارے لباس سے ظاہر ہے اور قریشی ہونا تمہارے کھانے سے معلوم ہوا، جو شخص دوسروں کا کھانا بے تکلفی سے قبول کر لیتا ہے وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس کا کھانا دل کھول کر کھائیں اور یہ خصلت صرف قریش میں ہے۔

پھر میں نے پوچھا "آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

جواب ملا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر مدینہ میرا وطن ہے۔"

میں نے پوچھا "مدینے میں کتاب وسنت کا سب سے بڑا عالم ومفتی کون ہے؟"

اس بزرگ نے جواب دیا "قبیلہ بنی اصبح کا سردار مالک ابن انس (امام مالکؒ)۔"

میں نے عرض کیا "خدا جانتا ہے مجھے امام مالکؒ سے ملنے کا کتنا شوق ہے۔"

انہوں نے کہا "خوش ہو جاؤ۔ خدا نے تمہارا شوق پورا کر دیا، اس بھورے اونٹ کو دیکھو یہ ہمارا سب سے اچھا اونٹ ہے، تم اسی پر سوار ہو جاؤ۔"

قافلہ روانہ ہوا، دورانِ سفر میں نے قرآن پاک کے سولہ "ختم" کیے، آٹھویں دن عصر کے وقت ہمارا قافلہ مدینہ میں داخل ہوا، مسجد نبویؐ میں نماز پڑھی، پھر مزار مبارک کے قریب حاضر ہوا، درود وسلام بھیجا، امام مالک دکھائی دیئے، ایک چادر کی تہہ بند باندھے تھے، دوسری طرف چادر اوڑھے ہوئے تھے اور بلند آواز سے حدیث کی روایت کر رہے تھے، روایت یوں کرتے تھے:

"مجھ سے "نافع" نے "ابن عمر" کے واسطے سے اس قبر کے مکیں ﷺ سے روایت کیا"...... یہ کہہ کر اپنا ہاتھ پھیلا کر قبر کی طرف اشارہ کرتے۔

یہ انداز دیکھ کر میرے دل پر امام مالکؒ کی ہیبت چھا گئی اور درس میں جہاں جگہ ملی وہیں بیٹھ گیا، میں نے جلدی سے ایک تنکا اٹھا لیا، امام صاحب جب کوئی حدیث بیان کرتے میں تنکے کو لعاب دہن میں تر کر کے اپنی ہتھیلی پر لکھ لیتا، امام صاحب میری یہ حرکت دیکھ رہے تھے، مگر مجھے اس

کی خبر نہ تھی۔ آخر مجلس ختم ہوگئی' میں اپنی جگہ بیٹھا رہا' امام مالکؒ نے مجھے اشارے سے بلایا' میں قریب گیا تو کچھ دیر بڑے غور سے مجھے دیکھتے رہے پھر فرمایا' تم حرم کے رہنے والے ہو؟

میں نے عرض کیا جی ہاں۔

پوچھا ''مکی'' ہو؟

میں نے کہا ''جی ہاں۔''

فرمایا سب اوصاف پورے ہیں' مگر تم میں ایک بے ادبی بھی ہے' میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمات طیبہ سنا رہا تھا' اور تم تنکا لئے اپنے ہاتھ سے کھیل رہے تھے۔

میں نے عرض کیا'' کاغذ پاس نہیں تھا' اس لیے جو کچھ سنتا ہاتھ پر لکھتا جاتا تھا''

اس پر امام مالکؒ نے میرا ہاتھ کھینچ کر دیکھا اور فرمایا'' ہاتھ پر تو کچھ بھی لکھا ہوا نہیں ہے۔''

میں نے عرض کیا'' لعاب تو باقی نہیں رہتا' لیکن آپ نے جتنی حدیثیں سنائی تھیں مجھے سب یاد ہو چکی ہیں۔''

امام صاحبؒ کو تعجب ہوا' فرمایا'' سب نہیں ایک ہی سنا دو۔''

میں نے امام صاحبؒ کے انداز میں اور ہاتھ کے اشارے سے ایک نہیں پوری پچیس احادیث مبارکہ جو اس محفل میں بیان ہوئی تھیں' سنا دیں۔ سورج غروب ہو چکا تھا' امام مالکؒ نے نماز پڑھی' پھر میری طرف اشارہ کر کے اپنے خادم سے کہا'' آقا کو گھر لے جاؤ۔''

تھوڑی دیر کے بعد امام صاحبؒ بھی آ گئے' میرے ساتھ کھانا کھایا اور جب رات زیادہ ہوگئی تو فرمایا' اب تم آرام کرو۔ رات کے پچھلے پہر دروازے پر دستک ہوئی' میں نے اٹھ کر دیکھا تو امام صاحبؒ کو پانی کا لوٹا لئے موجود پایا' مجھے بڑی شرمندگی ہوئی' کہنے لگے' کچھ خیال نہ کرو' مہمان کی خدمت تو فرض ہے۔ نماز مسجد نبوی میں ادا کی۔ جب روشنی ہوئی تو آج بھی اسی جگہ جا بیٹھے جس جگہ کل بیٹھے تھے۔ اپنی کتاب ''مؤطا'' میرے ہاتھ میں دے دی' میں نے کتاب سنانی شروع کر دی' لوگ سن کر لکھنے لگ گئے۔ میں امام مالکؒ کے ہاں آٹھ مہینے رہا۔ پوری ''مؤطا'' مجھے یاد ہوگئی۔ مجھ میں اور امام صاحب میں اس قدر محبت اور بے تکلفی پیدا ہوگئی کہ کوئی ناواقف ہمیں دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مہمان کون ہے اور میزبان کون۔

عراق سے کچھ لوگ ''زیارت'' کے لیے اور ''مؤطا'' سننے کے لئے آئے۔ انہیں کی زبانی مجھے ''ابو یوسفؒ'' اور ''محمد بن حسنؒ'' (جو کہ امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد ہیں) کے متعلق پتہ چلا' چنانچہ مجھے عراق جانے کا شوق پیدا ہو گیا اور امام صاحب سے اذنِ سفر مانگا' انہوں نے میرے حصولِ علم کے شوق کی ہمت افزائی کی اور مجھے زادِ راہ دے کر فرمانے لگے' رات عبدالرحمان قاسم ہدیہ لائے اور منت کر کے سو دینار کی ایک تھیلی دے گئے' پچاس دینار میں نے اپنے اہل خانہ کے لئے رکھ لئے اور بقیہ پچاس دینار تمہارے لیے ہیں۔ پھر امام صاحبؒ نے چار دینار میں ایک اونٹ طے کر کے باقی رقم میرے حوالے کر دی اور خدا حافظ کہا۔

حاجیوں کے ایک قافلہ کے ساتھ ہم بیسویں دن کوفہ پہنچ گئے' وہاں کی مسجد میں عصر کے وقت محمد بن حسنؒ اور ابو یوسفؒ (امام محمدؒ و امام ابو یوسفؒ) سے ملاقات ہوئی' میری باتوں سے انہیں میرے صاحبِ علم ہونے کا گمان ہوا' مجھے پوچھا' امام مالکؒ کو تم نے دیکھا ہے؟

میں نے عرض کیا ''جی ہاں انہیں کے پاس سے آ رہا ہوں۔''

یہ سن کر پوچھا ''مؤطا'' بھی دیکھی ہے؟

میں نے کہا ''پوری حفظ کر چکا ہوں۔''

محمد بن حسنؒ متعجب ہوئے' اسی وقت لکھنے کا سامان منگوایا' اور ''فقہ'' کے مسائل لکھ کر نیچے جگہ خالی چھوڑ دی' میں نے ''مؤطا'' کے مطابق جواب لکھ دیئے' اس کے بعد امام صاحبؒ نے مجھے اپنے گھر بھجوایا' کچھ دیر کے بعد امام محمدؒ بھی آ گئے' میرے بوسیدہ کپڑے دیکھ کر ایک ہزار درہم کا قیمتی جوڑا مجھے پہنایا اور اپنے کتب خانہ سے امام ابوحنیفہؒ کی کتاب ''الاوسط'' نکال کر دی' میں نے صبح تک اسے حفظ کر لیا' کچھ دن کے بعد میں نے ان سے سفر کی اجازت مانگی' وہ کہنے لگے' میں اپنے کسی مہمان کو جانے کی اجازت نہیں دیتا' بہرحال جو مال و دولت میرے پاس موجود ہے اس میں سے آدھ تم لے لو' پھر انہوں نے ساری نقدی منگوائی' تین ہزار درہم نکلے' آدھے میرے حوالے کئے اور میں عراق کی سیاحت کے لئے نکل کھڑا ہوا۔

اب میری عمر اکیس برس کی ہو گئی تھی' یہ امیر المومنین ہارون الرشید کا زمانہ تھا' جب میں بغداد میں آیا تو دروازے پر میرا نام اور کوائف قلمبند کیے گئے' میں ایک مسجد میں جا کر قیام پذیر ہوا'

آدھی رات کو چھاپہ پڑا اور ہر شخص کو روشنی میں دیکھنا شروع کیا گیا' آخر میری باری آئی تو انہوں نے پکار کر کہا' ڈرنے کی کوئی بات نہیں جس کی تلاش تھی وہ مل گیا' پھر مجھے شاہی محل میں لے گئے' امیر المومنین کو میری باتیں پسند آئیں اور انہوں نے کہا' کیا تم پسند کرو گے کہ کتاب و سنت کے مطابق حکم سنانے کے لیے قاضی بنا دیئے جاؤ؟

میں نے جواب دیا' سلطنت میں شرکت تو مجھے ایک دن کے لئے بھی منظور نہیں۔ یہ سن کر امیر المؤمنین رو پڑے' اب مجھے تین سال اور ہو چکے تھے' اسی دوران کچھ حاجی حجاز سے لوٹے' میں نے ان سے امام مالکؒ کی خیریت دریافت کی' تو انہوں نے بتایا کہ امام صاحب تندرست اور بہت دولتمند ہو چکے ہیں' یہ سن کر مجھے شوق ہوا کہ ان کو غربت میں دیکھ چکا ہوں اب دولت مندی میں بھی دیکھنا چاہئے۔

ایک دولت مند شخص نے مجھے اصرار کر کے چالیس ہزار دینار پیش کئے' چنانچہ میں روانہ ہو پڑا' راستے میں مجھے ''احمد بن حنبلؒ'' سفیان بن عیینہؒ اور اوزاعیؒ اصحابِ حدیث ملے۔ میں نے ان تمام اصحاب کو اپنے پاس سے اتنا کچھ دیا جتنا ان کا مقدر تھا' میرے پاس صرف دس دینار رہ گئے' بالآخر ستائیسویں دن مدینہ منورہ پہنچ گیا۔

مسجد نبویؐ میں نماز پڑھی' اب کیا دیکھتا ہوں کہ لوہے کی ایک کرسی مسجد میں رکھی ہے' کرسی پر قباطی مصر کا تکیہ رکھا ہے' میں حیرت سے ابھی یہ دیکھ ہی رہا تھا کہ امام مالکؒ آ گئے اور پوری مسجد عطر کی خوشبو سے مہک اٹھی' ان کے جلو میں چار سو یا اس سے زیادہ کا مجمع تھا' سب لوگ ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے' امام صاحب کرسی پر بیٹھ گئے اور اپنے شاگردوں کے سامنے عملاً زخم لگانے کا مسئلہ پیش کیا۔ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک جاہل آدمی کو اس کا جواب لکھ دیا' اس نے بلند آواز سے یہ جواب بتا دیا' باقی تمام شاگردوں کے جواب غلط تھے' دو تین بار ایسا ہوا تو امام صاحب اس جاہل آدمی کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا ''یہاں آ جاؤ' وہ جگہ تمہاری نہیں ہے۔''

اس آدمی نے صاف بتا دیا کہ میرے ساتھ ایک اور نوجوان بیٹھا ہے جو مجھے یہ جواب لکھوا رہا ہے۔

امام صاحبؒ نے میری طرف گردن گھمائی' قریب بلایا اور غور سے دیکھ کر پوچھا ''شافعی'' ہو؟

میں نے عرض کیا ''جی ہاں!''

انہوں نے مجھے سینے سے لگایا اور اپنی کرسی سے اتر کر مجھ سے کہا ''جو باب ہم شروع کر چکے ہیں اس کو تم پورا کرو'' میں نے تعمیل کی' لیکن میرے سوالوں کا کوئی بھی جواب نہ دے سکا۔

امام صاحبؒ نے میری پیٹھ تھپکی' میری تعریف کی' اور نماز مغرب کے بعد مجھے اپنے گھر لے گئے' پرانی عمارت کی جگہ اب نئی عمارت کھڑی تھی' میں یہ دیکھ کر بے اختیار رو دیا۔

یہ دیکھ کر امام صاحبؒ نے کہا ''تم روتے کیوں ہو؟'' شاید سمجھ رہے ہو کہ میں نے دنیا کے لئے آخرت تج دی ہے' تم مطمئن رہو' تمہاری آنکھیں ٹھنڈی رہیں' یہ سب ہدیہ اور تحفہ ہے خراسان سے' مصر سے' دنیا کے دور دراز گوشوں سے ہدیے چلے آ رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول فرما لیا کرتے تھے اور صدقہ رد فرما دیتے تھے' میرے پاس اس وقت خراسان اور مصر کے اعلیٰ ترین کپڑوں کے تین سو خلعت موجود ہیں' اب یہ سب تمہارے لئے ہدیہ ہیں' صندوقوں میں پانچ ہزار دینار ہیں ان کی زکوٰۃ نکلی ہوئی ہے اس کی آدھی رقم اب تمہاری ہے۔

صبح نماز فجر ادا کرنے نکلے تو ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے' دروازے پر خراسانی گھوڑے اور مصری خچر کھڑے تھے' میرے منہ سے نکل گیا ''ایسے خوبصورت گھوڑے تو میں نے آج تک نہیں دیکھے۔''

امام صاحبؒ نے فرمایا ''یہ تمام سواریاں اب تمہارے لیے ہدیہ ہیں۔''

میں نے عرض کیا ''کم از کم ایک جانور تو اپنے لئے رکھ لیجئے۔''

فرمانے لگے ''مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ اس زمین کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندوں' جس کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما رہے ہیں۔''

تین دن بعد میں اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی خیر و برکت اور مال و متاع کے ساتھ مکہ روانہ ہو گیا۔ حدودِ حرم کے قریب مجھے اپنی والدہ مکرمہ چند عورتوں کے ساتھ ملیں' انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا لیکن میرا مال متاع دیکھ کر فرمایا ''کل تو مکہ سے فقیر کی صورت نکلا تھا' آج امیر بن کر لوٹا ہے تا کہ اپنے چچیرے بھائی بندوں پر گھمنڈ کرے۔''

میں نے عرض کیا ''پھر کیا کروں؟''

فرمانے لگیں ''منادی کرادو' بھوکے آئیں اور کھائیں' پیدل آئیں اور سواری لے جائیں' ننگے آئیں اور کپڑے پہن لیں' اس طرح دنیا میں تیری آبرو بڑھے گی اور آخرت میں اجر بھی محفوظ رہے گا۔''

چنانچہ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ یہ خبر امام مالکؒ نے بھی سنی تو کہلا بھیجا ''جتنا دے چکا ہوں' اتنا ہر سال بھیجتا رہوں گا۔''

(بروایت ربیع بن سلیمان' بذریعہ ''آئین)

صحیح بخاری کی تالیف و ترتیب

ایک دن امام بخاریؒ اسحاق بن راہویہؒ کی مجلس میں حاضر تھے۔ اسحاق بن راہویہؒ کے احباب نے کہا کہ اچھا ہوا گر اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی توفیق دے کہ سنن میں ایسا کوئی مختصر مجموعہ تیار کرے' جس میں صرف وہ صحیح حدیثیں ہوں جو صحت میں اعلیٰ مرتبہ رکھتی ہوں تاکہ عمل کرنے والے بلا خوف وتردد مجتہدین کی طرف مراجعت کئے بغیر اس پر عمل پیرا ہوں' امام بخاری کے دل میں یہ بات جاگزیں ہوگئی اور اسی وقت سے اس ''جامع'' کی تصنیف کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ چھ لاکھ حدیثوں کے اس ذخیرے میں سے جو ان کے پاس موجود تھا' انتخاب شروع کیا' جو ان میں صحیح ترین تھیں ان پر اکتفا کیا اور بعض وہ احادیث جو اسی درجے پر صحیح تھیں' ان کو طوالت کے خوف یا کسی دوسرے سبب سے چھوڑ بھی گئے۔ امام بخاریؒ جب کسی حدیث کو لکھنے کا ارادہ کرتے تھے تو اول غسل کرکے دو رکعت نفل ادا کرتے تھے تو پھر اس کو لکھتے' چنانچہ سولہ سال کے عرصے میں اس انتخاب سے فراغت پائی۔

جب اس کا قصد کیا کہ ان حدیثوں کی ان کے مضمون کے مطابق ترتیب دی جائے (اس کو اصطلاحِ محدثین میں ''ترجمۃ الباب'' کہتے ہیں) تو مدینہ منورہ میں قبر مبارک اور منبر رسول ﷺ کے درمیانی مقام میں اس اہم کام کو انجام دیا' ہر ''ترجمے'' پر دو رکعت نفل ادا کرتے تھے۔ الغرض امام بخاریؒ کی حسنِ نیت کا نتیجہ تھا کہ یہ ''جامع'' اس قدر مقبول ہوئی کہ ان کی زندگی میں ہی اس کو نوے ہزار آدمیوں نے آپ سے بلا واسطہ سنا' جن میں سب آخری ''فربری'' ہیں اور آج کل ان کی روایت ہی علو اسناد کی وجہ سے شائع و مشہور ہے۔ امام بخاریؒ کی نادر باتوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے مجھ کو امید ہے کہ قیامت کے دن مجھ سے کسی شخص کی غیبت کا سوال نہ کیا جائے گا۔

کیوں میں نے بفضل اللہ کسی کی غیبت نہیں کی۔

طریقِ صالحین کے مطابق امام بخاریؒ کو بھی محنت وابتلا یہ پیش آیا کہ خالد بن احمد ذہلی امیر بخارا نے ان کو اس امر کی تکلیف دینی چاہی کہ اس کے مکان پر آ کر اس کے بیٹوں کو ''جامع'' اور ''تاریخ'' اور دوسری کتابوں کا درس دیں۔ امام بخاریؒ نے جواب دیا کہ یہ حدیث کا علم ہے میں اس کو ذلیل کرنا نہیں چاہتا۔ اگر تم کو غرض ہے تو اپنے بیٹوں کو میری مجلس میں بھیج دیا کرو تا کہ دوسرے طلبہ کی طرح وہ بھی علم حاصل کریں۔ امیر نے کہا' کہ اگر یسا ہے تو جس وقت میرے بیٹے آپ کے پاس آئیں آپ دوسرے طلبہ کو اپنی خدمت میں نہ آنے دیں۔ میرے دربان اور چوب دار دروازے پر تعینات رہیں گے۔ میری نخوت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ جس مجلس میں میرے بیٹے موجود ہوں وہاں جولاہے' دھنیے بھی ان کے ہم نشین ہوں۔ امام بخاریؒ نے اس کو بھی قبول نہ کیا اور فرمایا کہ یہ علم' پیغمبر کی میراث ہے۔ اس میں ساری امت شریک ہے۔ کسی کو کوئی خصوصیت نہیں۔ اس گفت وشنید سے مذکورہ امیر امام امام بخاریؒ سے رنجیدہ ہو گئے۔ طرفین میں کدورت بڑھتی رہی۔ نوبت بایں جارسید کہ امیر مذکور نے ابن ابی الورقاء اور اس وقت کے دوسرے علمائے ظاہری کو اپنے ساتھ ملا لیا اور امام بخاریؒ کے مسلک پر طعن کرنے لگے اور ان کے اجتہاد میں غلطیاں نکال کر ایک محضر تیار کرایا اس حیلے بہانے سے ''بخارا'' سے ان کو نکال دیا۔ امام بخاریؒ وہاں سے روانہ ہوئے تو انہوں نے جناب الٰہی میں دعا کی کہ اے اللہ ان لوگوں کو اس بلا میں مبتلا کر جس میں وہ مجھ کو کرنا چاہتے ہیں۔ ابھی ایک ماہ بھی پورا گزرنے نہ پایا تھا کہ خالد بن احمد معزول ہوئے۔ خلیفہ کا حکم پہنچا کہ ان کو گدھے پر سوار کر کے شہر میں گھمائیں۔ انجام کار ان کو کامل تباہی کا سامنا ہوا' جیسا کہ کتاب تاریخ میں لکھا ہوا اور مشہور ہے۔ حریث ابن ابی ورقاء کو بھی بے حد رسوائی اور فضیحت کا منہ دیکھنا پڑا۔ ان کا وقار خاک میں مل گیا۔ نیز اس وقت کے ان علماء کو بھی جو امام بخاریؒ کے درپے تذلیل اور (خالد بن احمد) مشورے میں شریک تھے' پوری پوری آفت پہنچی۔ امام بخاریؒ اس بے کسی کی حالت میں پہلے نیشاپور گئے۔ جب وہاں کے امیر سے بھی نہ بنی تو وہاں سے مراجعت کر کے خرتنگ تشریف لائے (یہ ایک گاؤں کا نام ہے جو سمرقند سے تین فرسخ (دس میل) کے فاصلے پر واقع ہے۔) سنہ ۲۵۶ھ میں انتقال ہوا۔ عید کے دن نماز ظہر کے بعد دفن کر دیئے گئے۔ انا للہ

وانا الیہ راجعون ۔ امام بخاریؒ کی عمر ۶۲ سال کی ہوئی۔

چنانچہ کہا گیا ''ولد فی صدق وعاش حمیداً ومات فی نور'' اس جملے میں صدق کے اعداد ۱۹۴ ان کی پیدائش، حمید کے اعداد ۶۲ ان کی عمر اور نور کے اعداد ۲۵۶ ان کی وفات کا سال ظاہر کرتے ہیں۔

عبدالواحد طوسیؒ نے جو اس زمانے کے صلحا اور اکابر اولیاء میں سے تھے، خواب میں دیکھا کہ جناب رسول ﷺ معہ اپنے احبابؓ کے برسر راہ منتظر کھڑے ہیں۔ انہوں نے سلام کر کے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ کس کا انتظار ہے؟ آپؐ نے فرمایا محمد بن اسمٰعیل امام بخاریؒ کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس خواب کے چند روز بعد ہی میں نے امام بخاریؒ کی وفات کی خبر سنی۔ جب میں نے لوگوں سے وقت وفات کی تحقیق کی تو وہی ساعت معلوم ہوئی جس میں، میں نے حضور سرکائنات ﷺ کو خواب میں منتظر دیکھا تھا۔

حضرت معروف کرخیؒ، جنہیں توحید کیلئے چن لیا گیا

حضرت معروف بن فیروز کرخی رحمۃ اللہ علیہ دوسری صدی ہجری کے مشہور اولیاء کرام میں سے ہیں، حضرت علی بن موسیٰ الرضاء کے آزاد کردہ غلام تھے۔

آپ ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوئے تھے، لیکن آپ کے بھائی عیسیٰ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمانے سے ان کو عقیدۂ توحید کے لئے چن لیا تھا، میں اور وہ ایک عیسائی استاد کے پاس پڑھا کرتے تھے، استاد ہمیں ''باپ، بیٹا'' کا عقیدہ سکھاتا، لیکن حضرت معروف کرخیؒ جواب میں ''احد، احد'' فرماتے، اس پر استاد انہیں مارتے تھے، ایک مرتبہ استاد نے انہیں اتنا مارا کہ وہ بھاگ کھڑے ہوئے، اور لاپتہ ہو گئے، ان کی والدہ رو رو کر کہتی تھیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے معروف کو میرے پاس لوٹا دیا تو وہ جو دین چاہے گا اسے اختیار کرنے سے نہیں روکوں گی۔ کئی سال بعد آپ واپس آئے تو ماں نے پوچھا بیٹا! تم کس دین پر ہو؟ آپ نے جواب دیا کہ اسلام پر، اس پر والدہ بھی مسلمان ہو گئیں، اور ہمارا پورا گھر مشرف باسلام ہو گیا۔

(صفۃ الصفوۃ لابن الجوزی ص ۱۸۰، جلد ۲، جہان دیدہ ص ۲۵)

آپ ان اولیائے کرامؒ میں سے ہیں جن پر کثرت نوافل سے زیادہ ذکر وفکر کا غلبہ تھا۔ ان کے ایک معاصر راوی ابوبکر بن ابی طالبؒ فرماتے ہیں کہ میں حضرت معروف کرخیؒ کے پاس ان کی مسجد میں گیا۔ جب انہوں نے آذان شروع کی تو میں نے دیکھا کہ حضرت معروف کرخیؒ قدس سرہ پر اضطراب کی ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ اور جب موذن نے اشھدأن لا الہ الااللہ کہا تو ان کی ریش مبارک اور ابرو تک کے بال کھڑے ہو گئے اور وہ بے قابو ہو کر اس درجہ جھکنے لگے کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ وہ آذان پوری بھی کر سکیں گے یا نہیں۔ (حلیۃ الاولیاء لابی نعیمؒ ج ۸ ص ۳۶۱)

ایک مرتبہ آپ دجلہ کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے سامنے سے ایک کشتی گذری جس میں کچھ بے فکر نوجوان گاتے بجاتے جا رہے تھے کسی نے حضرت معروف کرخیؒ سے کہا کہ ''دیکھئے یہ لوگ دریا میں بھی اللہ کی نافرمانی سے باز نہیں آتے، ان کے لئے بددعا کر دیجئے'' اس پر حضرت معروف کرخیؒ نے ہاتھ اٹھائے اور دعا فرمائی کہ:

''یاالٰہی اے میرے آقا! میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ جس طرح آپ نے ان نوجوانوں کو دنیا میں مسرتیں بخشی ہیں ان کو جنت میں بھی مسرتیں عطا فرمائیے۔''

حاضرین نے کہا کہ ہم نے تو آپ سے بددعا کے لئے کہا تھا فرمایا کہ ''اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں آخرت میں مسرتیں عطا فرمائیں تو ان کے دینوی اعمال سے ان کی توبہ قبول فرمائے گا۔ اس میں تمہارا تو کوئی نقصان نہیں۔'' (صفۃ الصفوہ ص ۱۸۱ ج ۲)

حضرت سعیدؒ بن المسیب کی بیٹی کی شادی

حضرت سعید بن المسیب مشہور تابعی ہیں بڑے محدثین میں شمار ہیں ان کی خدمت میں ایک شخص عبداللہ بن ابی دواعہؒ کثرت سے حاضر ہوا کرتے تھے ایک مرتبہ چند روز حاضر نہ ہو سکے کئی روز کے بعد جب حاضر ہوئے تو حضرت سعید نے دریافت فرمایا کہاں تھے عرض کیا کہ میری بیوی کا انتقال ہو گیا ہے اس کی وجہ سے مشاغل میں پھنسا رہا فرمایا کہ ہم کو خبر نہ کی ہم بھی جنازہ میں شریک ہوتے تھوڑی دیر کے بعد میں اٹھ کر آنے لگا فرمایا دوسرا نکاح کر لیا؟ میں نے عرض کیا حضرت مجھ سے کون نکاح کرے گا دو تین آنے کی میری حیثیت ہے آپ نے فرمایا ہم کر دیں گے اور یہ کہہ کر خطبہ پڑھا اور اپنی بیٹی کا نکاح نہایت معمولی مہر آٹھ دس آنے پر مجھ سے کر دیا اتنی مقدار مہر کی ان

کے نزدیک جائز ہوگی' جیسا کہ بعض اماموں کا مذہب ہے' حنفیہ کے نزدیک اڑھائی روپے سے کم جائز نہیں) نکاح کے بعد میں اٹھا اور اللہ ہی کو معلوم ہے کہ مجھے کس قدر مسرت تھی' خوشی میں سوچ رہا تھا کہ رخصتی کے انتظام کے لئے کس سے قرض مانگوں کیا کروں' اور فکر میں شام ہوگئی' میرا روزہ تھا مغرب کے وقت روزہ افطار کیا نماز کے بعد گھر آیا چراغ جلایا روٹی اور زیتون کا تیل موجود تھا اس کو کھانے لگا کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا میں نے پوچھا کون ہے؟ کہا سعید ہے' میں سوچنے لگا کہ کون سعید ہے' حضرت کی طرف میرا خیال بھی نہیں گیا کہ چالیس برس سے اپنے گھر یا مسجد کے سوا کہیں آنا جانا تھا ہی نہیں باہر آ کر دیکھا کہ سعید بن المسیبؒ ہیں میں نے عرض کیا آپ نے مجھے نہ بلایا فرمایا میرا آنا مناسب تھا' میں نے عرض کیا کیا ارشاد ہے؟ فرمایا مجھے یہ خیال آیا کہ اب تمہارا نکاح ہو چکا ہے' تنہا رات کو سونا مناسب نہیں' اس لئے تمہاری بیوی کو لایا ہوں' یہ فرما کر اپنی لڑکی کو دروازے کے اندر کر دیا اور دروازہ بند کر کے چلے گئے' وہ لڑکی شرم کی وجہ سے گر گئی میں نے اندر سے کواڑ بند کئے اور وہ روٹی اور تیل جو چراغ کے سامنے رکھا تھا وہاں سے ہٹا دیا کہ اس کی نظر نہ پڑے اور مکان کی چھت پر چڑھ کر پڑوسیوں کو آواز دی' لوگ جمع ہو گئے تو میں نے کہا کہ حضرت سعیدؒ نے اپنی لڑکی سے میرا نکاح کر دیا ہے' اور اس وقت وہ خود ہی اس کو پہنچا گئے ہیں' سب کو بڑا تعجب ہوا کہنے لگے واقعی وہ تمہارے گھر میں ہے؟ میں نے کہا! ہاں اس کا چرچا ہوا میری والدہ کو خبر ہوئی وہ بھی اسی وقت آ گئیں اور کہنے لگیں کہ اگر تین دن تک تو نے اسے چھیڑا تو میرا منہ نہ دیکھو گے' ہم تین دن میں اس کی تیاری کر لیں' تین دن کے جب میں اس لڑکی سے ملا تو دیکھا نہایت خوبصورت قرآن شریف کی حافظہ اور سنت رسول سے بھی زیادہ واقف' شوہر کے حقوق سے بھی زیادہ باخبر' ایک مہینہ تک نہ تو حضرت سعید میرے پاس آئے نہ میں ان کی خدمت میں گیا ایک ماہ کے بعد میں حاضر ہوا تو وہاں مجمع تھا' میں سلام کر کے بیٹھ گیا جب سب چلے گئے تو فرمایا اس آدمی کو کیسا پایا' میں نے عرض کیا نہایت بہتر ہے کہ دوست دیکھ کر خوش ہوں دشمن جلیں' فرمایا اگر کوئی بات ناگوار ہو تو لکڑی سے خبر لینا' میں واپس آ گیا' تو ایک آدمی کو بھیجا جو بیس ہزار درہم (تقریباً پانچ ہزار روپیہ) مجھے دے گیا' اس لڑکی کو عبدالملک بن مروان بادشاہ نے اپنے بیٹے ولید کے لئے (جو ولی عہد بھی تھا) مانگا تھا' مگر سعیدؒ نے عذر کر دیا تھا' جس کی وجہ سے عبدالملک ناراض بھی ہوا' ایک حیلہ سے حضرت سعید کو سو کوڑے سخت

سردی میں لگوائے اور پانی کا گھڑا بھی ان پر گروایا۔ (ساعتے با اولیاء)

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد کا ایمان افروز واقعہ

''گیلان'' کے قصبے میں ایک خدا پرست' ولی کامل ''حضرت ابوصالح موسیٰ'' رہتے تھے ایک دفعہ انہوں نے دیکھا کہ ندی میں ایک سیب بہتا ہوا آ رہا ہے' چنانچہ انہوں نے اسے نکال کر کھا لیا' معاً خیال آیا کہ باغ کے مالک سے اجازت لئے بغیر مجھے سیب کھانے کا حق نہیں تھا۔ سخت پشیمان ہوئے' باغ کے مالک ''حضرت عبداللہ صومعی'' کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معافی طلب ہوئے۔

حضرت عبداللہ صومعی اس نوجوان کا زہد و اتقاء دیکھ کر حیران رہ گئے' ان کا حسب نسب دریافت کیا' کچھ دیر تأمل کیا' اس کے بعد فرمایا ''میں اس وقت تک تمہیں معاف نہیں کروں گا جب تک میری ایک شرط پوری نہ کرو۔''

انہوں نے کہا ''میں آپ کی ہر خواہش پوری کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

حضرت عبداللہ صومعی نے فرمایا کہ میری بیٹی ''ام الخیر'' کو اپنی زوجیت میں قبول کر لو لیکن یہ سمجھ لو کہ وہ گونگی' بہری' لولی' لنگڑی اور اندھی ہے۔

حضرت ابوموسیٰ یہ سن کر کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے' لیکن پھر خیال آیا کہ تمام عمر کا زہد و تقویٰ ضائع جانے کا اندیشہ ہے' رزق حلال میں حرام کی آمیزش ہو گئی ہے' یہ شرط ماننے بنا چارہ نہیں' چنانچہ انہوں نے یہ رشتہ منظور کر لیا۔

جب حضرت ابوموسیٰ صالح حجلہ عروسی میں پہنچے تو وہاں ایک پیکرِ حسن و جمال کو دیکھ کر توبہ استغفار کیا اور حضرت عبداللہ صومعی کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا ''آپ نے میرا عقد ایک اندھی' لولی' لنگڑی' اپاہج دوشیزہ سے کیا تھا' لیکن حجلہ عروسی میں تو کوئی نامحرم موجود ہے جوان تمام خامیوں سے پاک ہے؟

حضرت عبداللہ صومعی نے فرمایا' عزیزم حجلہ عروسی میں جو موجود ہے' وہی میری بیٹی ''ام الخیر فاطمہ'' ہے۔ میں نے اس کو اندھی اس لیے کہا کہ آج تک اس کی نظر کسی نامحرم پر نہیں پڑی۔ بہری اس لحاظ سے کہ آج تک کوئی بری بات اس نے نہیں سنی۔ گونگی اس لحاظ سے کہ اس نے کبھی بری بات نہیں کی۔ لولی اس لیے کہ اس نے کوئی خلافِ شریعت کام نہیں کیا اور لنگڑی اس لیے کہ اس

نے آج تک اللہ کے راستے کے علاوہ کسی اور راستے پر قدم نہیں رکھا۔ انہیں فرشتہ خصال والدین کے ہاں "حضرت عبدالقادر جیلانی محبوب سبحانی" پیدا ہوئے۔ (دیباچہ غنیۃ الطالبین از شمس بریلوی)

ابن تیمیہؒ کی ذہانت

"صاحب العقود الدریہ" لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ "حلب" کے ایک بڑے عالم دمشق آئے، انہوں نے سنا کہ ایک بچہ ہے جس کا نام "احمد بن تیمیہ" ہے اور وہ بہت جلد یاد کر لیتا ہے، ان کو اس کے دیکھنے اور امتحان لینے کا شوق ہوا، جس راستے سے "ابن تیمیہؒ" گزرا کرتے تھے وہاں وہ ایک درزی کی دوکان پر بیٹھ گئے۔

درزی نے کہا "وہ بچہ آتا ہی ہوگا، یہی اس کے مکتب کا راستہ ہے، آپ تشریف رکھئے۔ تھوڑی دیر میں کچھ بچے مکتب جاتے ہوئے گذرے۔ درزی نے کہا، دیکھئے وہ بچہ جس کے پاس بڑی سی تختی ہے، وہی ابن تیمیہؒ ہے۔

شیخ نے اس بچے کو آواز دی، وہ آیا تو اس کی تختی لے لی اور کہا بیٹا جو کچھ لکھا ہے اس کو پونچھ ڈالو، جب وہ صاف ہو گیا تو انہوں نے اس پر کوئی ۱۱ یا ۱۳ حدیثیں لکھوا دیں، اور کہا ان کو پڑھ لو، بچے نے ان کو ایک مرتبہ غور سے پڑھا، شیخ نے تختی اٹھا لی اور کہا سناؤ۔ بچے نے پوری حدیثیں سنا دیں۔

شیخ نے کہا، ان کو بھی پونچھ ڈالو، پھر چند سندیں لکھ دیں اور کہا، پڑھو۔ بچے نے ایک بار غور سے دیکھا اور سنا دیا۔

شیخ نے یہ تماشا دیکھ کر فرمایا، اگر یہ بچہ جیتا رہا تو کوئی چیز بنے گا، اس لئے کہ اس زمانہ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ (تاریخ دعوت وعزیمت از مولانا ابوالحسن علی ندویؒ)

فاتح سومنات سلطان محمود غزنویؒ

تاریخ فرشتہ کے مصنف نے ''طبقات ناصری'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کومشہور حدیث ''العلماء ورثۃ الانبیاء'' کی صحت پر پورا یقین نہ تھا اسے قیامت کے آنے کے بارے میں بھی شبہ تھا۔ اس کے علاوہ اسے سبکتگین کا بیٹا ہونے میں بھی شک تھا۔ ایک رات کا واقعہ ہے کہ سلطان محمود اپنی قیام گاہ سے نکل کر پیدل ہی کسی طرف چل رہا تھا۔ فراش سونے کا شمع دان لے کر اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ راستے میں اسے ایک ایسا طالب علم ملا جو مدرسے میں بیٹھا ہوا اپنا سبق یاد کررہا تھا مگر اس کے پاس جلانے کے لئے تیل نہ تھا۔ اس لئے وہ پڑھتے پڑھتے جب کچھ بھول جاتا تو ایک بنئے کے چراغ کے پاس آکر اپنی کتاب میں سے دیکھ کر تصحیح کر لیتا۔ محمود کو اس نادار طالب علم کی حالت پر بڑا رحم آیا اور اس نے وہ شمع دان جو فراش نے اٹھا رکھا تھا' اس طالب علم کو دے دیا۔ جس رات یہ واقعہ پیش آیا اسی رات کو خواب میں محمود کو حضرت محمد ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپؐ نے محمود سے فرمایا۔ ''اے ناصر الدین سبکتگین کے بیٹے فرزند ارجمند خداوند تعالٰی تجھ کو ویسی ہی عزت دے جیسی تو نے میرے ایک وارث کی قدر کی ہے۔'' آنحضرت ﷺ کے اس فرمان سے سلطان محمود کے دل میں متذکرہ بالا تینوں شکوک دور ہو گئے۔

(تاریخ فرشتہ جلد اول۔ ص ۸۹ مطبوعہ لاہور)

سلطان محمود کے عدل وانصاف کا ایک یادگار واقعہ

سلطان محمود کے انتقال کے دوسرے سال غزنی میں ایک زبردست سیلاب آیا۔ اس کی وجہ سے شہر کی بہت سی عمارتیں گر گئیں خدا کے بہت سے بندوں کی جانیں ضائع ہو گئیں۔ وہ پل جو عمر بن لیث صفار نے اپنے عہد حکومت میں دریا پر تعمیر کیا تھا اس سیلاب کی زد میں آکر مسمار ہوا اور اس کا

نام ونشان تک مٹ گیا۔ اہل نظر کے نزدیک یہ حادثہ محمود کے انتقال کی ایک بہت اہم نشانی ہے اور وہ اس کو محمود کے عدل وانصاف کی دلیل سمجھتے ہیں۔ محمود کے عدل وانصاف کے بہت سے واقعات مشہور ہیں جن میں سب سے زیادہ مشہور اور اہم واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز ایک شخص محمود کے دربار میں انصاف حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوا جب محمود اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس شخص نے عرض کیا۔ ''میری شکایت ایسی نہیں ہے کہ میں اسے سر دربار سب لوگوں کے سامنے بیان کردوں۔'' محمود فوراً اٹھا اور اسے تنہائی میں لے جا کر اس کا حال پوچھا'' اس شخص نے روتے ہوئے فریاد پیش کی کہ'' آپ کا بھانجا ایک عرصے سے رات کو مسلح ہو کر میرے گھر پر آتا ہے مجھے کوڑے مار مار کر باہر نکال دیتا ہے اور پھر خود تمام رات میری بیوی کے ساتھ ہم بستری کرتا ہے میں نے امیر کو اپنا حال سنایا لیکن کسی کو میری حالت پر رحم نہ آیا اور کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ آپ سے یہ بات بیان کرتا۔ جب میں ان امراء سے مایوس ہو گیا تو میں نے آپ کے دربار کے دروازے پر آنا شروع کر دیا۔ اور موقع کی انتظار میں رہا کہ کسی طرح آپ سے اپنا حال بیان کر سکوں۔ خداوند تعالیٰ نے آپ کو ملک کا حاکم اعلیٰ بنایا ہے اس لئے رعایا اور کمزور بندوں کی نگہداشت آپ کا فرض ہے۔ اگر آپ مجھ پر رحم فرما کر میرے معاملے میں انصاف کریں گے تو زہے نصیب ورنہ میں اس معاملے کو خدا کے سپرد کروں گا اور اس کے منصفانہ فیصلے کی انتظار کروں گا۔''

محمود پر اس بات کا اتنا اثر ہوا کہ وہ یہ سن کر زار و قطار رونے لگا اور کہا: ''اے مظلوم! تو اس سے پہلے میرے پاس کیوں نہ آیا اور اتنے دنوں تک یہ ظلم کیوں برداشت کرتا رہا۔'' اس شخص نے جواب میں کہا۔'' اے بادشاہ ایک مدت سے یہ کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح آپ کے حضور حاضر ہو سکوں۔ لیکن دربار کے چوکیداروں اور دربانوں کی روک تھام کی وجہ سے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ یہ خدا ہی بہتر طور پر جانتا ہے کہ آج میں کس تدبیر اور بہانے سے یہاں پہنچا ہوں اور کس طرح ان چوکیداروں کی نظر بچا کر آپ کے حضور میں حاضر ہوا ہوں ہم جیسے فقیروں اور غریبوں کی یہ قسمت کہاں کہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سلطانی دربار میں چلے آئیں اور بادشاہ سے بالمشافہ اپنی روداد غم بیان کریں۔'' محمود نے جواب دیا۔'' تم یہاں مطمئن ہو کر بیٹھو لیکن اس ملاقات اور گفتگو کا حال کسی کو نہ بتانا اور اب خیال رکھنا کہ جس وقت وہ سفاک تمہارے گھر میں آئے تو فوراً مجھے اطلاع دینا' میں

اسی وقت تمہارے ساتھ انصاف کروں گا اور اس سفاک کو اس بدکرداری کی سزا دوں گا۔"

اس شخص نے کہا "اے بادشاہ! مجھ جیسے نادار شخص کے لئے یہ ناممکن ہے کہ جب چاہوں بلا کسی روک ٹوک کے آپ سے مل سکوں۔"

محمود نے فوراً دربانوں کو بلایا اور ان سے ان شخص کو متعارف کروا کر انہیں حکم دیا کہ جس وقت بھی یہ شخص ہمارے حضور میں آنا چاہے اسے بغیر کسی اطلاع اور روک ٹوک کے آنے دیا جائے۔

دربانوں کو رخصت کرنے کے بعد سلطان محمود نے اس شخص کو قریب بلایا اور کہا۔"اگرچہ اب میرے حکم کے مطابق یہ لوگ تمہیں روکنے کی جرأت نہ کریں گے لیکن پھر بھی احتیاطاً تمہیں یہ بتائے دیتا ہوں کہ اگر کبھی اتفاقاً یہ چوبدار میری عدیم الفرصتی یا آرام کا عذر کر کے تمہیں روک دیں تو تم فلاں جگہ سے چھپ کر چلے آنا اور آہستہ سے مجھے آواز دینا۔ میں یہ آواز سنتے ہی تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔" یہ کہہ کر اس شخص کو رخصت کیا اور اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔" دو راتیں سکون سے گزریں، تیسری رات سلطان محمود کا بھانجا اس کے گھر داخل ہوا اور حسب دستور اسے مار پیٹ کر باہر نکال دیا اور خود اس کی بیوی کے ساتھ عیش وعشرت میں مشغول ہو گیا۔ وہ شخص اسی وقت شاہی محل کی طرف دوڑا اور دربانوں سے کہا کہ بادشاہ کو اس کی آمد کی اطلاع دی جائے۔ دربانوں نے جواب دیا کہ بادشاہ اس وقت دیوان خانے کی بجائے اپنی حرم سرا میں ہے لہٰذا تمہیں وہاں جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ وہ شخص مایوس ہو کر پیچھے ہٹا اور اس جگہ پر پہنچا جس کے بارے میں سلطان محمود نے اسے بتا رکھا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔"اے بادشاہ اس وقت آپ کس کام میں مشغول ہیں؟" سلطان محمود نے جواب دیا۔"ٹھہرو میں آتا ہوں" تھوڑی دیر کے بعد محمود باہر آیا اور اس شخص کے ساتھ اس کے گھر پہنچا وہاں جا کر محمود نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کا بھانجا اس غریب شخص کی بیوی سے ہم آغوش ہو کر سویا ہوا ہے اور شمع اس کے پلنگ کے سرہانے جل رہی ہے۔ محمود نے شمع بجھائی اور خنجر سے اس ظالم کا سرتن سے جدا کر دیا پھر اس مظلوم شخص سے کہا۔"اے بندۂ خدا ایک گھونٹ پانی اگر مل سکے تو فوراً لے آتا کہ میں اپنی پیاس بجھاؤں۔"

اس شخص نے فوراً پیالے میں پانی لا کر سلطان کی خدمت میں پیش کیا۔ محمود نے پانی پیا اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نادار سے یوں مخاطب ہوا۔"اے شخص اب تو اطمینان کے ساتھ آرام کر میں

جاتا ہوں۔" اور رخصت ہونے لگا لیکن اس شخص نے بادشاہ کا دامن پکڑ لیا اور کہا "اے بادشاہ! تجھے اس خدا کی قسم ہے کہ جس نے تجھے اس عظیم الشان مرتبے پر سرفراز کیا ہے تو مجھے یہ بتا شمع گل کرنے اور سفاک کا سرتن سے جدا کرنے کے فوراً بعد پانی مانگنے اور پینے کی کیا وجہ ہے؟ سلطان محمود نے جواب دیا "اے شخص میں نے تجھے ظالم سے نجات دلا دی اور اس کا سر اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ شمع کو میں نے اس لئے بجھایا کہ کہیں اس کی روشنی میں مجھے اپنے بھانجے کا چہرہ نہ نظر آ جائے اور میں اس پر رحم کھا کر انصاف نہ کرسکوں۔ پانی مانگ کر پینے کی وجہ یہ تھی کہ جب تم نے مجھ سے اپنی روداد غم بیان کی تھی تو میں نے عہد کیا تھا کہ جب تک تمہارے ساتھ پورا پورا انصاف نہ ہوگا تب تک میں کھانا نہ کھاؤں گا اور نہ پانی پیوں گا۔" (تاریخ فرشتہ جلد اول)

قارئین کرام اگرچہ تاریخوں میں بادشاہوں کے عدل وانصاف کے بہت سے قصے لکھے ہیں لیکن ایسا قصہ کسی بادشاہ کے متعلق نہیں ملتا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

سلطان محمودؒ کی شیخ ابوالحسن خرقانیؒ سے ملاقات

محمد قاسم فرشتہ نے "تاریخ بنائے گیتی" کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ جب سلطان محمود خراسان گیا تو اس کے دل میں شیخ ابوالحسن خرقانیؒ (سلسلہ نقشبندیہ کے ایک مشہور بزرگ) سے ملاقات کا خیال پیدا ہوا' لیکن ساتھ ہی یہ خوف بھی لاحق ہوا کہ وہ خراسان میں اس بزرگ سے ملنے نہیں آیا' بلکہ ملکی سیاسیات کے پیش نظر اس نے یہ سفر اختیار کیا ہے۔ اس حالت میں خداوند تعالیٰ کے خاص بندوں کی زیارت کرنا خلاف ادب ہے۔ اس نے شیخ ابوالحسنؒ سے ملاقات کا ارادہ ترک کر دیا اور خراسان سے ہندوستان چلا گیا۔ وہاں معرکہ آرائیاں کرنے کے بعد غزنی واپس آیا۔ غزنی پہنچ کر اس نے شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کی زیارت کے لئے احرام باندھا اور خرقان روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچ کر ایک شخص کو شیخ صاحبؒ کی خدمت میں روانہ کیا اور پیغام بھجوایا کہ "بادشاہ آپ سے ملنے کے لئے غزنی سے چل کر یہاں آیا ہے۔ اب آپ اپنی خانقاہ سے باہر تشریف لائیں اور مجھ سے ملاقات کریں۔" اس کے ساتھ ہی محمود نے قاصد سے یہ کہہ دیا کہ اگر حضرت شیخ باہر آنے سے انکار کریں تو انہیں یہ فرمان خداوندی سنا دینا کہ "ایمان والو! اطاعت کرو خدا کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم پر حاکم ہیں۔" قاصد نے حضرت شیخ کی خدمت میں سلطان محمود کا پیغام پہنچایا شیخ نے اپنی خانقاہ سے باہر نکلنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ

انہیں اس خدمت سے معذور سمجھا جائے۔"اس پر قاصد نے محمود کی ہدایت کے مطابق متذکرہ بالا آیت پڑھ کر سنائی، جواب میں شیخؒ نے کہا محمود سے جا کر یہ کہو کہ میں اب تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اس حد تک مستغرق ہوں کہ رسول کی اطاعت کے مرتبے تک نہ پہنچنے کی بڑی ندامت ہے۔ بھلا ایسی صورت میں حاکم کی اطاعت کی طرف کیسے توجہ کر سکتا ہوں۔"

قاصد واپس پہنچا اور شیخ کا جواب سنایا سلطان محمود یہ سن کر رو پڑا اور کہنے لگا، ہم نے شیخ کو سمجھنے میں غلطی کی ہے "چلو ہم خود ہی شیخ کے پاس چل کر لطف ملاقات و زیارت حاصل کریں۔ یہ کہہ کر سلطان محمود نے خود تو ایاز کا لباس پہنا اور اپنے کپڑے ایاز کو پہنائے اور دس عدد کنیزوں کو غلاموں کے کپڑے پہنا کر اپنے ساتھ لے لیا۔ اور ان سب کی معیت میں شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور سلام علیک کی شیخ نے سلام کا جواب تو دے دیا، لیکن تعظیم کے لئے کھڑے نہ ہوئے۔ اور محمود (جس نے ایاز کے کپڑے پہن رکھے تھے) کی طرف کوئی توجہ نہ کی بلکہ ایاز (جس نے محمود کا لباس زیب تن کیا ہوا تھا) کی طرف ملتفت ہو کر کچھ فرمانے کے لئے آمادہ ہوئے۔ اس پر ایاز (یعنی اصل میں محمود) نے شیخؒ سے کہا۔

"اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ نہ تو بادشاہ کی تعظیم کے لئے اٹھے اور نہ ہی اس کی طرف توجہ کی۔ کیا فقر کے جال کی یہی کائنات ہے کہ بادشاہ کو اس طرح نظر انداز کیا جائے؟"

شیخؒ نے جواب دیا۔"ہاں جال تو یہی ہے، لیکن تیرا مشار الیہ اس جال کا گرفتار نہیں ہے تو سامنے آ کیونکہ تو خود اس جال کا سب سے بڑا شکار ہے"۔

سلطان محمود نے جب دیکھا کہ شیخ نے اصل حقیقت کو بھانپ لیا ہے تو بڑے ادب سے شیخ کے سامنے بیٹھ گیا اور عرض کیا "مجھ سے کچھ فرمایئے۔"

شیخؒ نے غلاموں کے لباس میں بیٹھی ہوئی لونڈیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ان نامحرموں کو محفل سے باہر کر دو۔"

سلطان نے ان کنیزوں کو وہاں سے اٹھا دیا اور پھر شیخ سے مخاطب ہوا۔"حضرت! بایزید بسطامی کی کوئی حکایت مجھے سنایئے۔"

شیخ نے کہا"بایزید نے فرمایا ہے کہ جس نے مجھ کو دیکھ لیا وہ ظلم و ستم کی تمام برائیوں سے

محفوظ ہو گیا۔"

اس پر محمود نے سوال کیا۔ "یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا بایزید کا مرتبہ حضرت ﷺ کے رتبے سے بھی زیادہ ہے۔ نبی کریم ﷺ کے دیکھنے والوں میں بھی سبھی اچھے نہ تھے۔ ابوجہل اور ابولہب ویسے ہی کافر رہے تو پھر بایزید کے دیکھنے والوں میں ہر ظالم کس طرح اچھا انسان بن سکتا ہے؟"

شیخ نے فرمایا: "اے محمود تو اپنی بساط سے بڑھ کر باتیں نہ کر ادب کو ملحوظ رکھ بے ادبی سے ولایت کی دنیا میں قدم نہ رکھ تو جان لے کہ حضرت محمد ﷺ کو سوائے چار (۴) یاروں اور چند دیگر صحابہ کرام کے کسی اور نے نہیں دیکھا۔ کیا تو نے قرآن کریم کی یہ آیت سنی نہیں کہ "اور تم دیکھتے ہو ایسے لوگوں کو وہ **نظر** کرتے ہیں تمہاری طرح حالانکہ وہ حقیقتاً تم کو نہیں دیکھ سکتے۔"

سلطان محمود کو حضرت شیخ کی یہ بات بہت پسند آئی اور کہا "مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔"

شیخ ؒ نے فرمایا: "تجھے چاہئے کہ چار چیزوں کو اختیار کرے۔ اول پرہیز گاری دوم نماز با جماعت سوم سخاوت چہارم شفقت۔"

اس کے بعد محمود نے درخواست کی "میرے حق میں دعا کیجئے۔"

شیخ نے فرمایا "میں پانچوں نمازوں کے بعد یہ دعا کیا کرتا ہوں **اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ**"

محمود نے کہا۔ "یہ دعا تو عام ہے میرے لئے کوئی خاص دعا فرمائیے۔"

شیخ ؒ نے فرمایا۔ "جا تیری عاقبت محمود ہو۔"

اس کے بعد سلطان محمود نے روپوں کا ایک توڑا شیخ کی خدمت میں پیش کیا، شیخ نے جو کی روٹی سلطان کے سامنے رکھی اور کھانے کے لئے کہا۔ محمود نے دیکھا کہ روٹی بہت سخت ہے اس نے ہر چند اسے چبایا لیکن نہ تو وہ دانتوں سے کٹتی تھی اور نہ ہی گلے سے نیچے اترتی تھی۔

شیخ ؒ نے پوچھا کیا یہ روٹی تمہارے گلے میں اٹکتی ہے؟"

محمود نے اثبات میں جواب دیا......

شیخ نے فرمایا۔ "جس طرح ہماری یہ سوکھی روٹی تمہارے گلے سے نیچے نہیں اترتی، اسی طرح تمہارا یہ روپوں سے بھرا ہوا توڑا بھی ہمارے گلے سے نیچے نہیں اترتا۔ اس کو ہمارے سامنے

سے اٹھاؤ کیونکہ ہم اسے بہت پہلے سے طلاق دے چکے ہیں۔''

محمود نے التماس کی' شیخ ! کوئی چیز بطور یادگار عنائت فرمایئے' انہوں نے اسے اپنا ایک خرقہ دے کر رخصت کیا۔

جب محمود رخصت کے وقت اٹھا تو اس مرتبہ شیخ بطور تعظیم اٹھ کھڑے ہوئے۔

محمود نے کہا۔'' آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جب میں آپ کے پاس آیا تھا تو آپ نے میری کوئی پروا نہیں کی تھی' اب آپ میرے لیے اٹھ کر کھڑے ہو گئے ہیں؟''

شیخؒ نے جواب دیا۔'' جب تم میرے پاس آئے تھے' تم بادشاہی کے غرور میں سرشار تھے اور میرا امتحان کرنے کی غرض سے آئے تھے' اب تم عاجزی اور انکساری کے ساتھ واپس جا رہے ہو۔''

خرقۂ شیخ کی کرامت

شیخ سے رخصت ہو کر سلطان محمود غزنوی واپس آیا اور ان کے عطا کردہ خرقے کو بڑی حفاظت سے اپنے پاس رکھا۔ جس زمانے میں محمود نے سومنات پر حملہ کیا تو پرم اور دا شلیم سے جنگ کے دوران محمود کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں مسلمانوں کے لشکر پر ہندوؤں کا لشکر غالب نہ آ جائے۔ چنانچہ پریشانی کے عالم میں سلطان محمود شیخ کے خرقہ کو ہاتھ میں لے کر سجدے میں گر گیا اور خداوند تعالیٰ سے دعا کی۔'' اے خدا اس خرقے کے مالک کے طفیل میں مجھے ان ہندوؤں کے مقابلہ میں فتح دے۔ میں نیت کرتا ہوں کہ جو مال غنیمت یہاں سے حاصل کروں گا اسے غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دوں گا۔'' مؤرخین کا بیان ہے کہ جونہی محمود نے یہ دعا مانگی آسمان کے ایک حصے سے سیاہ بادل اٹھے اور سارے آسمان پر محیط ہو گئے۔ بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کڑک سے ہندوؤں کا لشکر ہراساں ہو گیا اور ایسی تاریکی چھائی کہ ہندو اس پریشانی کے عالم میں آپس ہی میں ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ اور اس باہمی جنگ کی وجہ سے پرم دیو کی فوج میدان سے بھاگ نکلی اور مسلمانوں نے ہندوؤں پر فتح پائی۔

محمد قاسم فرشتہ کہتے ہیں کہ'' میں نے ایک معتبر تاریخ میں یہ روایت دیکھی ہے کہ جس روز سلطان محمود نے شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کے خرقے کو ہاتھ میں لے کر خدا تعالیٰ سے دعا مانگ کر فتح حاصل کی اسی رات کو محمود نے خواب میں شیخ ابوالحسنؒ کو دیکھا انہوں نے محمود سے فرمایا'' اے محمود تو نے

میرے خرقے کی آبروریزی کی ہے اگر تو فتح کی دعا کی جگہ تمام غیر مسلموں کے اسلام لے آنے کی دعا کرتا تو وہ بھی قبول ہو جاتی۔''

''جامع الحکایات'' میں یہ لکھا ہے کہ جب سلطان محمود شیخ ابوالحسن کی خدمت میں پہنچا تو اس نے شیخ صاحب سے کہا۔''اگرچہ خراسان میں مجھے بہت ضروری کام تھے لیکن میں ان تمام کاموں کو نظر انداز کر کے غزنی سے یہاں خاص طور پر آپ کی زیارت کے مقصد سے آیا ہوں۔'' شیخ نے جواب دیا اے محمود! اگر تو نے غزنی سے میری زیارت کا احرام باندھا ہے تو کیا تعجب کہ اس کی برکت سے لوگ خانہ کعبہ سے تیری زیارت کا احرام باندھ کر غزنی میں آئیں'' سبحان اللہ! سلطان محمود کی برتری کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ شیخ ابوالحسن خرقانیؒ نے اس کی بابت یہ الفاظ کہے۔

قاضی ابو بکر بغدادیؒ کا عجیب واقعہ

حافظ ابنِ رجب حنبلیؒ (م ۷۹۵ھ) اپنی کتاب ''ذیل طبقات الحنابلہ'' میں قاضی ابو بکر بن محمد بن عبدالباقی بغدادیؒ (بزاز انصاری م ۵۳۵ھ) کے حالات میں ان کا یہ بیان نقل کرتے ہیں:

''میں ایک زمانہ میں مکہ مکرمہ آ کر پڑ گیا تھا، ان دنوں ایک مرتبہ بہت ہی سخت بھوک لگی۔ پاس کچھ تھا نہیں جس سے بھوک مٹاتا۔ اتفاق سے ایک ریشم کی تھیلی پڑی ہوئی مل گئی جس کا پھُندنا بھی ریشم کی ڈوری سے بندھا ہوا تھا۔ میں اسے اٹھا کر گھر لے آیا، اسے کھول کر دیکھا تو اس میں موتیوں کا ایسا نفیس و قیمتی ہار تھا کہ میں نے آج تک اس جیسا نہیں دیکھا تھا۔ میں باہر نکلا تو دیکھا ایک بوڑھا آدمی اسی کا اعلان کر رہا ہے، اس کے پاس ایک پھٹے پرانے کپڑے میں پانچسو دینار تھے اور وہ یہ آواز لگا رہا تھا۔''موتیوں کی تھیلی واپس کرنے والے کو یہ رقم انعام میں دی جائے گی۔'' میں نے دل میں کہا میں ضرورت مند اور بھوکا ہوں کیوں نہ ان اشرفیوں کو لے کر کام میں لاؤں اور اس کو تھیلی واپس کر دوں۔

میں نے اس سے کہا، میرے پاس آیئے۔ میں اس کو لے کر گھر پہنچا۔ اس نے ہر چیز کی نشانی بتائی۔ تھیلی کیسی ہے، پھُندنا کیسا ہے، موتی کس طرح کے ہیں اور کتنے ہیں اور یہ کہ جس دھاگے سے باندھا گیا ہے وہ کیسا ہے؟ علامت صحیح پا کر میں نے تھیلی نکال کر اسے دے دی۔ اس

نے پانچسو دینار میرے آگے کر دیئے، مگر اس وقت میری عجیب حالت ہوئی۔ میں نے لینے سے نکار کر دیا، میں نے کہا یہ میرا فرض تھا کہ میں آپ کو لوٹاؤں۔ میں اس پر کوئی بدلہ نہیں چاہتا! اُس نے کہا، یہ آپ کو لینے پڑیں گے اور بہت ہی اصرار کیا، لیکن میں تیار نہیں ہوا، آخر وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ اِدھر میرا قصہ یہ ہوا کہ میں مجبور ہو کر مکہ سے نکلا اور بحری سفر شروع کر دیا۔ اتفاق سے راستے میں کشتی ٹوٹ گئی، اور مسافر ڈوب گئے اور ان کا سامان ضائع ہو گیا تنہا ایک میں تھا جو کشتی کے اک ٹکڑے پر زندہ بچا رہا۔ عرصہ تک سمندر میں تیرتا رہا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ خدا خدا کر کے ایک جزیرے میں پہنچا، جہاں کچھ لوگ آباد تھے۔ میں ایک مسجد میں جا کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے مجھے قرآن پڑھتے دیکھا تو جزیرہ کا کوئی شخص ایسا نہ بچا جس نے میرے پاس آ کر یہ نہ کہا ہو کہ "آپ ہمیں قرآن پاک پڑھا دیجئے" اس طرح مجھے ان لوگوں سے ڈھیروں مال حاصل ہوا۔

کچھ دن بعد میں نے اس مسجد میں قرآنِ پاک کے چند بوسیدہ اوراق رکھے ہوئے دیکھے۔ میں انہیں اٹھا کر پڑھنے لگا، انہوں نے پوچھا: "آپ خوشنویسی بھی جانتے ہیں؟" میں نے کہا، جی ہاں۔ انہوں نے کہا "آپ ہمیں لکھنا سکھا دیجئے۔" غرض وہ اپنے بچوں اور جوانوں کو لے کر آ گئے اور میں انہیں سکھانے لگا۔ اس سے بھی مجھے بہت کافی مال واسباب حاصل ہوا۔

ایک دن وہاں کے لوگوں نے مجھ سے کہا، ہمارے یہاں ایک یتیم بچی ہے اور اس کے پاس مال و متاع بھی کافی موجود ہے، ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس سے شادی کر لیں۔ میں نے منع کر دیا، لیکن وہ میرے پیچھے پڑ گئے اور مجھے ان کی بات ماننی پڑی۔ جب شبِ زفاف میں اُسے لے کر میرے پاس آئے تو میں نظر اُٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی گردن میں بعینہٖ وہی ہار لٹکا ہوا دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔ اب میں صرف اس ہار کو دیکھ رہا تھا۔ لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو کہا: "جناب آپ نے اس یتیم بچی کا دل توڑ دیا۔ آپ اسے دیکھنے کے بجائے ہار دیکھ رہے ہیں۔"

میں نے انہیں ہار کا قصہ سنایا تو سب نے ایک ساتھ نعرہ لگایا اور اتنی زور سے اللہ اکبر کہا کہ تمام جزیرے والوں تک وہ آواز پہنچی۔ میں نے کہا، کیا ہوا؟ انہوں نے کہا، جن بڑے میاں نے تم سے ہار لیا تھا وہ اسی بچی کے باپ تھے۔ وہ کہا کرتے تھے مجھے دنیا میں صرف ایک سچا اور پکا مسلمان ملا اور وہ، وہ تھا جس نے مجھے ہار لوٹایا۔ وہ خدا سے دُعا کرتے تھے، "خدایا مجھے اس سے پھر ملا

دے تاکہ میں اسے اپنی بیٹی بیاہ دوں۔" اور اب وہ آپ کو مل گئی۔

میں ایک مدت تک اس کے ساتھ رہا، اللہ نے مجھے اس سے دو بیٹے بھی دیئے۔ پھر اس کا انتقال ہو گیا اور ہار کا وارث میں اور میرے دونوں لڑکے ہوئے۔ کچھ دنوں بعد بچے بھی اللہ کو پیارے ہو گئے اور ہار تنہا میرے قبضے میں آیا۔ میں نے اسے ایک لاکھ دینار میں فروخت کیا اور یہ جو مال و متاع تم کو نظر آ رہا ہے یہ سب اسی رقم کا باقی ماندہ حصہ ہے۔

(ترغیب المسلمین)

صاحب حضوری شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کا عجیب واقعہ

ایک بزرگ گذرے ہیں حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ مدینہ طیبہ (زادہا اللہ شرفا وکرامۃ) میں رہتے تھے صاحبِ حضوری تھے، صاحبِ حضوری وہ شخص کہلاتا ہے جس کو روزانہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔ کس طریقہ پر ہوتی ہے سوتے میں یا جاگتے میں یہ تو وہی حضرات جانیں۔ ایک روز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا کہ ہندوستان جاؤ، یہ بھی فرمایا کہ غریبانِ ہند پر نظر کرم رکھنا۔ نظرِ شفقت رکھنا، انہوں نے عرض کیا کہ حضور یہاں تو روزانہ حاضری و زیارت کا موقع ملتا ہے ہندوستان سے (کہ اتنی دور ہے) اس کا موقع کیسے میسر آئے گا۔ اس پر حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم کو وہاں سے بھی موقع دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ ہندوستان آئے، دہلی میں قیام کیا، یہاں حدیث شریف کا مشغلہ شروع کیا، تصوف کی بھی بعض کتابیں لکھیں۔ اگر کہیں معلوم ہوتا کہ فلاں جگہ کوئی اللہ اللہ کرنے والا موجود ہے تو اس کی زیارت کے لئے جاتے، ایک روز معلوم ہوا کہ کوئی درویش آیا ہے، بہت لوگ اس کی طرف متوجہ ہیں وہاں بھی یہ تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ ایک فقیر ہے اور اس کے اردگرد مجمع ہے اور اس کے پاس ایک پیالہ شراب کا رکھا ہوا ہے، فقیر نے ان کی طرف دیکھا اور کہا کہ یہ پیالہ شراب کا پی لے۔ انہوں نے انکار کر دیا کہ شراب تو حرام ہے میں نہیں پیوں گا، اس نے بھی کچھ اصرار نہیں کیا اور نہ کچھ اور بات ہوئی، رات کو انہوں نے خواب دیکھا کہ کچھ لوگ چلے جا رہے ہیں، جانے والوں سے پوچھا بھائی کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے بتلایا کہ فلاں مکان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں ان کی زیارت کے لئے جا رہے ہیں۔ اس پر یہ بھی چل دیئے، مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ وہی فقیر ڈنڈا لئے

دروازہ پر کھڑا ہے۔ اس نے اوروں کو تو اندر جانے کی اجازت دے دی مگر انہوں نے جانا چاہا تو ان کے اوپر ڈنڈا اٹھایا اور کہا تو نے شراب کا پیالہ نہیں پیا تھا اس لئے اندر جانے کی اجازت نہیں۔ گھبرا کر آنکھ کھل گئی، چونکہ زبردست عالم تھے حدود شرع کو جانتے تھے فوراً لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم پڑھا۔ سمجھ گئے کہ تلبیسِ ابلیس ہے، شیطانی دھوکہ ہے یعنی شراب پئیں تو زیارت نصیب ہو اور شراب پینے سے انکار کر دیں تو محروم رہیں یہ تلبیسِ ابلیس ہے۔ اگلے روز پھر اس فقیر کے یہاں گئے دیکھا اسی طرح مجمع لگا ہوا ہے اور شراب کا پیالہ رکھا ہوا ہے جیسے ہی یہ پہنچے تو اس نے کہا اب تو پی لے، اس سے یہ سمجھے کہ یا تو اسی کا تصرف تھا رات میں یا پھر اس کا کشف ہے، جواب دیا کہ یہ شعبدے کسی اور کو دکھانا میں نہیں پیوں گا۔ چنانچہ نہیں پی چلے آئے۔ آج رات پھر اسی طرح خواب دیکھا کہ لوگ جا رہے ہیں۔ یہ بھی گئے۔ دیکھا کہ پھر وہی فقیر ڈنڈا لئے کھڑا ہے، ان کو اندر جانے نہیں دیا روک دیا۔ گھبرا کر آنکھ کھل گئی، پھر لاحول پڑھا۔ دن میں پھر اس فقیر کے پاس گئے، اس نے کہا دیکھو دو روز ہو گئے حاضری سے محروم ہو زیارت سے محروم ہو اب تو پی لو۔ انہوں نے فرمایا ساری عمر بھی محروم رہوں گا تو بھی نہیں پیوں گا۔ مجھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کر کے حاضری و زیارت منظور نہیں۔ اگر میں حاضری سے محروم ہوں تو کیا ہوا میری خدمات تو قبول ہیں، یہ میرا انکار کر دینا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں قبول ہے پینا تو مقبول نہیں۔ تیسری رات پھر اسی طرح سے خواب میں دیکھا کہ لوگ جا رہے ہیں یہ بھی گئے تو دیکھا کہ پھر وہی فقیر دروازہ پر ڈنڈا لئے کھڑا ہے اب ان کو بڑا تردد ہوا کہ کمبخت یہاں آ کر کھڑا ہو گیا دروازے پر، اندر جانے نہیں دیتا۔ یہ عجیب بات ہے شراب پی لوں تو اندر جانے کی اجازت ملے نہ پیوں تو اجازت نہ ملے۔ سوچ ہی رہے تھے کیا تدبیر اختیار کروں کہ اندر سے آواز آئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم دریافت فرما رہے ہیں دو روز ہو گئے عبدالحق نہیں آئے جیسے ہی ان کے کان میں یہ آواز پہنچی تو انہوں نے باہر ہی سے کہا کہ حضور میں تو حاضر ہونا چاہتا ہوں مگر یہ فقیر دروازہ پر کھڑا ہے اندر آنے نہیں دیتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کون ہے؟ کیا بات ہے؟ آپ کو بتایا گیا کہ ایک شرابی فقیر ہے جو دروازے پر کھڑا ہے۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا اخسأ یا کلبُ، دور ہو اے کتے۔ حضرت علیؓ بھی وہاں موجود تھے وہ تلوار لے کر اس فقیر کی طرف دوڑے اس پر وہ بھاگا وہاں سے۔ تب راستہ کھلا اور یہ حاضر خدمت

ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عبدالحق دو روز ہو گئے تم کہاں تھے؟ عرض کیا حضور دو روز ہو گئے آتے ہوئے مگر یہ فقیر کہتا ہے کہ شراب پی لو تو اندر جانے کی اجازت ہے، ورنہ نہیں۔ بھلا آپ نے تو شراب کو حرام بتلایا، شراب پینے والے پر لعنت فرمائی میں کیسے پی لیتا۔ آپؐ نے فرمایا تم نے بہت اچھا کیا اور پھر شفقت و مہربانی فرمائی۔ آج جب صبح کو اٹھے تو بہت خوش تھے، دن چڑھے اس فقیر کے یہاں پھر آئے۔ دیکھا مجمع تو موجود ہے اس کے مریدین کا مگر خود موجود نہیں۔ ان سے پوچھا کہ تمہارا پیر کہاں ہے؟ مرید نے کہا اندر کمرہ میں ہیں۔ حضرت شیخ نے دروازہ پر دستک دی تو کوئی جواب نہیں ملا۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو اس میں کوئی نہیں ہے، اس پر لوگوں سے کہا دیکھو وہ تو یہاں نہیں ہے، جب سب نے دیکھا تو تعجب ہوا کہ وہ تو کمرہ کے اندر تھے اور کوئی راستہ بھی کمرہ سے نکلنے کا نہیں پھر گئے تو کہاں گئے؟ اس کے بعد شیخ نے ان سے پوچھا کہ یہاں سے کوئی نکلا بھی ہے؟ بتلایا کہ ہاں ایک کتا تو نکل کر بھاگا تھا۔ اس پر شیخ نے اپنا سارا واقعہ سنایا اور فرمایا وہی تمہارا پیر تھا اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو مسخ کرنا چاہا تھا حق تعالیٰ شانہٗ نے اس کی صورت کو مسخ کر کے کتا بنا دیا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا "دور ہوا ے کتے" جس کو آپ نے کتا فرما دیا وہ پھر انسان کیسے رہتا۔ (ملفوظات فقیہ الامت سے ماخوذ)

علاؤالدین خلجی کی "بلند پروازیاں"

ابتدائی ایام میں جب "علاؤالدین خلجی" کو پے در پے اہم کامیابیاں ہوئیں تو اس کے "طائر ہوس" نے بلند پروازیاں شروع کیں اور اس کے دل میں طرح طرح کی خواہشات گدگدانے لگیں، مثلاً وہ کہتا کہ رسول اکرم کو خدا نے چار یار عطا کئے، جن کی مدد سے انہوں نے شریعت کا آغاز کیا، اگر میں بھی اپنے چار یار یعنی "الماس بیگ، الغ خان ظفر خان' ملک نصرت خان اور سنجر الپ خان" کی مدد سے ایک نئے دین و مذہب کی بنیاد ڈالوں' تو قیامت تک میرا اور میرے ساتھیوں کا نام یادگار رہے گا۔ اس کا دوسرا منصوبہ یہ تھا کہ چونکہ اس کے پاس بے شمار خزانہ ولشکر اور بے اندازہ ہاتھی گھوڑے ہیں' اس لئے چاہئے کہ وہ دہلی کو ایک معتمد درباری کے سپرد کر کے یونان کے بادشاہ اسکندر اعظم کی طرح عالمگیر فتوحات کا آغاز کرے' اسی لئے اس نے خطبہ میں اپنے آپ کو سکندر ثانی کہلوایا' اور سکوں پر بھی یہ لقب کھدوایا۔

بادشاہ کے درباریوں میں سے ایک شخص ملک علاؤالدین علاؤالملک کوتوال دہلی (جو کہ ضیاءالدین برنی کا چچا تھا) بھی تھا ایک دن وہ حسب معمول بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے اپنے دونوں منصوبوں کی نسبت اس سے بھی پوچھا۔

''علاؤالملک'' نے زمین خدمت کو بوسہ دیا اور کہا! بادشاہ سلامت! دین و شریعت کی باتیں انبیاء علیہم السلام سے تعلق رکھتی ہیں' اور نبوت کا انحصار وحی آسمانی پر ہے اور یہ بات حضور رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگئی' سب خاص و عام' چھوٹے بڑے' نزدیک و دور اس کو جانتے ہیں' اگر عام لوگوں کو حضور بادشاہ کے منصوبہ' نبوت کا پتہ چلا تو بادشاہ سے یقیناً بددل ہو جائیں گے' اور ملک میں فساد و بدنظمی پھیل جائے گی' مصلحت ملکی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے بعد سلطان جہاں اس ارادے کو بالکل اپنے صفحہ' دل سے محو کردیں اور پھر کبھی ایسی چیز کا خیال نہ کریں' جواب کسی آدم زاد کو میسر نہیں آسکتی۔

یہ حضور پُرنور پر روشن ہوگا کہ چنگیز خان اور اس کی اولاد نے سالہا سال تک اس امر کی بڑی کوشش کی کہ مذہب اسلام دنیا سے ناپید ہو جائے اور ان کا اپنا دین جو ہزار ہا سال سے ترکستان میں رائج ہے' دنیا میں عام ہو۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا' لیکن ان کی یہ خواہش کسی طرح پوری نہ ہوئی، اور بالآخر ان کی اولاد کے دل میں دینِ متین محمدیؐ کی استواری ذہن نشین ہوئی اور وہ مسلمان ہو گئے اور اسلام کی تقویت کے لئے انہوں نے کفار سے جنگ کی۔

''سلطان علاؤالدین خلجی'' نے بڑی دیر تک ''علاؤالملک'' کے مشورے پر غور و تامل کیا پھر اس سے کہنے لگا جو کچھ تم نے کہا ہے درست اور حقیقت کے مطابق ہے، خدا تمہارے والدین پر صد ہزار رحمت کرے کہ تم نے نمک حلالی سے ایسا مشورہ دیا، آج کے بعد کوئی شخص مجلس میں مجھ سے اس مسئلہ پر کوئی بات نہیں سنے گا۔

پھر بادشاہ نے اپنے دوسرے ارادے یعنی فتح ممالک کی نسبت پوچھا کہ وہ ٹھیک ہے یا ناقص؟ ''علاؤالملک'' نے عرض کیا، ارادہ نیک ہے اور جہاں پناہ کی ہمت عالی کی دلیل، لیکن اس کے متعلق بھی چند امور غور طلب ہیں۔

ایک تو یہ کہ جب جہاں پناہ دہلی چھوڑ کر بیرون ممالک میں جائیں گے تو ہندوستان میں

نیابت کے فرائض کون انجام دے گا؟ اور جب آپ عرصہ دراز کے بعد دہلی واپس آئیں گے تو وہ نائب اپنے عہد و پیمان پر قائم ہوگا یا منحرف ہو جائے گا؟ حضور والا! آج کا زمانہ سکندر کا زمانہ نہیں۔ وہ عہدِ وفا تھا، جس نے کوئی عہد باندھا مرتے دم تک اس پر قائم رہا، پھر سکندر کے پاس ''ارسطو'' جیسا وزیر با تدبیر تھا، جس نے سکندر کی عدم موجودگی میں سب کو مطیع و تابع دار رکھا اور سکندر کی عدم موجودگی میں سلطنت کو محفوظ و دُرست رکھا، اگر حضور کے امراء اس حد تک قابل اعتماد ہیں تو ''حسبی اللہ'' آپ کا ارادہ مبارک۔

بادشاہ نے اس بات پر دیر تک غور وخوض کیا اور کہا! اگر میں ان مشکلات کا خیال کروں تو مجھے گوشۂ دہلی پر قناعت کرنی پڑے گی۔ پھر میرا یہ لاؤ لشکر کس کام آئے گا اور میرے نام کی شہرت کس طرح ہوگی؟ ''علاؤالملک'' نے پھر پتے کی بات کی اور عرض کیا کہ ابھی جہاں پناہ کو دو مہمیں اس طرح کی درپیش ہیں کہ تمام خزانے ان کے لیے درکار ہوں گے' ایک تو تمام ممالک ہندوستان کی تسخیر اور وسطی ہندوستان کے بعض قلعوں مثلاً رنتھنبور' چتوڑ' چاندیری' وغیرہ اور مشرقی سمت دریائے شور' اور شمال میں 'طمغان' و کابل تک سب علاقوں کی فتح۔ دوسرے مغلوں کا سدّ باب، یعنی دیپال پور اور ملتان اور اس طرح کے دوسرے جو قلعے ان کے راستے میں ہیں ان کا مکمل استحکام' جب دونوں مہمیں بخیر وخوبی سرانجام پا جائیں گی تب بادشاہ سلامت کے لیے ممکن ہوگا کہ خود بدولت تو دہلی میں قیام کریں اور امرائے معتمد کو آراستہ فوجوں کے ساتھ اطراف واکناف میں روانہ کریں تا کہ دور دور کے ممالک کو فتح کر کے حضور کا نام جہانگیری روشن کریں' لیکن یہ سب کچھ اسی صورت ہوگا جب بادشاہ سلامت کثرت شراب نوشی' سیر وشکار' اور عیش وعشرت سے دست بردار ہو جائیں گے۔

سلطان علاؤالدین یہ باتیں سن کر بہت خوش ہوا۔ ''علاؤالملک'' کی رائے صائب اور تدبر کی تعریف کی اُسے دو گاؤں' گھوڑے اور بے شمار زر و جواہر انعام دیا۔

(آب کوثر از شیخ محمد اکرم بحوالہ ضیاء الدین برنی)

آصف خاں کی طرف سے شاہ جہان کی دعوت

امراء جب بادشاہوں کو اپنے یہاں مدعو کرتے تو وہی شان وشوکت دکھاتے جو درباروں میں ہوا کرتی تھی، ''اعتمادالدولہ'' نے جہانگیر کو اپنے ہاں مدعو کیا تو جہانگیر کی رہ گذر کو طرح طرح کے

فانوسوں سے روشن کیا اور جو نذرانے پیش کئے، ان میں ایک سونے کا تخت بھی تھا جو تین سال کی مدت میں ساڑھے چار لاکھ روپے میں تیار ہوا تھا۔

عہد جہانگیری میں آصف خان نے برطانوی سفیر کو جو دعوت دی اس کا ذکر ''ایڈور ڈیٹری'' نے اس طرح کیا ہے۔ سفیر کی دعوت ایک بہت بڑے اور خوبصورت خیمے میں کی گئی' خیمہ خوشگوار قسم کی خوشبوئیات سے معطر کیا گیا تھا' چاندی اور سونے کے برتنوں میں کھانا پیش کیا گیا جو تقریباً ستر اقسام پر مشتمل تھا' اور نہایت لذیذ تھا...... یہ دعوت روم کی مشہور ''اپی کیور'' کی دعوت سے یقیناً بہتر کہی جا سکتی ہے۔ جو اپنی بھوک رفع کرنے کے لئے زمین' ہوا' اور سمندر کی تمام چیزیں فراہم کرنے کا عادی تھا۔

نور جہاں کا بھائی آصف خان اپنے محل میں شہزادوں اور شہزادیوں کی دعوت کرتا تو ان کے استقبال اور دعوت میں جتنا زیادہ تکلف ممکن ہوتا وہ کیا کرتا۔ اسی زمانہ میں ایک فرنگی سیاح ''ایف۔ ایس منریق'' لکھتا ہے کہ:

میں نے پہرہ دار کی سازش سے اس محل کے اندر چھپ کر ایک ضیافت کو دیکھنے کی کوشش کی' آصف خان نے شاہجہان کو اپنے زنان خانے میں مدعو کیا' تو جس وسیع ایوان میں اس نے یہ دعوت کی' اس کے فرش کو زرنگار قالین سے آراستہ کیا' چاندی کی انگیٹھیوں میں جا بجا عنبر اور دوسری خوشبودار چیزیں جلائی جا رہی تھیں' تمام فضا معطر تھی' مرصع اور زریں برتنوں سے پورا ایوان جگمگا رہا تھا' ایوان میں داخل ہونے کے راستے میں ایک چاندی کی بڑی مچھلی آویزاں تھی۔ اس کے منہ سے سات معطر فوارے چھوٹ رہے تھے۔

جب شاہجہان ایوان میں داخل ہوا' تو بغلی کمروں سے سرود و نغمہ کی آوازیں بلند ہوئیں' شاہجہان کے آگے آگے شہزادیاں تھیں' جو سونے اور چاندی کے کام والے زرق برق لباس پہنے ہوئے تھیں۔ ان کے گلوں اور سروں پر سونے اور موتیوں کے ہار جگمگا رہے تھے، دائیں طرف اس کی خوش دامن' اور بائیں طرف اس کی چہیتی بیگم ''ممتاز محل'' تھیں۔

اس کے پیچھے دارا شکوہ اور آصف خان تھے' شاہجہان زرنگار مسند پر آ کر بیٹھ گیا' اس کے بیٹھتے ہی دو حسین عورتیں ''مورچھل'' ہلانے لگ گئیں' اس کے فوراً بعد آصف خان کے گھر والے

خود شاہجہان کے شہزادے اور شہزادیاں آگے بڑھیں اور جھک کر کورنش اور چہار تسلیمات بجالائیں۔

شاہجہان اپنی خوش دامن کے ساتھ نہایت تواضع سے پیش آیا اور اسے اپنے دائیں جانب بٹھایا۔

دوسروں کو بھی بیٹھنے کے لئے کہا، پہلی اور دوسری بار کہنے پر وہ سب کھڑے رہے، لیکن جب تیسری بار ان سے بیٹھنے کو کہا تو وہ ادب سے بیٹھ گئے، ان کے بیٹھتے ہی نہایت شیریں نغموں کی آوازیں آنی شروع ہوئیں، ان نغموں میں بادشاہ کے جنگی کارنامے بیان کئے جارہے تھے۔

بعد میں چار حسین لڑکیاں داخل ہوئیں جو آصف خان کے خاندان کی تھیں، اور اپنے حسن وجمال میں کسی جگہ کی بھی حسین عورتوں سے کم نہ تھیں، وہ نہایت ادب سے بادشاہ کی طرف بڑھیں۔ ان میں سے ایک نے اس کے سامنے سفید ساٹن کا ایک کپڑا بچھایا، دوسری نے ایک خوبصورت "طلائی سیلانچی" سامنے رکھی، جس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ تیسری نے اسی قسم کے جواہرات سے مرصع طلائی برتن سے ہاتھ دھلائے، اور چوتھی نے ہاتھ پونچھنے کے لئے تولیہ پیش کیا۔

ان چاروں کے بعد بارہ عورتیں داخل ہوئیں، جو پہلی چار لڑکیوں کی طرح تو معزز نہ تھیں لیکن تہذیب میں کم بھی نہ تھیں، انہوں نے شہزادوں، اور شہزادیوں کے ہاتھ اسی طرح دھلائے، اتنے میں کھانا دوسرے دروازے سے آنا شروع ہوا، تو طرح طرح کے نغمے بھی تیز ہونے لگے۔ خواجہ سرا سونے کے برتنوں میں کھانا لا رہے تھے۔ ان خواجہ سراؤں کا لباس اعلیٰ اور معطر تھا چار خواجہ سرا کھانا لا کر دو خواجہ سراؤں کو دیتے پھر یہ دو خواجہ سرا ان دو حسین عورتوں کو جو بادشاہ کے پاس کھڑی رہتیں، یہ برتن دے دیتے، وہ دونوں عورتیں گھٹنے ٹیک کر بادشاہ کے سامنے رکھتیں۔

دستر خوان پر روٹیوں اور مٹھائیوں کی بہت سی قسمیں تھیں، کھانے کے بعد رقص ہوا، پھر نذرانے پیش ہوئے جن میں طرح طرح کے جواہرات تھے۔

(ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے از صباح الدین عبدالرحمان)

مرزا عبدالرحیم خانِ خاناں کے "انعامات"

خانِ خاناں مرزا عبدالرحیم دربار شاہی سے رخصت ہو کر برہان پور کی طرف روانہ ہوئے۔ پہلی ہی منزل پر ڈیرہ لگایا، شام کو مصاحبوں اور ملازموں کے ساتھ دربار لگائے بیٹھے تھے کہ ایک آدمی سامنے سے گزرا، اور پکار کر یہ کہا ؎

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

منعم خاں ان کا خطاب بھی ہو چکا تھا' (یہ برموقعہ شعر سن کر) خزانچی کو حکم دیا کہ اسے ایک لاکھ روپیہ دے دو۔ وہ دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ دوسری منزل پر اسی وقت وہ پھر آیا اور وہی شعر پڑھا' انہوں نے پھر کہہ دیا کہ لاکھ روپیہ دے دو' غرض وہ سات دن برابر اس طرح آتا رہا اور یہ اسے ایک لاکھ دیتے رہے۔

پھر یہ سوچ کر کہ زیادہ لالچ اچھی نہیں' خدا جانے کس وقت یہ امیر آدمی خفا ہو کر سب کچھ نہ چھین لے وہ نہ آیا' آٹھویں دن خان خاناں پھر اسی طرح دربار لگا کر بیٹھا' معمول سے زیادہ وقت گزارا' دربار برخاست نہ کیا' شام ہوئی تو کہنے لگے "آج وہ ہمارا فقیر نہیں آیا" برہان پور آگرہ سے ستائیس منزل دور ہے' ہم نے تو پہلے ہی دن ستائیس لاکھ روپیہ خزانے سے نکلوا لیا تھا' تنگ حوصلہ تھا' خدا جانے دل میں کیا سمجھا۔ (دربار اکبری از مولانا محمد حسین آزاد)

"خان خاناں" جب فتح یاب ہو کر واپس آئے تو بادشاہ کے لیے بہت سی عجیب و غریب اور نفیس چیزیں خاندیس و دکن اور ممالکِ فرنگ سے لے آئے، ان میں ایک عجیب تحفہ یہ تھا کہ "رائے سنگھ جھالا" علاقہ گجرات کے راجہ کو حاضر کیا۔

معلوم ہوا کہ راجہ نوجوانی کے عالم میں براُت لے کر خوشی کے نقارے بجاتا ہوا واپس آ رہا تھا راستے میں "جسا راجہ کچھ" کے بھائی کے ملک سے گزر ہوا' براُت محلوں کے پاس پہنچی تو پیام آیا کہ نقارے نہ بجاؤ اور جلدی سے دور نکل جاؤ اور اگر نہیں تو پھر مردِ میدان بنو تلوار نکالو اور جنگ کرو۔

اگرچہ سامانِ جنگ ساتھ نہیں تھا' پھر بھی راجپوت خون نے جوش مارا اور دولہا جہاں تھا وہیں تلوار نکال کر کھڑا ہو گیا "جسا" جھٹ فوج لے کر آیا۔ بڑا کشت و خون ہوا' وہ اور اس کا بھائی راؤ صاحب دونوں مارے گئے' ایسا بھاری رن پڑا کہ کسی کو کسی کی خبر نہ رہی' دولہا بھی زخمی ہو کر گر پڑا' کسی نے کسی کو نہ پہچانا کہ کس کی لاش کہاں رہی۔

دولہا بہت زخمی ہوا تھا' لیکن ابھی سانس باقی تھے، اتفاق سے رات کو کوئی جوگی ادھر آیا، زندہ دیکھ کر اپنے پاس لے گیا۔ مرہم پٹی کی، خدا نے بچا لیا۔ احسان کا بندہ' اس کا چیلا ہو گیا۔ انیس

برس اسی کی خدمت کرتا اور جنگلوں میں پھرتا رہا' گھر میں سب کا یہی خیال تھا کہ میدانِ جنگ میں کام آ گیا۔ کئی رانیاں ''ستی'' ہو گئیں۔ دلہن رانی کو کسی طور اس کے مرنے کا یقین نہیں تھا اس لیے رانی دل کے ''ست'' اور راجہ کے خیال میں انیس برس خدا کو یاد کرتی اور روتی رہی۔

''خان خاناں'' امیر و فقیر سب کے یار تھے' ان کے دربار میں فقیر' امیر' جوگی' سبھی برابر تھے۔ جوگی کے درشن ہوئے' تمام حالات اس سے معلوم ہوئے تو گورو اور چیلے دونوں کو دربار میں لے آئے۔ اکبر بھی ایسے معاملات کے مشتاق رہتے تھے، اس عجیب واردات کو سن کر حیران ہوئے اور راجہ کو اعزاز و اکرام کے ساتھ اس کے ملک روانہ کیا۔ کل کا چیلا آج پھر راجہ بن گیا' اپنے ملک پہنچے تو وہ جشن برپا ہوا کہ سبحان اللہ۔ سب سے زیادہ رانی خوش ہوئی کہ بے زبان بن کر اس کی یاد میں وقت گزار رہی تھی' دیکھو رسم کا ''ست'' تو مار چکا تھا، محبت کا ''ست'' کام کر گیا۔

(دربارِ اکبری از مولانا محمد حسین آزاد)

''خان خاناں مرزا عبدالرحیم خان'' دربار جا رہے تھے، ایک مصور نے اپنی ایک تصویر لا کر پیش کی' (جس میں دکھایا گیا تھا) کہ ایک صاحبِ جمال عورت نہا کر کرسی پر بیٹھی ہے' ایک طرف جھک کر سر کے بال جھٹک رہی ہے' لونڈی پاؤں دھلا رہی ہے اور ''چھانواں'' کر رہی ہے۔

''خان خاناں'' اسے دیکھتے ہوئے دربار میں چلے گئے' واپس آ کر حکم دیا کہ اس مصور کو بلاؤ اور پانچ ہزار روپیہ دے دو۔

مصور نے عرض کی، انعام تو فدوی جبھی لے گا کہ جو بات حضور قابلِ انعام خیال فرماتے ہیں' وہ ارشاد فرما دیں۔

سب مصاحب متوجہ ہو گئے۔ خان خاناں نے کہا کہ اس کی مسکراہٹ اور چہرہ کا انداز دیکھا؟

سب نے کہا دیکھا۔ بہت خوب' بہت زیبا۔

''خان خاناں'' نے کہا' پاؤں کی طرف دیکھو (دراصل) اسے گدگدی ہو رہی ہے' اس نزاکت و لطافت پر پانچ ہزار کی کیا حقیقت پانچ لاکھ بھی تھوڑا ہے۔

مصور نے کہا بس حضور! میں نے انعام پا لیا اور میں آپ کا غلام ہو گیا، ہم لوگ قدر شناس

کے غلام ہیں۔ میں اپنی یہ تصویر تمام امیروں کے پاس لے کر پھرتا رہا' سوائے آپ کے یہ نکتہ کسی نے نہیں پایا۔
(دربار اکبری از مولانا محمد حسین آزاد)

''خان خاناں'' نہایت حسین تھا' اس کی خوبیاں اور محبوبیاں سن کر ایک عورت کو اشتیاق پیدا ہوا' وہ بھی حسین تھی اس نے اپنی تصویر کھنچوائی اور ایک بڑھیا کے ہاتھ اس کے پاس بھجوائی، وہ خلوت میں آ کر ''خان خاناں'' سے ملی اور مطلب کو اس پیرایہ میں ادا کیا کہ ایک بیگم کی یہ تصویر ہے، انہوں نے پیغام دیا ہے کہ آپ کی خوبیاں سن سن کر میرا جی بہت خوش ہوتا ہے، ارمان یہ ہے کہ آپ جیسا ایک فرزند میرے ہاں پیدا ہو جو بادشاہ کی آنکھیں ہو زبان ہو اور دست و بازو ہو۔

خان خاناں نے کچھ سوچ کر کہا ''تم میری طرف سے انہیں کہنا، یہ بات کچھ مشکل نہیں' مگر خدا جانے اولاد ہو یا نہ ہو اور ہو تو کیا خبر ہے بیٹا ہی ہو اور وہ زندہ بھی رہے۔ پھر خدا جانے ایسی صورت ہو یا نہ ہو' یہ بھی ہو تو اقبال مندی پر کس کا زور ہے۔ خدا چاہے دے خدا چاہے نہ دے' اگر انہیں مجھ جیسے بیٹے کی آرزو ہے تو کہنا تم ماں میں بیٹا' خدا کا شکر کرو' جس نے پلا پلایا بیٹا تمہیں دے دیا' اپنی ماں کو جس قدر روپیہ دیتا ہوں وہی تمہیں بھی بھیجا کروں گا۔

(دربار اکبری از مولانا محمد حسین آزاد)

ایک شخص ''خان خاناں'' کے پاس آیا اور یہ قطعہ لکھ کر دیا۔

اے خانِ جہاں خانِ خاناں
دارم صنمے کہ رشک چین است
گر جاں طلبد مضائقہ نیست
زر مے طلبد سخن درین است

ترجمہ:۔ ''اے خان خاناں' خانِ جہاں' میری ایک محبوبہ ہے جو بہت خوبصورت ہے' وہ اگر میری جان مانگے حاضر ہے' لیکن وہ دولت مانگتی ہے' مشکل یہی ہے۔

''خان خاناں'' نے اس سے پوچھا' وہ کیا مانگتے ہیں؟

اس نے کہا ایک لاکھ روپے

حکم دیا، سوا لاکھ دے دو!!

(دربار اکبری از مولانا محمد حسین آزاد)

ایک دن "خان خاناں مرزا عبدالرحیم" سواری سے اتر رہے تھے' ایک بڑھیا سامنے آئی اور اپنی بغل سے "توا" نکال کر اس کے بدن سے ملنے لگی' نوکر اسے پکڑنے کے لیے دوڑے' انہوں نے سب کو روک دیا اور حکم دیا "اس توے کے برابر سونا تول کر اسے دے دو"

مصاحبوں نے سبب پوچھا

مقدمہ کوتوال سے ہو کر اکبر کے پاس جا پہنچا۔ دربار میں جا کر ایک بھائی کی بیوی نے کہا "حضور! میرے والی کا دس برس کا بیٹا مر گیا تھا' اسے بیٹے کے مرنے کا بہت صدمہ تھا۔ اس لاش کا سینہ چیر کر دیکھئے اگر اس کے جگر پر داغ ہو یا سوراخ ہو تو جانئے وہی ہے' لیکن اگر نہیں تو پھر وہ نہیں۔

اسی وقت اس کی چھاتی کو چاک کر کے دیکھا گیا تو سوراخ موجود تھا' اکبر حیران رہ گیا اور کہنے لگے! بزرگ کہا کرتے تھے بادشاہ اور اس کے امیر "پارس" ہوتے ہیں۔ (جن سے اگر لوہا بھی لگ جائے سونا بن جاتا ہے) یہ دیکھنے آئی تھی کہ یہ بات سچ ہے یا نہیں اور کیا اب بھی ویسے لوگ ہیں یا کوئی نہیں رہا۔

ایک دفعہ "خان خاناں" کے دربار میں ایک سوار سپاہ گری کے ہتھیار لگائے سامنے آیا اور سلام کیا۔ انہوں نے کام پوچھا۔

اس نے کہا نوکری چاہتا ہوں۔ بانک پن کا یہ عالم کہ پگڑی میں دو میخیں بھی باندھی ہوئی تھیں۔ ان کے متعلق پوچھا۔

اس نے عرض کی ایک میخ تو اس کے واسطے کہ نوکر رکھے اور تنخواہ نہ دے' دوسری اس نوکر کے واسطے کہ تنخواہ لے اور کام چوری کرے۔

"خان خاناں" نے تنخواہ مقرر کی اور اس سے پوچھا کہ انسان کی زیادہ سے زیادہ عمر ہو تو کتنی ہو؟

اس نے کہا عمر طبعی **120** برس کی ہوتی ہے۔

انہوں نے خزانچی کو حکم دیا کہ سپاہی کی عمر بھر کی تنخواہ بے باق کر دو' اور اس سے کہا لیجئے حضرت! ایک میخ کا بوجھ تو سر سے اتار دیجئے۔ دوسری کا آپ کو اختیار ہے۔

(دربار اکبری از مولانا محمد حسین آزاد)

''نواح اکبرآباد'' میں ایک بغاوت دبانے کے لیے اکبر نے فوج بھیجی' وہاں لڑائی ہوئی' بادشاہی لشکر میں دو جڑواں کھتری بھائی بالکل ہم شکل تھے۔ لڑائی کے دوران ایک بھائی مارا گیا' چونکہ لڑائی جاری تھی اس لیے دوسرا بھائی میدانِ جنگ میں رہ گیا' جب مقتول کی لاش گھر واپس آئی تو دونوں بھائیوں کی بیویاں ''ستی'' ہونے کو تیار ہوگئیں۔ یہ کہتی میرا شوہر ہے' وہ کہتی میرا شوہر ہے۔ کہا ''سچی تم ہو اور جلنے نہ جلنے کا اختیار بھی تمہیں ہے۔'' (دربار اکبری از مولانا محمد حسین آزاد)

ایک دن ''اکبر'' فوج کا معائنہ کر رہا تھا' دو راجپوت نوکری کے لیے سامنے آئے' اکبر کی زبان سے نکلا'' کچھ بہادری دکھاؤ گے؟''

ان میں سے ایک نے اپنی برچھی کی ''بوڑی'' اتار کر پھینک دی' اور دوسرے کی برچھی کی ''بھال'' اس پر چڑھا دی۔ تلواریں سونت لیں' برچھی کی انیاں سینوں پر لیں اور گھوڑوں کو ایڑیاں لگا دیں' بے خبر گھوڑے چمک کر آگے بڑھے' دونوں بہادر چھد کر بیچ میں آن ملے' اس نے اس کے تلوار کا ہاتھ مارا اس نے اس کے' دونوں وہیں کٹ کر ڈھیر ہوگئے اور دیکھنے والے حیران رہ گئے۔

''اکبر'' کو بھی یہ دیکھ کر جوش آیا اور حکم دیا کہ تلوار کا قبضہ دیوار میں خوب مضبوطی سے اس طرح گاڑو کہ اس کی نوک باہر نکلی رہے' پھر تلوار کی نوک پر اپنا سینہ رکھ کر چاہتا تھا کہ زور لگائے کہ یہ دیکھ کر راجہ مان سنگھ دوڑ کر بادشاہ سے لپٹ گیا اور گتھم گتھا ہو کر بادشاہ کو ایک طرف ہٹا دیا' اس کشتم کشتا میں ان کے ہاتھ میں زخم بھی آ گیا۔ (دربار اکبری از مولانا محمد حسین آزاد)

حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے گورنر کا کھانا ٹھکرا دیا

حضرت لاہوریؒ کو ایک مرتبہ گورنر مغربی پاکستان امیر محمد خاں کے لڑکے کی شادی پر بلایا گیا حضرت فرماتے تھے کہ مجھے اتنی سخت پریشانی کبھی نہیں ہوئی جتنی اب ہوئی' کیونکہ گورنر کچھ کھلائے گا اور دے گا میں کچھ نہ کھاؤں گا اور نہ لوں گا لیکن خدا کی قدرت کہ جب نکاح کے بعد سب کھانے کے کمرے میں چلے گئے تو (حضرت لاہوریؒ فرماتے تھے کہ) میں کمرے میں علیحدہ رہ گیا اور دوسرے دروازے سے نکل کر کار میں بیٹھ کر گھر آ گیا نہ انہیں اصرار کرنا پڑا اور نہ مجھے انکار'' اور حضرت ''اس واقعہ کو بیان فرما کر بہت خوش ہوئے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے ان کا کھانا کھانے سے محفوظ رکھا۔

جب اللہ کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے

حضرت لاہوریؒ نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے تو اللہ ضرور دیتے ہیں پھر ارشاد فرمایا۔

تھوڑے دن ہوئے کہ مجھے ایک تانگے میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا اس بوڑھے تانگے والے نے بتایا کہ ''میں بے نماز تھا' دہلی میں اپنے تانگے میں مولانا الیاسؒ، مفتی کفایت اللہؒ مولانا احمد سعیدؒ کو بٹھایا کرتا تھا ایک دفعہ مولانا محمد الیاسؒ (بانی تبلیغ جماعت) نے مجھ سے پوچھا کہ تم نماز پڑھتے ہو؟ میں نے نفی میں جواب دیا تو انہوں نے مجھے نماز پڑھائی اور سکھائی اس کے بعد سے میں پکا پانچ وقت کا نمازی ہوں اس نے مجھے اپنا واقعہ سنایا کہ میں ایک بوڑھی عورت کو سٹیشن سے بٹھا کر مزنگ کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں دو آدمی ملے وہ بھی مزنگ جانا چاہتے تھے اس عورت نے انہیں بھی بٹھانے کو کہا میں نے انہیں بٹھا لیا راستے میں عورت اتری اور کہا کہ میرے سامان کو ساتھ گلی میں پہنچا دو میں سامان لے کر اس کے مکان تک پہنچا آ کر دیکھا تو تانگہ غائب تھا' تھانے گیا تو کوئی رپورٹ نہ لکھے آخر اللہ تعالیٰ کے دروازے (مسجد) میں آیا اور گڑگڑا کر دعا کی دوسرے دن ایک اور تانگے والے کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا اور وہ دونوں آدمی پکڑ لئے گئے اور اس طرح میرا تانگہ بھی برآمد ہوا' پولیس کہنے لگی تو نے رپورٹ کیوں نہیں لکھوائی؟ میں نے کہا کہ'' آج جس کے پاس پیسے ہیں وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے چونکہ میرے پاس پیسے نہیں تھے اس لئے میں تھانے نہیں گیا' میں نے اللہ کا دروازہ کھٹکھٹایا' اللہ تعالیٰ نے سن لی۔''

استغناء کی تلوار

حضرۃ الامام لاہوریؒ اللہ کے سچے بندے' عاشق زار' وفادار اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلص جانثار تھے دنیا سے کنارہ کش اور بے زار تھے مولانا انور نے کتنا دلچسپ واقعہ سنایا کہ:

حضرت رحمۃ اللہ علیہ ایک واحد مثال ہے چودہ مرتبہ حج نصیب ہوا حلال مال حلال راستوں میں لگایا مسجدیں بنوائیں اور غرباء پر خرچ کرتے رہے اگر وہ چاہتے تو مجھے لندن میں بھی تعلیم دلوا سکتے تھے چار دفعہ مجھے حج کروایا ایک دفعہ بھی لندن کی سیر نہیں کرائی نہ کوٹھی بنائی نہ کار لی ایک اللہ کا بندہ جرمنی سے نئی کار لے کر آیا اور حضرتؒ کو پیش کی اور عرض کیا کہ اس کار کی مرمت پٹرول

کا خرچ اور ڈرائیور کی تنخواہ میرے ذمے، آپ اس کو قبول فرمالیں حضرتؒ نے کار لینے سے انکار فرمادیا، فرمایا کرتے تھے کہ دنیاداروں کی غرور کی گردن کو کاٹنے کے لئے میں نے استغناء سے تیز دھار آلہ نہیں دیکھا۔

(ساعتے بااولیاء)

حیات امیر شریعتؒ کی چند جھلکیاں

امیر شریعتؒ کی اپنے ’’قاتل‘‘ سے ملاقات

حالات کی پیشانی شکن آلود تھی، فضاؤں میں انتقامی ارادوں کے تیور ہنوز سرخ تھے کہ امرتسر میں راجندر سنگھ آتش سے پھر ملاقات ہوگئی۔ اس نے امیر شریعتؒ سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا' لیکن میں اسے طرح دے گیا۔ آخر جب اس کا اصرار بڑھا تو میں اسے امیر شریعتؒ کے مکان پر لے گیا۔ قاتل اور مقتول کا آمنا سامنا ہونے سے پیشتر میں نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اپنی تسلی کے لئے راجندر سنگھ کے جسم کو ہاتھ اور نگاہوں سے کنگھال ڈالا' جس پر وہ مسکرایا۔ اس کی یہ مسکراہٹ میرے شبہ پر طنز تھی۔

’’لباس اور جسم کی تلاش میں اب کیا رکھا ہے جانباز! دل اور آنکھوں میں دیکھو' جن میں ندامت کے کس قدر آنسو ہیں' جو شاہ جی کی بھینٹ کرنے آیا ہوں۔ میں اپنے پرماتما کی سوگند کھا کر کہہ رہا ہوں کہ میرے پاپ مجھے پچھیا تاپ کے لئے اس عظیم انسان کے چرنوں میں سیس جھکا دینے کے لئے مجبور کر رہے ہیں کہ جس کی زبان نے میری چھری کو کند کر دیا اور میرے ارادوں کو موت آ گئی' ورنہ آج قاتل اور مقتول کا رشتہ ٹوٹ چکا ہوتا۔‘‘

یہ کہتے ہوئے راجندر سنگھ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور میں نے امیر شریعتؒ کے دروازے پر دستک دی۔

’’کون ہے بھائی! اندر آ جاؤ‘‘ یہ امیر شریعتؒ کی آواز تھی، ہم بیٹھک میں چلے گئے۔ امیر شریعتؒ پان بنانے میں مصروف تھے۔

’’یہ آپ کا قاتل ہے شاہ جی!‘‘ میں نے عرض کیا۔ امیر شریعتؒ نے ایک نظر راجندر سنگھ کی طرف دیکھ کر فرمایا ’’ہاں بھائی! ایسے ہی لوگ میرے قاتل ہوتے ہیں‘‘۔ میں نے اپنے فقرے کو

دوبارہ ذرا وضاحت سے دہرایا تو سنبھل کر بیٹھ گئے اور متعجب ہو کر سوال کیا: ''کیا مطلب؟''

''یہ راجندر سنگھ آتش ہے، یہ آپ کے حالیہ سفر میں مرزائیوں کی طرف سے آپ کے قتل پر مامور کیا گیا تھا۔''

''اچھا..... کیوں بابو! یہ درست ہے؟''

''ہاں شاہ صاحب!''

''تو پھر کون سی چیز مانع رہی؟''

''یہ میں نہیں جانتا شاہ صاحب! مگر آپ کے طرز تکلم نے مجھے اس گناہ سے بچائے رکھا۔'' اس پر امیر شریعتؒ نے زور سے قہقہہ لگایا اور راجندر سنگھ کو مخاطب کر کے کہا:

''میرا طرزِ تکلم مجھے کیا بچا سکتا ہے بابو! موت اور زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ یاد رکھو، جو رات قبر کی ہے وہ باہر نہیں آسکتی، اور جس رات کو باہر آنا ہے، اسے دنیا کی کوئی طاقت قبر کے سپرد نہیں کر سکتی۔ البتہ تمہیں میری نصیحت ہے کہ بحیثیت انسان ہمیشہ انسان کی بھلائی کے لئے سوچا کرو۔ دولت ہاتھ کی میل ہے بابو! اس کے لالچ میں اگر تم مجھے قتل بھی کر دیتے اور میرے قتل کے الزام سے تمہارا دامن محفوظ بھی رہتا تو کسی دوسرے موقع پر بغیر جرم کے مارے جاتے..... خیر!''

امیر شریعتؒ پھر مسکرائے اور قرآن کریم کی چند آیات کا ترجمہ سناتے رہے کہ اتنے میں چائے آگئی۔ راجندر امیر شریعتؒ کی گفتگو اور قرآن عزیز کے لفظوں میں اپنے ماضی پر غور کرتا ہوا بے اختیار رونے لگ پڑا اور روتا ہوا امیر شریعتؒ کے قدموں میں گر پڑا۔

''اپنے رب کے سامنے گرو جو تمہیں معاف کرے۔ میں تمہارا چاکر ہوں بابو! چائے پیو''

امیر شریعتؒ اور راجندر سنگھ آتش کے درمیان یہ ملاقات مغرب کی نماز تک رہی۔

(حیات امیر شریعتؒ، جانباز مرزا)

......☆......

شاہ جیؒ کے ہاتھوں قانون کی شکست

سیاسیات کی بادِ سموم کے باعث ہندوستان کی فضا نے اس قدر گرمی پیدا کر دی تھی کہ جس دل و دماغ میں احساس کی آگ جل رہی تھی، اس کے لئے گوشہ تنہائی میں بیٹھنا دشوار ہو گیا تھا۔

چنانچہ ان دنوں اتحادی اور محوری فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے صف آراء تھیں۔ اقوام یورپ کی اس جنگ نے ایشیا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۴۰ء کو کانگریس نے اس لڑائی کے خلاف انفرادی ستیہ گرہ شروع کیا تو ہندوستان میں ڈیفنس رولز آف انڈیا ایسے ہنگامی قوانین کا نفاذ ہو چکا تھا۔ محب وطن لوگ جیل خانوں میں مقفل کر دیئے گئے۔

امیر شریعتؒ نے انہی دنوں انگریز کے خلاف جلتے ہوئے دلوں کی بھٹیوں میں جذبات و نفرت کا ایندھن بھرا، وہ ہندوستان کے ہر کوچہ بازار میں گئے اور لاکھوں انسانوں کے اجتماع سے خطاب کیا۔

پنجاب میں سر سکندر حیات خاں کی فوجی حکومت برطانوی سامراج کے دشمن سے شکست کھا چکی تھی۔ قانون اپنی پوری گرفت کے باوجود امیر شریعتؒ تک نہ پہنچ سکا۔ لیکن امیر شریعتؒ مجلس احرار کی جنگ (جنگ عظیم) کے خلاف تحریک کی بڑی بے باکی اور چابکدستی سے سارے ہندوستان میں راہنمائی کرتے رہے۔ حکومت کی پوری مشینری ان کے تعاقب میں رہی۔ امیر شریعتؒ اپنے رضا کاروں کو فوجی بھرتی کے خلاف سول نافرمانی پر اُکساتے رہے۔ گاؤں، قصبات اور شہروں کے ہزاروں عوام اس تحریک کے تحت جیل خانوں میں گئے۔ ملتان اور مظفر گڑھ کا ضلع خصوصیت کے ساتھ اس تحریک سے براہ راست بہت متاثر ہوا۔

جاپان جنگ میں شریک ہو چکا تھا اور دوسری طرف جرمن فوجیں جنرل رومیل کی کمان میں سکندریہ کے ساحل تک بڑھ آئی تھیں۔ اتنے میں ۱۹۴۲ء کی عمر کا جام لبریز ہو گیا اور ۱۹۴۳ء کی شعاعوں نے آگے بڑھ کر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔

اپنے ماضی کی طرح ہندوستان ان دنوں بھی سیاسی طور پر دو دھڑوں میں منقسم تھا۔ رجعت پسند انگریزی حکومت کے معاون تھے، اور انتہا پسند گروہ اس موقع کو غنیمت جان کر غیر ملکی حکومت کے خلاف بغاوت کو اپنا دین سمجھتا تھا۔ چنانچہ اول الذکر گروہ فوجی بھرتی کے لئے گاؤں گاؤں گھوم کر پھر سادہ لوح عوام کو انگریزی اقتدار کی بقاء اور دوسری جنگ عظیم کی آگ میں جھونکنے کے لئے خوبصورت وردی، بندوق اور مفت راشن کا لالچ دے کر بھرتی کر رہا تھا۔ والدین کو جب معلوم ہوتا کہ ہمارا لڑکا فوج میں بھرتی ہو گیا ہے تو وہ پریشان ہو کر امیر شریعتؒ کے پاس آتے اور

امیر شریعتؒ پہلے تو انہیں سخت سست کہتے' پھر ان سے مجلس احرار کے لئے پانچ روپے چندہ وصول کرتے اور اس کی رسید اس لڑکے کے نام کاٹتے جو فوج میں بھرتی ہو کر ٹریننگ کے لئے جا چکا تھا۔ ساتھ ہی جماعت کے طبع شدہ فارم پر اس لڑکے کے نام حسب ذیل خط لکھتے۔

''عزیزم......!

سلام مسنون۔ تمہارا چندہ برائے مجلس احرار بڑی پابندی سے پہنچ رہا ہے، شکریہ! اپنی جماعتی ذمہ داریوں کو خوب اچھی طرح نبھانا' فوج کے اندر رہ کر جماعت نے جو ڈیوٹی تمہارے سپرد کی ہے اسے خیال سے انجام دینا۔

فقیر عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ''

یہ خط جب فوجی افسروں کے پاس پہنچتا تو وہ متعلقہ لڑکے کو بلا کر دریافت کرتے' تمہارا عطاء اللہ سے کیا تعلق ہے؟

سولجر: ''میں تو انہیں جانتا بھی نہیں صاحب!''

آفیسر: ''تم تو اس کی جماعت کو چندا بھی دیتے ہو''

سولجر: ''نہیں صاحب''

آفیسر: ''لیکن تمہارے نام اس کا خط اور چندے کی رسید کیسے آ گئی؟ چلو تمہیں فوج کی ملازمت سے علیحدہ کیا جاتا ہے''

گویا خط پہنچنے کے چوتھے روز لڑکا اپنے گھر واپس پہنچ جاتا' اور گھر والے امیر شریعتؒ کو دعائیں دیتے۔ انگریز جوان دنوں محاذ جنگ پر مصروف تھا، امیر شریعتؒ کی ان حرکات سے چیں بہ جبیں ہوا' لیکن اندرون ملک وہ حالات سے مجبور تھا کہ اپنے کسی سیاسی حریف کو قانونی گرفت میں لیتا۔ اس طرح سے سینکڑوں نو جوانوں کو انگریزی فوج سے نکالنے کا سہرا امیر شریعتؒ کے سر ہے' اور یہ سلسلہ اختتامِ جنگ تک جاری رہا۔

......☆......

طوائف کی زندگی بدل گئی

ایک دن کا ذکر ہے کہ امیر شریعتؒ ایکا ایکی کتاب زندگی کے ورق پلٹنے لگے' خستہ یادوں

کی بھولی بسری کہانیاں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں تو امیر شریعتؒ مسکرا دیئے۔ بوڑھے جسم کی جوان آنکھوں میں روشنی کا سیلاب اُمڈ آیا' اور اپنے اردگرد دیکھنے لگے' جیسے وہ کسی واقعہ کا گواہ تلاش کر رہے ہوں۔ پھر آپ سے آپ گویا ہوئے:

''۱۹۴۳ء میں میری زندگی میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ نواب جان کے بیٹے افضل کو میری گود میں ڈال دیا گیا۔ ناپاک دامن میں پرورش پانے والا معصوم' گناہوں کی بستی سے بغاوت کر کے ایمان کی اوٹ میں امان چاہتا تھا۔''

نواب جان اس بازار کی جنس تھی جہاں عورت تاش کے پتوں کی طرح تقسیم ہوتی ہے۔ حسن اس کے چہرے پر ہی نہیں آواز میں بھی تھا۔ جب وہ لاہور ریڈیو سے آواز کا جادو بکھیرتی تو ہوائیں جھولیاں بھر کر اسے کائنات میں پھیلاتیں۔ اُس حسن بے پروا کی بلائیں لینے والوں میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں۔ افضل نواب جان کی تمناؤں کا آخری سہارا تھا۔ اگرچہ دو لڑکیاں بھی نواب جان کی وراثت میں شامل تھیں' لیکن تیرہ سالہ افضل اب ماں کے گندے اور ناپاک دامن پر پاؤں رکھنا بھی گناہ سمجھتا تھا۔ اسے خاندانی بغاوت کے جرم میں گھر سے باہر کیا گیا' اور وہ امیر شریعتؒ کی جھولی میں آ گرا۔

انسان بھی کیا شے ہے؟ برائی کا رخ کرتا ہے تو راستے کی ہر شے معاونت کرتی ہے' اور جب نیکی کی طرف مڑتا ہے تو اپنے بھی پرائے ہو جاتے ہیں۔

امیر شریعتؒ کا کہنا ہے کہ:

''جب میں اس سنڈ اس کے قریب پہنچا تو گناہ آلود دامن میرے گرد جال بننے لگا' انتقامی نگاہیں میرے تعاقب میں رہنے لگیں۔ برائی اپنے تمام وسائل سمیٹ کر میری دشمنی پر آمادہ ہو گئی' لیکن افضل اولاد کی طرح دل کے حرم میں مقیم رہا۔''

بیٹے کی ناراضگی نے ماں کی ممتا کو بیدار کر دیا۔ لیکن افضل کا ماں سے مطالبہ تھا کہ یہ دھندا ترک کر کے شرافت کی پناہ میں بیٹھ جائے' اور میری دونوں بہنوں کو بھی ازدواجی زندگی سے منسلک کر دے۔

گناہوں سے تھکی ہاری زندگی شاید نیکی کی آواز پر لبیک کہتی۔ مگر برسوں سے خاندانی

پیشہ قدم قدم پر رکاوٹیں ڈال رہا تھا' جنہیں راستے سے ہٹانا عورت کے بس کا روگ نہیں تھا۔
ماں کی ممتا اور خاندانی وقار! نواب جان اس دوراہے پر کھڑی تھی' کہ حالات بگڑتے چلے گئے۔

امیر شریعتؒ فرماتے ہیں:

''ایک دن میں میلسی (ضلع ملتان، جہاں نواب جان کا گھر تھا) سے دس میل دور قصبہ فتح پور سے واپس آ رہا تھا' مجھے اطلاع ملی کہ میلسی سے پولیس تھانے میں علاقے کے زمیندار' وکلاء اور نواب جان کے رشتے دار جمع ہیں کہ جیسے ہی میں میلسی میں داخل ہوں' مجھے افضل کے اغوا بمعہ گھر کے زیورات اور پارچا جات چوری کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا جائے۔

مولانا خدا بخش نے جو شہر کی جامع مسجد کے امام تھے' مجھے یہ قصہ سنایا تو میں نے کوچوان سے کہا ''تانگہ تھانے لے چلو۔'' سب دوست حیران ہوئے، جیسے ہی تانگہ تھانے کے قریب پہنچا' انچارج تھانہ، وکلاء، علاقے کے رؤسا، میرے مذہبی اور سیاسی حریف، جن میں ضلع کا مال آفیسر بشیر احمد تارڑ بھی تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سب کے سب سلام کرنے تھانے سے باہر چلے آئے۔ میں نے کہا ''مجھے منافق قسم کا سلام قبول نہیں۔ میں آ گیا ہوں، تم اپنی کاروائی جاری رکھو۔'' یہ کہہ کر میں اپنے میزبان کے گھر جو نواب جان کے گھر کے برابر تھا، چلا گیا۔ افضل اس وقت بھی میرے ساتھ تھا۔

جب واقعات اس موڑ تک آن پہنچے تو نواب جان نے اپنے عزیز و اقارب سے کہا: ''میں شاہ صاحبؒ کے خلاف تھانے میں کوئی رپورٹ درج کرانا نہیں چاہتی۔ وہ سید ہیں اور درویش بھی۔'' یہ کہہ کر نواب جان نے امیر شریعتؒ کے نام ایک دستی خط لکھا' جس کا مفہوم کچھ اس طرح سے تھا۔

پیر سائیں!

السلام علیکم! میں اور میرا خاندان برسہا برس سے گناہوں کی زندگی گزار رہا ہے' افضل بھی میری اسی گناہ کی کمائی کا نتیجہ ہے۔ جس دامن پر گندگی کے چھینٹے پڑ چکے ہوں وہ دامن اس قابل ہے کہ آپ تک رسائی حاصل کر سکے؟

امیر شریعتؒ نے اسی وقت جواب میں کہا:

''عیب وثواب انسانی زندگی کا خاصہ ہیں۔ موت وحیات کے درمیان کئی موڑ آتے ہیں، جہاں انسان پھسل کر سنبھلتا ہے اور سنبھل کر پھسلتا ہے۔ ثبات صرف اُسی ایک ذاتِ باری کے لئے ہے۔ میں تیرے حالات سے نا آشنا ہوں، اتنا ہی جانتا ہوں اور وہ بھی، تیرے بیٹے کی زبانی سنا ہے کہ تو گناہ میں مبتلا ہے اور اپنی اولاد کو بھی خراب کر چکی ہے۔ حاشاوکلا مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔ ندامت کے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی چادر میں لپٹ کر اگر تو میرے مولائے کریم کے سامنے توبہ کی بھیک مانگے گی تو تیری جھولی خالی نہیں آئے گی۔ میں بھی تیرے لئے دعا کروں گا۔''

اسی خط کے جواب میں دوسرے روز نواب جان کا ایک اور دستی خط آیا۔

پیر سائیں! السلام علیکم!

اگر ندامت کے آنسوؤں سے گناہ کے داغ دھل سکتے ہیں تو میں ساری رات گھر والوں سے چوری روتی رہی ہوں۔ میرے ایسے گناہ کی گٹھڑی کو کون اٹھائے گا۔ تاہم آپ حکم کریں تو میں کسی سے نکاح کر لوں، جب کہ میرے گرد حرص و ہوس کے انسانوں کی بے شمار دولت جمع ہے اور میرے خاندان کے لوگ اس دولت کے پجاری ہیں۔

پیر سائیں! مجھے ان کے چنگل سے نجات کے لئے وقت کی ضرورت ہے، میں کوشش کرتی ہوں، آپ دعا کریں۔ میرے افضل سے کہنا وہ بھی ماں کے گناہ کو معاف کر دے۔ میری مجبوریوں سے وہ واقف ہے۔''

اس خط کا امیر شریعتؒ نے مختصر جواب دیا:

''انسان کو نیکی کرنے کی توفیق تو اللہ تعالیٰ دیتے ہیں۔ اسلام کا ایک ادنیٰ مبلغ ہونے کی حیثیت سے میں تیرے لئے دعا گو ہوں۔ پروردگار تجھے نیکی کی راہ پر چلنے کی توفیق دے۔ (آمین)

تو سیس گندالے، چنریا رنگالے
اری کیا کرے گی کھڑی دن کے دن

نواب جان کی یہ کہانی دنوں اور مہینوں میں نہیں، سالوں میں جا کر ختم ہوئی۔ اور اس میں کئی موڑ آئے۔ آخر ہوا یہ کہ امیر شریعتؒ کی دعائیں کام آئیں کہ ضلع ملتان کی اس مشہور طوائف نے بیٹے کا کہا مان کر اپنی سابقہ زندگی سے توبہ کر کے تحصیل میلسی کے ایک زمیندار خدا بخش بھٹہ سے شادی کر لی، جس سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ زمیندار ۱۹۶۰ء میں انتقال کر گیا۔ نواب جان نے اپنی دونوں لڑکیوں کے نکاح بھی شریعت کے مطابق کیے۔ افضل اپنی ماں کے پاس واپس چلا گیا۔

(ایضاً)

......☆......

شاہ جیؒ کو روحانی صحت کی نوید

۱۹۶۰ء میں امیر شریعتؒ کے معالج حکیم حنیف اللہ نے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا اور اس کے لئے درخواست دی۔ امیر شریعتؒ کو جب اس کا علم ہوا تو حکیم صاحب سے کہا:

''جب آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر پر حاضر ہوں تو میرا اسلام عرض کر دیں اور میری صحت کے لئے دعا کی درخواست کریں۔''

حکیم حنیف اللہ اس پر خاموش رہے، لیکن امیر شریعتؒ نے انہی دنوں ان کے والد حکیم عطاء اللہ خاں سے اس بات کا ذکر کیا، تو بڑے حکیم صاحب نے کہا:

''شاہ جی! گذشتہ دنوں میں نے آپ کی یہ درخواست خاتم الانبیاء کی خدمت میں پیش کر دی ہے۔''

امیر شریعتؒ: (تعجب سے) ''وہ کیسے؟''

حکیم صاحب: ''مجھے پچھلے دنوں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی ہے۔ میں نے دیکھا کہ سرکار کائناتؐ کے گرد ایک حلقہ بیٹھا ہے۔ میں بھی اسی میں شامل ہوں۔ میں نے حضور کی خدمت میں عرض کیا۔ ''سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی صحت کے لئے دعا فرمائیں'' مگر حضورؐ نے دعا کے لئے ہاتھ نہیں اٹھائے، بلکہ ایک کاغذ کی طرف اشارہ کیا، جس پر لفظ ''صحت'' لکھا تھا۔''

امیر شریعتؒ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور حکیم حنیف اللہ سے آ کر کہا:

''آپ نے تو میری درخواست حضورؐ کی خدمت میں لے جانے کی حامی نہیں بھری تھی، مگر بڑے حکیم صاحب نے یہ کام کر بھی دیا۔''

یہ کہہ کر تمام واقعہ بیان کر دیا۔

والد صاحب کا خواب سن کر حکیم حنیف اللہ نے اس کا ذکر اپنے استاد حضرت مولانا عبدالرؤف سے کیا، جس سے انہوں نے حدیث اور فقہ پڑھی تھی۔ انہوں نے فرمایا ''اس خواب کی یہ تعبیر نہیں جو شاہ جی سمجھے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ شاہ جی کو روحانی صحت ہوگی۔ یعنی ان کے وصال کا وقت قریب آ گیا ہے۔'' لیکن مصلحتاً امیر شریعتؒ کو یہ تعبیر نہیں بتائی گئی تھی۔ (حیات امیر شریعتؒ)

✿✿✿✿✿

باب سوم
جهادیات

باب سوم

جہادیات

اسلام سے اگر جہاد کو الگ کر لیا جائے!

جہاد اور اسلام ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں اور ایک ہی معنی کے لئے دو مترادف الفاظ۔ یعنی اسلام کے معنی جہاد اور جہاد کے معنی اسلام ہیں پس کوئی ہستی مسلم ہو نہیں سکتی جب تک کہ مجاہد نہ ہو اور کوئی مجاہد ہو نہیں سکتا جب تک مسلم نہ ہو۔ اسلام کی لذت اس بد بخت کے لیے حرام ہے جس کا ذوق ایمانی لذت جہاد سے محروم ہو اور زمین پر گو اس نے اپنا نام مسلم رکھا ہو لیکن اس کو کہہ دو کہ آسمانوں میں اس کا شمار کفر کے زمرے میں ہے.... آج جب ایک دنیا لفظ جہاد کی دہشت سے کانپ رہی ہے .... جبکہ عالم مسیحی کی نظروں میں یہ لفظ عفریت مہیب یا ایک حربہ بے امان ہے.... جبکہ اسلام کے مدعیان حویت نصف صدی سے کوشش کر رہے ہیں کہ کفر کی رضا کے لئے اہل اسلام کو مجبور کریں کہ وہ اس لفظ کو لغت سے نکال دیں.... جب کہ بظاہر انہوں نے کفر و اسلام کے درمیان ایک راضی نامہ لکھ دیا کہ اسلام لفظ جہاد کو بھلا چکا ہے۔ لہٰذا کفر اپنے توحش کو بھول جائے۔ تاہم آج کل کے ملحد مسلمین اور مفسدین کا ایک حزب الشیطان بے چین ہے کہ بس چلے تو یورپ سے درجہ تقرب وعبودیت حاصل کرنے کے لئے "تحریف الکلم عن مواضعه" کے بعد سرے سے اس لفظ کو قرآن سے نکال دے۔ تو پھر یہ کہا ہے کہ میں جہاد کو صرف ایک رکن اسلامی ایک فرض دینی ایک حکم شریعت بتلاتا ہوں حالانکہ میں تو صاف صاف کہتا ہوں کہ اسلام کی حقیقت ہی جہاد ہے دونوں لازم وملزوم ہیں..... اسلام سے اگر جہاد کو الگ کر لیا جائے تو وہ ایک ایسا لفظ ہوگا جس میں معنی نہ ہوں.... ایک اسم ہوگا جس کا مسمیٰ نہ ہو.... ایک قشر محض ہوگا جس سے مغز نکال لیا

گیا ہو۔ پھر کیا میں ان تمام اعمال مصلحین، مجاہدین کو غارت کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے تطبیق بین التوحید والتثلیث یا اسلام اور مسیحیت کے اتحاد کے لئے انجام دی ہیں۔ وہ اصلاح جدید کی شاندار عمارتیں جو مغربی تہذیب وشائستگی کی ارض مقدس پر کھڑی کی گئی ہیں۔ کیا دعوت جہاد دے کر جنود مجاہدین کو بلاتا ہوں کہ اپنے گھوڑوں کی سموں سے انہیں پامال کر دیں اور چاہتا ہوں کہ اسلام کی زندگی کا افق جو حرارتِ حیات کی گرد سے پاک کر دیا گیا تھا' مجاہدین کی اڑائی ہوئی خاک سے پھر غبار آلود ہو جائے۔

ہاں! اے غارت گرانِ حقیقت اسلامی، اے دُزدانِ متاعِ ایمانی! اور اے مفسدینِ ملت و مدعیانِ اصلاح! ہاں میں ایسا ہی چاہتا ہوں، میری آنکھیں ایسا ہی دیکھنا چاہتی ہیں، میرا دل ایسے ہی وقت کے لئے بے قرار ہے، خدائے ابراہیم ومحمد علیہما السلام کی شریعت ایسا ہی چاہتی ہے۔ قرآن کریم اسی کو حقیقت اسلامی کہتا ہے۔ وہ اس اسوۂ حسنہ کی طرف ہی اپنے پیروؤں کو بلاتا ہے۔ اسلام کا اعتقاد اسی کے لیے ہے اور اس کی تمام عبادتیں اسی کے لیے ہیں، اس کے تمام جسم اعمالی کی روح میں یہی شے ہے اور یہی چیز ہے جس کی یاد کو اس نے ہمیشہ زندہ رکھنا چاہا۔

(اسلام اور جہاد، از مولانا ابوالکلام آزاد)

☆

بحرِ ظلمات میں گھوڑے یا خشکی پہ جہاز؟

فاتحین اسلام کی جانبازی اور جفاکشی کی محیر العقول داستانیں تاریخ اسلام کا روشن ترین باب ہیں، بقولِ اقبالؒ:

دشت تو دشت ہیں' دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

فاتحین اسلام میں ایک نہایت ہی محترم اور باوقار نام ترکی کے ساتویں نوجوان عثمانی خلیفہ، فاتح قسطنطنیہ سلطان محمد فاتح کا ہے۔ اس شمشیرزن نوجوان شہزادے نے اپنی عمر کے ۲۲ویں سال میں سلطنتِ عثمانیہ کی زمامِ خلافت سنبھالی تو اس کے ذہن میں حضورؐ کی وہ حدیث مبارکہ گردش

کر رہی تھی جس میں حضورؐ نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے والے امیر کو بہترامیر اور اس کے لشکر کو بہتر لشکر قرار دیا تھا۔ چنانچہ اس نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اس مہم میں اس شہزادے کو جو معرکہ سر کرنا پڑا، وہ بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑانے سے بھی زیادہ حیرتناک تھا۔ شیخ الاسلام محمد تقی عثمانی اس کی تفصیل میں لکھتے ہیں:

قسطنطنیہ چونکہ باسفورس، بحیرہ مرمرا اور شاخ زریں (گولڈن ہارن) نامی سمندروں میں گھرا ہوا ہے، اور اس کے صرف مشرقی جانب خشکی ہے، اس لئے اس پر کامیاب حملے کے لیے ایک طاقتور بحری بیڑہ بھی ضروری تھا۔ چنانچہ محمد فاتح نے ایک سو چالیس جنگی کشتیوں پر مشتمل ایک بیڑہ بھی تیار کر لیا۔ ان تیاریوں کے بعد سلطان نے قسطنطنیہ کا اس طرح محاصرہ کیا کہ برّی فوج شہر کی مشرقی فصیل کے سامنے پہنچ گئی اور بحری بیڑہ آبنائے باسفورس میں پھیل گیا۔ قسطنطنیہ کا محل وقوع کچھ ایسا ہے کہ باسفورس کی ایک پتلی سی شاخ ایک سینگ کی شکل میں مشرق کی طرف جاتی ہے۔ جو شاخ زریں (گولڈن ہارن) کہلاتی ہے۔ قسطنطنیہ کی بندرگاہ اسی گولڈن ہارن میں واقع تھی، لہٰذا باسفورس سے بندرگاہ یا شہر کی جنوبی دیوار کے سامنے پہنچنے کے لئے گولڈن ہارن سے گزرنا ضروری تھا۔ لیکن اہل قسطنطنیہ نے اس گولڈن ہارن کے اس دہانے پر جو باسفورس میں گرتا ہے، لوہے کا ایک بڑا زنجیرہ باندھ دیا تھا جس کی وجہ سے کوئی جہاز باسفورس سے گولڈن ہارن میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا محمد فاتح کے جہاز باسفورس میں محدود ہو گئے تھے اور جہازوں کے ذریعے بندرگاہ کا محاصرہ کرنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فصیل پر حملہ صرف مشرق کے خشکی کے راستے سے ممکن تھا اور اہل شہر نے بحری سمت کو مکمل محفوظ سمجھ کر اپنی ساری طاقت مشرق کی فصیل پر لگا دی تھی۔

اب آگے بڑھنے سے پہلے قسطنطنیہ اور گرد و پیش کا ایک سرسری سا نقشہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

سلطان محمد فاتح کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح اس کے کچھ جہاز آبنائے باسفورس سے گولڈن ہارن میں داخل ہو جائیں، تا کہ بندرگاہ کی سمت سے بھی شہر پر حملہ کیا جا سکے، لیکن گولڈن ہارن کے دہانے پر لوہے کا زنجیرہ بھی نصب تھا، اور اس کے آس پاس توپیں بھی گولہ باری کے لئے موجود تھیں اور بڑے بڑے بازنطینی جہاز بھی گولڈن ہارن کے اندر زنجیرے کی مدافعت کے لیے

کھڑے رہتے تھے۔اس لئے اس راستے سے کامیابی ممکن نظر نہیں آتی تھی۔ بہت دن گزر گئے تھے لیکن گولڈن ہارن میں پہنچنے کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوسکی۔

بالآخر ایک دن سلطان محمد فاتح نے ایک ایسا فیصلہ کیا جو دنیا کی تاریخ میں اس کی منفرد اور محیّر العقول یادگار بن کر رہ گیا۔اس کا فیصلہ یہ تھا کہ جہازوں کو گولڈن ہارن میں پہنچانے کے لئے انہیں دس میل خشکی پر چلا کر لے جایا جائے گا۔اور اس غرض کے لیے باسفورس کے مغربی ساحل سے جہاز خشکی پر چڑھا کر انہیں ایک ترچھے راستے سے گولڈن ہارن کے بالائی جنوبی کنارے تک پہنچایا جائے گا (جو آج کل قاسم پاشا کہلاتا ہے) اور وہاں سے انہیں گولڈن ہارن میں ڈال دیا جائے گا۔ خشکی کا یہ درمیانی علاقہ گبن کے بیان کے مطابق تقریباً دس میل لمبا اور سخت ناہموار اور پہاڑی اتار چڑھاؤ سے معمور تھا لیکن محمد فاتح کی اولوالعزمی نے یہ محیّر العقول عجوبہ صرف ایک رات میں کر دکھایا۔ اس نے خشکی کے اس راستے پر لکڑی کے تختے بچھوائے۔انہیں چکنا کرنے کے لئے ان پر چربی ملوائی۔ پھر ستر جہاز نما کشتیوں کو یکے بعد دیگرے باسفورس سے ان تختوں پر چڑھا دیا۔ ہر کشتی میں دو ملاح سوار تھے، اور ہوا کی مدد لینے کے لئے بادبان بھی کھول دیئے گئے تھے۔ان کشتیوں کو بیل اور آدمی کھینچتے ہوئے دس میل کی یہ پہاڑی مسافت طے کر کے گولڈن ہارن تک لے گئے۔

ستر کشتیوں کا یہ جلوس رات بھر مشعلوں کی روشنی میں محوِ سفر رہا۔ بازنطینی فوج قسطنطنیہ کی فصیل سے باسفورس کے مغربی ساحل پر مشعلوں کی چہل پہل دیکھتی رہی۔لیکن اندھیرے کی وجہ سے سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ بالآخر جب صبح کے اجالے نے راز سے پردہ اٹھایا تو فاتح کی ستر کشتیاں اور بھاری توپ خانہ گولڈن ہارن کے بالائی علاقے میں پہنچ چکا تھا۔

دس میل خشکی پر جہاز چلانے کا یہ کارنامہ، جو فاتح سے پہلے کسی کے تصور میں بھی نہ آیا ہو گا اس قدر حیرت انگیز ہے کہ مغرب کے متعصب مؤرخین بھی اس حیرت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے۔ایڈورڈ گبن جیسے مؤرخ نے بھی اس کو ایک ''معجزہ'' **(Miracle)** کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

گولڈن ہارن میں عثمانی کشتیوں کے پہنچنے میں ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ یہاں سمندر کا پانی اتھلا تھا' اور زیادہ گہرائی نہ ہونے کی وجہ سے بازنطینیوں کے بڑے جہاز اس میں آزادی سے نقل و حرکت نہیں کر سکتے تھے۔اس کے برعکس عثمانی کشتیاں نسبتاً چھوٹی تھیں' اس لئے ان کے لئے حسب

منشاء آمد و رفت میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ چنانچہ یہاں کی بحری لڑائی میں عثمانی کشتیوں کو غالب آنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی، اور بندرگاہ کی جانب سے بھی بحری محاصرہ بالکل مکمل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی محمد فاتح نے گولڈن ہارن پر ایک پل تعمیر کیا' اور اس پر اپنا بھاری توپ خانہ نصب کرا دیا۔

مشرق اور جنوب دونوں طرف سے محاصرے کی گرفت مضبوط ہونے کے بعد عثمانی توپوں نے دونوں طرف سے شہر کی فصیلوں پر زبردست گولہ باری شروع کی اور سات ہفتوں کی متواتر گولہ باری کے بعد دیواروں میں تین مقامات سے بڑے بڑے شگاف نمودار ہو گئے اور گبن کے الفاظ میں ''وہ فصیلیں جو صدیوں سے ہر دشمن کے تشدد کا مقابلہ کر رہی تھیں' عثمانی توپوں نے ہر طرف سے ان کا حلیہ بگاڑ دیا' ان میں بہت سے شگاف پڑ گئے اور سینٹ رومانوس کے دروازے (جو بعد میں توپ دروازہ یا توپ کاپے کے نام سے مشہور ہوا) کے قریب چار مینار زمین کی سطح کے برابر ہو گئے۔''

اب سلطان محمد فاتح کو آخری حملے کی کامیابی کا یقین ہو چکا تھا' لیکن اس نے حملے سے پہلے ۱۵ جمادی الاولیٰ ۸۵۷ھ مطابق ۲۴ مئی ۱۴۵۳ء کو بازنطینی بادشاہ قسطنطین کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ اگر ہتھیار ڈال کر شہر سپرد کر دے تو رعایا کی جان و مال سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا اور موریا کا علاقہ اسے دے دیا جائے گا۔ لیکن قسطنطین نے یہ پیشکش منظور نہ کی اور اس طرح پانچ دن بعد سلطان محمد نے آخری اور فیصلہ کن حملے کا فیصلہ کر لیا۔

سلطان محمد کا آخری حملہ اور فتح

چنانچہ ۲۰ر جمادی الاولیٰ ۸۵۷ھ کی رات عثمانی فوجوں نے ذکر و تسبیح اور دعاؤں میں گزاری' نماز فجر کے بعد محمد فاتح نے عام حملہ کا حکم دے دیا اور بعض روایتوں میں ہے کہ اس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ہم انشاءاللہ ظہر کی نماز آیا صوفیا کے کلیسا میں ادا کریں گے۔

حملہ مختلف سمتوں میں جاری رہا' لیکن زیادہ زور سینٹ رومانس کے دروازے پر تھا۔ (جو اب توپ کاپے کہلاتا ہے) کیونکہ یہاں کی دیوار بہت مجروح ہو چکی تھی' خندق کو اوپر اوپر سے عبور کرنے کے لئے سیڑھیاں اور کمندیں ڈال دی گئی تھیں' دوپہر تک دونوں طرف آگ اور خون کا

زبردست معرکہ جاری رہا' بازنطینی بھی اس روز غیر معمولی شجاعت کے ساتھ لڑے۔ دوپہر تک کوئی ایک سپاہی شہر میں داخل نہ ہوسکا' بالآخر سلطان محمد فاتح خود اپنی خصوصی فوج ینی چری کو لے کر سینٹ رومانس کے دروازے کی طرف بڑھا اور ینی چری کا سردار آغا حسن اپنے تیس جانباز ساتھیوں کے ساتھ دیوار پر چڑھ گیا۔ حسن اور اس کے اٹھارہ ساتھی فوراً فصیل سے گرادیئے گئے اور انہوں نے جام شہادت نوش کیا لیکن بارہ ساتھی دیوار پر جمنے میں کامیاب ہوگئے اور اس کے بعد دوسرے عثمانی دستے بھی یکے بعد دیگرے پہنچتے گئے اور اس طرح دیوار قسطنطنیہ پر سرخ ہلالی پرچم لہرادیا گیا۔

بازنطینی بادشاہ قسطنطین جواب تک بے جگری سے حالات کا مقابلہ کررہا تھا' اپنے بعض انتہائی بہادر ساتھیوں کے حوصلہ چھوڑ دینے کے بعد مایوس ہوگیا' اور اس نے پکار کر کہا کہ ''کیا کوئی عیسائی نہیں ہے جو مجھے اپنے ہاتھوں سے قتل کردے؟'' لیکن جب کوئی جواب نہ ملا تو اس نے شاہانِ روم (قیاصرہ) کی خاص پوشاک اتار کر پھینک دی اور عثمانی فوج کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں گھس کر ایک سپاہی کی طرح بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا اور اس کی موت پر اس گیارہ سو سال کی بازنطینی سلطنت روما کا خاتمہ ہوگیا جس کی ابتدا بھی قسطنطین سے ہوئی تھی اور انتہا بھی قسطنطین پر ہوئی اور اس کے بعد ''قیصر'' کا لقب ہی ایک تاریخی داستان بن کر رہ گیا۔ سرکار دو عالم ﷺ کا وہ ارشاد پورا ہوا کہ:

اذا هلک قیصر . فلا قیصر بعده

جب قیصر ہلاک ہوگیا تو پھر کوئی قیصر پیدا نہیں ہوگا۔

ظہر کے وقت سلطان محمد فاتح اپنے وزراء اور دوسروں کے جلو میں شہر کے سینٹ رومانس کے دروازے سے داخل ہوا۔ اور سب سے پہلے قسطنطنیہ کے شہرہ آفاق کلیسا آیا صوفیا کے دروازے پر پہنچ کر گھوڑے سے اترا' کلیسا کی دیواروں پر تصویریں بنی ہوئی تھیں' انہیں مٹا کر دھویا گیا' سلطان کی ہدایت پر یہاں مؤذن نے اذان کہی' اور شرک وکفر کے اس مرکز میں پہلی بار ''اشهدان لا الٰه الا اللّٰه، اشهدان محمدًا رسول اللّٰه'' کی زمزمہ بار صدا گونجی۔ سلطان نے نماز ظہر یہیں ادا کی' اور اس وقت سے اس کلیسا کو مسجد میں تبدیل کردیا گیا۔

اس کے بعد سلطان شاہی محلات میں داخل ہوا۔ یہ زرق برق محلات جو صدیوں سے قیاصرہ کی شان وشوکت اور ان کے طمطراق کے مظہر تھے، آج ویران پڑے ہوئے تھے۔ سلطان محمد

فاتح کے دل پر اس عبرتناک منظر کا ایسا اثر ہوا کہ بے ساختہ فردوسی کا یہ شعر اس کی زبان پر آ گیا۔

پردہ داری می کند بر قیصر عنکبوت

چغد نوبت میزند بر گنبد افراسیاب

یہ تھا فتح قسطنطنیہ کا وہ واقعہ جس کے بعد قسطنطنیہ (استنبول) خلافت عثمانیہ کا مرکز بنا اور صدیوں تک اسے عالم اسلام میں نمایاں مرکزیت حاصل رہی۔

(جہان دیدہ، ص ۳۲۴ تا ۳۲۹)

☆
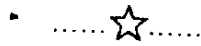
سید احمد شہیدؒ کا بھاوج سے نکاح

''سید صاحب نے احیائے سنت کے جو ممتاز کارنامے انجام دیئے ان میں سے ایک یہ ہے کہ اپنے گھر سے نکاحِ بیوگان کا آغاز کیا۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ میل جول میں جو معیوب اور سراسر غیر شرعی رسمیں اختیار کر لی تھیں۔ ان میں سے ایک رسم یہ بھی تھی کہ کسی خاتون کا شوہر فوت ہو جاتا تو ضرورت کے باوجود دوسرا نکاح نہ کرتی، بلکہ ایسے نکاح کو نجابت اور شرافت کے منافی سمجھا جاتا۔ خصوصاً اونچے گھرانوں میں تو اس کا تصور بھی موجب ننگ تھا۔ اکبر و جہانگیر کے زمانے تک مسلمانوں میں یہ بری رسم نہ تھی۔ خود اکبر نے بیرم خان کی بیوہ سلمہ سلطان بیگم سے نکاح کیا جو بادشاہ کی عم زاد بہن تھی۔ سلمہ سلطان بیگم زندگی کے آخری سانس تک شاہی محل کی ممتاز ترین ہستی سمجھی جاتی رہیں۔ جہانگیر نے نور جہاں بیگم سے بیوگی کی حالت ہی میں شادی کی تھی، اور اس وقت نور جہاں کی عمر کم و بیش چونتیس برس تھی۔''

یہ بری رسم بعد ہی میں رواج پائی، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جو ہندو اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے، وہ اپنی پرانی رسموں پر بھی قائم رہے اور ان ہی میں سے ایک رسم یہ بھی تھی کہ بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کو بری نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ ان خاندانوں میں بھی یہ رسم جڑ پکڑ گئی جو ظہور اسلام کے وقت سے مسلمان چلے آتے تھے۔

سید صاحب کے منجھلے بھائی سید اسحاق کی بیوہ جوان تھیں ان کا صرف ایک بچہ تھا جس کی عمر بصد مشکل چھ سات برس ہوگی۔ سید صاحب نکاحِ بیوگان کا اجرا چاہتے تھے۔ احیائے سنت اور تجدید شیوۂ اسلامیت کے سلسلے میں وعظ و تبلیغ سے بڑھ کر فائدہ عملی اقدام سے پہنچ سکتا تھا۔ اس بنا پر خود ہی اپنی بیوہ بھاوج سے نکاح کے لئے تیار ہو گئے۔ اسی زمانے کی ایک روایت ہے کہ سید احمد نے ایک خواب دیکھا جس میں ایک بوجھل اور بہت وزنی لکڑیوں کا گٹھا زمین پر پڑا ہے اور ایک ہجوم ہے جو اس کو اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن کوئی اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اس موقع پر آپ کی بھاوج سیدہ اسحاق بھی موجود ہیں۔ سید احمد نے بعد منت ان کو اپنے ساتھ گٹھے کو اٹھانے کے لیے راضی کر لیا اور سید احمد اور سیدہ اسحاق دونوں مل کر اس گٹھے کو اٹھانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس خواب کے بعد آپ نے اپنی بیوہ بھاوج سے نکاح کا ارادہ پختہ کر لیا۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ کے علمی عملی اور جہادی معرکے

شاہ اسماعیل کی سب سے بڑی خوبی یہ رہی ہے کہ انہوں نے اپنی آنے والی مجاہدانہ زندگی کے واسطے عالم شباب ہی میں تیاریاں شروع کر دی تھیں، وہ علم اور بہادری میں ابتدا ہی سے یکتا تسلیم کئے جاتے تھے۔ چنانچہ خود شاہ عبدالعزیزؒ فرمایا کرتے تھے:

''ہر تعریف اس خدائے پاک کے لئے ہے جس نے بڑھاپے کے عالم میں بھی اسماعیل اور اسحاق عطا کیے۔''

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:

''اسماعیل کا علم کسی خاص شعبے میں محدود نہیں۔ جن لوگوں نے میرا عہد شباب دیکھا ہے وہ اگر اس کا نمونہ دیکھنا چاہیں تو اسماعیل کو دیکھ لیں۔''

شاہ اسماعیل شہیدؒ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب آپ نے مختلف علوم میں مہارت حاصل کر لی تو ورزش اور جفاکشی کی طرف متوجہ ہوئے۔ پٹا اور گتگا (بنوٹ) کی مشق کے لئے مرزا رحمت اللہ بیگ کی شاگردی اختیار کی۔ اور یہ وہی رحمت اللہ بیگ تھے جن کی شاگردی میں آنے کے لئے مغلیہ خاندان کے شہزادے منتیں مانا کرتے تھے۔ اسی طرح گھوڑا سواری آپ نے میاں رحیم بخش چابک سوار سے سیکھی۔ یہ میاں رحیم بخش اپنے دور کے مانے ہوئے چابک سوار تھے جو اپنے شاگرد

سے اتنا متاثر ہوئے کہ ان کے حلقے میں شامل ہو گئے اور ان ہی کے جلو میں سرحد پار پہنچ کر اپنی جان بھی ہارنے سے گریز نہیں کیا۔ بالآخر جام شہادت نوش کیا۔ شاہ اسماعیل نے اپنے مکان کے قریب باقاعدہ اکھاڑہ قائم کیا اور دن رات لنگر لنگوٹ کس کر کسرت کرنے میں مصروف رہے۔ جمنا میں پیراکی کا سلسلہ شروع کیا تو مہینوں یہ مشغلہ جاری رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آپ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری کر چکے تھے۔ چنانچہ طلبا کو ہدایت تھی کہ وہ کتابیں لے کر جمنا پر پہنچا کریں۔ شاگرد کتابیں لے کر جمنا کے کنارے پہنچ جاتے' استاد تیرتا ہوا آتا' سبق دیتا اور پھر پانی میں گم ہو جاتا۔ وہ سانس پر کنٹرول کی مشق کے لئے دہلی سے آگرے تک تیرتے ہوئے جاتے۔ یہ سلسلہ ختم ہوا تو تپتی زمین پر ننگے پاؤں چلنے کی مشق شروع کر دی۔ مئی اور جون کی جھلسا دینے والی دھوپ اور گرمی میں فتح پوری مسجد کے صحن میں ننگے پاؤں کئی کئی گھنٹے چلنے کی مشق کرتے۔ پھر نشانہ باندھنا اور بندوق چلانا شروع کی تو اس میں کمال حاصل کیا۔ خود ہی کہا کرتے تھے کہ:

''ناممکن ہے کہ جانور میرے سامنے آئے اور پھر زندہ بچ نکلے''

ایک مرتبہ کسی دوست نے کہا کہ اگر اس کی موت ہی نہ آئی ہو تو آپ کیسے مار ڈالیں گے؟ تو بولے ''اگر اس کی موت نہ آئی ہو گی تو میرے سامنے آئے گا ہی نہیں۔''

شاہ اسماعیل نے سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے بہت پہلے رسوم اور بدعات کے خلاف جہاد شروع کر دیا تھا۔ اس لئے کہ اس وقت مسلمانوں اور ہندوؤں کی زندگی میں توہم پرستی اتنی زیادہ گھر کر گئی تھی کہ اس نے انسانی خود اعتمادی تک کو مجروح کر رکھا تھا۔ شاہ اسماعیل نے اپنی پوری توجہ ان بدعات اور جہالت پر مبنی رسوم کے خاتمے کے لئے جدوجہد پر مرکوز کیے رکھی۔ سید احمد کے ساتھ جب شریک تحریک ہوئے تو اس کی بنیاد بھی انہی بدعات کے خاتمے پر رکھی۔ مدتوں ان کے وعظ دہلی میں ایک متنازعہ مسئلہ بنے رہے۔ کچھ تھے جو ان کے وعظوں پر جان چھڑکتے اور کچھ تھے جو اسماعیل کی جان کے دشمن ہو رہے تھے۔ یہی زمانہ ہے جس میں آپ کی فضل حق خیر آبادی سے ٹھن گئی تھی۔

شاہ اسماعیل نے اپنے وعظوں کو محراب و منبر ہی تک محدود نہ رکھا بلکہ وہ گلی کوچوں' میلوں ٹھیلوں اور بازاروں میں پہنچ جاتے' وہاں لوگوں کو پند و نصیحت کرتے۔ جامع مسجد کی سیڑھیاں جہاں

روزانہ بازار لگتا تھا وہاں اچھا خاصا ہجوم تھا۔ یہ سیڑھیاں تو مرکزی دارالارشاد کی حیثیت اختیار کر گئی تھیں' اسی دارالارشاد کا ایک واقعہ ہے کہ شاہ اسماعیل انہی سیڑھیوں پر کھڑے وعظ کر رہے تھے کہ ایک ہیجڑے کا ادھر سے گزر ہوا۔ وہ وعظ سننے کے لئے رک گیا۔ اس کے ہاتھوں میں مہندی لگی تھی' بانہوں میں چوڑیاں' پاؤں میں جھانجن اور سرخ جوڑا زیب تن کیا ہوا تھا۔ شاہ اسماعیل نے جب اسے دیکھا تو اسے خطاب کر کے وعظ کہنا شروع کر دیا۔ اس ہیجڑے کا یہ عالم ہوا کہ اس نے وہیں کھڑے کھڑے چوڑیاں توڑ ڈالیں' زیور اتار پھینکے اور ہاتھوں سے مہندی کی لالی مٹانے کے لئے اس زور سے سیڑھیوں پر ہاتھ رگڑے کہ ہاتھوں سے خون بہنے لگا۔ جب وعظ ختم ہوا تو توبہ کی اور شاہ اسماعیل کے حلقے میں شامل ہو گیا۔ یہی ہیجڑا جہاد میں شاہ شہید کے ہمراہ گیا اور شہید ہوا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ بھی عجیب و غریب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مدرسہ رحیمیہ کے دروازے پر آپ کھڑے تھے کہ سامنے سے چند ہوش ربا موشیں کھلے منہ بناؤ سنگھار کیے بہلیوں میں بیٹھی گزریں' معلوم ہوا کہ یہ مسلمان کسبیاں ہیں جو کسی رنڈی کے ہاں کسی تقریب میں جا رہی ہیں۔ اس پر شاہ شہید نے کہا کہ جب یہ مسلمان ہیں تو ہماری بہنیں ہیں۔ کیا خدا ہم سے نہیں پوچھے گا کہ اس قدر مسلمان عورتیں بدکاری اور زناکاری میں گرفتار تھیں اور تم نے ان کو نصیحت نہیں کی؟ اس واسطے اب تو میں ان کے مکان پر جا کر نصیحت کروں گا۔ دوستوں نے منع کیا کہ یہ وضع داری کے خلاف ہے۔ لیکن شاہ شہید نے رات کو فقیرانہ لباس پہنا اور چل پڑے۔ دروازے پر پہنچ کر آواز دی:
''او اللہ والیو! او اللہ والیو! خادمہ دوڑی ہوئی آئی، تم کون ہو؟ فرمایا فقیر ہے، صدا سنائے گا اور تماشا دکھائے گا۔ وہ اپنے ساتھ لے گئی۔ آپ نے مالکہ کو دریافت کیا کہ کہاں ہے تو معلوم ہوا کہ بالا خانے پر مہمانوں کے ساتھ جشن نوروز منا رہی ہے۔ آپ وہیں تشریف لے گئے۔ گو لباس فقیرانہ تھا لیکن دلی کا کون سا فرد تھا جو شاہ اسماعیل کو نہ پہچانتا ہو' جب ان رنڈیوں نے شاہ صاحب کو اپنے ہاں دیکھا تو ششدر رہ گئیں' ان کو مسند پیش کی اور آپ زمین پر بیٹھ گئیں۔ شاہ صاحب نے ان کو نصیحت کی' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے توبہ کر لی۔

مولانا اسماعیل شہید کا قاعدہ تھا کہ جہاں کہیں کوئی میلہ ہوتا' خواہ ہندوؤں کا یا مسلمانوں کا' یا کوئی اور مجمع جیسے ناچ یا قوالی کی محفل' تو آپ وہاں پہنچ جاتے اور وعظ فرماتے۔ جس کا اثر یہ ہوتا

کہ ان محفلوں میں شریک اکثر آدمی جگہ چھوڑ چھوڑ کر آپ کا وعظ سننے لگتے۔ آپ حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں بھی پہنچ کر وعظ فرماتے اور وہاں بھی یہ اثر ہونے لگا تھا۔ مجاوروں نے یہ رنگ دیکھا تو ان کو سخت ناگوار ہوا۔ انہوں نے مشورہ کیا کہ مولوی اسماعیل صاحب کو کسی طرح قتل کر دیا جائے۔ ایک بوڑھے نے آپ کے قتل کا بیڑا اٹھایا۔ ایک روز جب کہ مولانا اسماعیل شہید جامع مسجد کے بیچ کے در میں وعظ فرما رہے تھے' اس بڈھے نے تلوار کا وار کیا۔ مولانا تو بچ گئے لیکن تلوار ان کے ایک دوست کے لگی اور شانہ زخمی ہوگیا۔ مولانا کے زخمی دوست اس بڈھے سے لپٹ گئے اور تھپڑ مارنے لگے۔ مولانا نے اس بڈھے کو چھڑا دیا اور کوئی مقدمہ تک نہیں کیا۔

ایک روز جب کہ مولانا شاہ اسماعیل شہید جامع مسجد فتح پوری میں دوپہر کے وقت ٹہل رہے تھے تو نوجوان وہاں پہنچ گئے۔ یہ گرمیوں کی تپتی ہوئی دوپہر تھی۔ جب یہ مسجد کے باہر جوتے اتار، ننگے پاؤں فرش پر دو چار قدم چلے تو فرش کی تپش اور گرمی سے ان کے قدم جلنے لگے۔ یک دم انہیں احساس ہوا کہ یہ شخص پائے کا ہوگا جو برہنہ پا اس فرش پر اس قدر اطمینان سے ٹہل رہا ہے۔ چنانچہ اپنے ارادے سے تائب ہو گئے اور پھر تمام عمر شاہ اسماعیل کے جاں نثار خادم بن گئے۔

......☆......
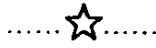
شہدائے بالاکوٹ کا مقام و پیغام

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی "شہداء بالاکوٹ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''اس معرکے میں وہ پاک نفوس شہید ہوئے' جو عالمِ انسانیت کے لیے رونق و زینت اور مسلمانوں کے لئے شرف و عزت اور خیر و برکت کا باعث تھے۔ مردانگی و جوانمردی' پاکیزگی و پاکبازی' تقدس و تقویٰ' اتباع سنت و شریعت اور دینی حمیت و شجاعت کا وہ عطر جو خدا جانے کتنے باغوں کے پھولوں سے کھینچا گیا تھا اور انسانیت اور اسلام کے باغ کا جیسا ''عطر مجموعہ'' صدیوں سے تیار نہیں ہوا تھا اور جو ساری دنیا کو معطر کرنے کے لئے کافی تھا' ۲۴ ذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ کو بالاکوٹ کی مٹی میں مل کر رہ گیا۔ مسلمانوں کی نئی تاریخ بنتے بنتے رہ گئی۔ حکومتِ شرعی ایک عرصہ تک کے لئے خوابِ بے تعبیر ہوگئی۔ بالاکوٹ کی زمین اس پاک خون سے لالہ زار اور اس گنجِ شہیداں سے گلزار

بنی، جس کے اخلاص وللّٰہیت، جس کی بلند ہمتی واستقامت، جس کی جرأت وہمت اور جس کے جذبۂ جہاد وشوقِ شہادت کی نظیر پچھلی صدیوں میں ملنی مشکل ہے۔ بالاکوٹ کی سنگلاخ وناہموار زمین پر چلنے والے بے خبر مسافر کو کیا خبر کہ یہ سرزمین، کن عُشاق کا مدفن اور اسلامیت کی کس متاعِ گرانمایہ کا مخزن ہے۔

یہ بُلبُلوں کا 'صبا' مشہدِ مقدّس ہے
قدم سنبھال کے رکھیو، یہ تیرا باغ نہیں

اللہ کے کچھ مخلص بندوں نے ایک مخلص بندے کے ہاتھ پر اپنے مالک سے اُس کی رضاء، اُس کے نام کی بلندی اور اُس کے دین کی فتح مندی کے لئے آخری سانس تک کوشش کرنے اور اس راہ میں اپنا سب کچھ مٹا دینے کا عہد کیا تھا۔ جب تک اُن کے دم میں دم رہا، اسی راہ میں سرگرم رہے۔ بالآخر اپنے خونِ شہادت سے اس پیمانِ وفا پر آخری مُہر لگا دی۔ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ۲۴ ذوالقعدہ کا دن گزر کر جو رات آئی، وہ پہلی رات تھی، جس رات کو وہ سبک دوش وسبک سر ہو کر میٹھی نیند سوئے۔

وہ خلعتِ شہادت پہن کر جس کریم کی بارگاہ میں پہنچے، وہاں نہ مقاصد کی کامیابی کا سوال ہے، نہ کوششوں کے نتائج کا مطالبہ، نہ شکست وناکامی پر عتاب ہے، نہ کسی سلطنت کے عدمِ قیام پر محاسبہ۔ وہاں صرف دو چیزیں دیکھی جاتی ہیں۔ صدق واخلاص اور اپنی مساعی اور وسائل کا پُورا استعمال۔ اس لحاظ سے شہداء بالاکوٹ اس دنیا میں بھی سرُخرو ہیں اور انشاء اللہ دربارِ الٰہی میں بھی با آبرو کہ اُنہوں نے اخلاص کے ساتھ اپنے مالک کی رِضا کے لیے اپنی مساعی اور وسائل کے استعمال میں ذرّہ برابر کمی نہیں کی۔ اُن کا وہ خونِ شہادت، جو ہماری مادی نگاہوں کے سامنے بالاکوٹ کی مٹی میں جذب ہو گیا اور اس کے جو چھینٹے پتھروں پر باقی تھے، ۲۶ ذی القعدہ کی بارش نے اُن کو بھی دھو دیا، وہ خون، جس کے نتیجے میں کوئی سلطنت قائم نہیں ہوئی، کسی قوم کا مادی وسیاسی عرُوج نہیں ہوا، اور کوئی نخلِ آرزو اس سے سرسبز ہو کر بار آور نہیں ہُوا، اُس خون کے چند قطرے اللہ کی میزانِ عدل میں پوری پوری سلطنتوں سے زیادہ وزنی ہیں۔ یہ فقیرانِ بے نوا، جنہوں نے عالمِ مسافرت میں بے کسی کے ساتھ جان دی اور جن کی اب دنیا میں کوئی مادّی یادگار نہیں، یہ اللہ کے ہاں اُن بانیانِ سلطنت اور

مؤسسینِ حکومت سے کہیں زیادہ قیمتی اور معزز ہیں، جن کی تصویر قرآن نے ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

وَاِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ. (آلمنافقون : ۴)

بے شک شہداء بالاکوٹ کے خون نے دنیا کے سیاسی وجغرافیائی نقشے میں کوئی فوری تغیر نہیں پیدا کیا۔ خونِ شہادت کی ایک مختصری سُرخ لکیر اُبھری تھی۔ اُس کی جگہ نہ جغرافیہ نویس کے طبعی نقشے میں تھی، نہ مؤرّخ کے سیاسی مرقع میں، لیکن کسے خبر کہ یہ خونِ شہادت دفترِ قضاء وقدر میں کس اہمیت واثر کا مستحق سمجھا گیا۔ اُس نے مسلمانوں کے نوشتۂ تقدیر کے کتنے دھبے دھوئے۔ اُس نے اللہ تعالیٰ کے یہاں، جس کے یہاں محو واثبات کا عمل جاری رہتا ہے۔ (يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗ اُمُّ الْكِتَابِ. الرعد:۳۹) کون سے نئے فیصلے کروائے، اُس نے کسی مستحکم سلطنت کے لیے خاتمہ وزوال اور کسی پس ماندہ قوم کے لیے عروج واقبال کا فیصلہ کروایا، اس سے کس قوم کا بخت بیدار ہوا اور کس سرزمین کی قسمت جاگی۔ اس نے کتنی بظاہر ناممکن الوقوع باتوں کو ممکن بنا دیا اور کتنی بعید از قیاس چیزوں کو واقعہ اور مشاہدہ بنا کے دکھا دیا۔

یوں تو شہداءِ بالاکوٹ میں سے ہر فرد کا پیغام یہ ہے کہ "يَا لَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَلِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ۔(یٰسین:۲۶) مگر گوشِ شنوا اور دیدۂ بینا کے لیے ان کا مجموعی پیغام یہ ہے کہ ہم ایک ایسے خطۂ زمین کے حصول کے لئے جدوجہد کرتے رہے، جہاں ہم اللہ کے منشاء اور اسلام کے قانون کے مطابق آزادی کے ساتھ زندگی گزار سکیں، جہاں ہم دُنیا کو اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرے کا نمونہ دکھا کر اسلام کی طرف مائل اور اُس کی صداقت وعظمت کا قائل کر سکیں، جہاں نفس وشیطان، حاکم وسلطان اور رسم ورواج کے بجائے خالص اللہ کی حکومت و اطاعت ہو" وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ......(الانفال:۳۹) جہاں طاعت وعبادت اور صلاح و تقویٰ کے لئے اللہ تعالیٰ کی زمین وسیع اور فضا سازگار ہو اور فسق وفجور ومعصیت کے لیے زمین تنگ اور فضا ناسازگار ہو، جہاں ہم کو صدیاں گزر جانے کے بعد پھر "اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ......(الحج:۴۱) کی تفسیر

اور تصویر پیش کرنے کا موقع مل سکے۔ تقدیر الٰہی نے ہمارے لئے اس سعادت ومسرت اور اس آرزو کی تکمیل کے مقابلے میں میدانِ جنگ کی شہادت اور اپنے قُرب ورضا کی دولت کو ترجیح دی۔ ہم اپنے رب کے اس فیصلے پر رضامند وخورسند ہیں۔ اب اگر اللہ نے تم کو دنیا کے کسی حصے میں کوئی ایسا خطہ زمین عطا فرمایا، جہاں تم اللہ کے منشا اور اسلام کے قانون کے مطابق آزادی کے ساتھ زندگی گزار سکو اور اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرے کے قائم کرنے میں کوئی مجبوری عُذر اور کوئی بیرونی طاقت حائل نہ ہو، پھر بھی تم اس سے گریز کرو اور ان شرائط واوصاف کا ثبوت نہ دو، جو مہاجرین و مظلومین کے اقتدار اور سلطنت کا تمغۂ امتیاز ہیں۔ تو تم ایسے کُفرانِ نعمت اور ایک ایسی بدعہدی کے مرتکب ہوگے، جس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ ہم نے جس زمین کے چپے چپے کے لیے جدو جہد کی اور اس کو اپنے خون سے رنگین کر دیا، اکوڑے اور شیدو کے میدان اور تورو اور ملیار کی رزم گاہ سے لے کر بالاکوٹ کی شہادت گاہ تک ہمارے خونِ شہادت کی مہریں اور ہمارے شہیدوں کی قبریں ہیں۔ تم کو خدا نے اس زمین کے وسیع رقبے اور سرسبز وشاداب خطے سپرد فرمائے اور بعض اوقات قلم کی ایک جنبش اور برائے نام کوشش نے تم کو عظیم سلطنتوں کا مالک بنا دیا، ''ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ...... (یونس: ع۲) اب اگر تم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور تم نے آزادی کی اس نعمت اور خداداد سلطنت کی اس دولت کو جاہ واقتدار کے حصول اور حقیر وفانی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا، تم نے اپنے نفوس اور اپنے متعلقین، ملک کے شہریوں اور باشندوں پر خدا کی حکومت اور اسلام کا قانون جاری نہ کیا اور تمہارے ملک اور تمہاری سلطنتیں اپنی تہذیب و معاشرت اور اپنے قانون وسیاست اور تمہارے حاکم اپنے اخلاق وسیرت اور اپنی تعلیم و تربیت میں غیر اسلامی سلطنتوں اور غیر مسلم حاکموں سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے، تو تم آج دنیا کی ان قوموں کے سامنے، جن سے تم نے مسلمانوں کے لئے الگ خطۂ زمین کا مطالبہ کیا اور کل خدا کی عدالت میں جہاں اس امانت کا ذرہ ذرہ حساب دینا پڑے گا، کیا جواب دو گے؟ خدا نے تم کو ایک ایسا نادر وزرّیں موقع عطا فرمایا ہے، جس کے اِنتظار میں چرخِ کُہن نے سینکڑوں کروٹیں بدلیں اور تاریخِ اسلام نے ہزاروں صفحے اُلٹے، جس کی حسرت وآرزو میں خدا کے لاکھوں پاک نفس اور عالی ہمت بندے دنیا سے چلے گئے۔ اس موقع کو اگر تم نے ضائع کر دیا، تو اس سے بڑا تاریخی سانحہ اور

اس سے بڑھ کر حوصلہ شکن اور یاس انگیز واقعہ نہ ہوگا' بالا کوٹ کے ان شہیدوں کا' جو ایک دور افتادہ بستی کے ایک گوشے میں آسودۂ خاک ہیں' ان سب لوگوں کے لئے جو اقتدار و اختیار کی نعمت سے سرفراز اور ایک آزاد اسلامی ملک کے باشندے ہیں پیغام ہے کہ "فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا اَرْحَامَكُمْ." (سورۂ محمد: ع ۳)

(سیرت سید احمد شہیدؒ کے مقدمہ سے ماخوذ)

واقعہ ترنگ زئی

حاجی یوسف ترنگ زئی سرحد پر جہاد کرتے تھے۔ مولانا عبدالحنان صاحب نے بتایا کہ میں ان کے پاس ملاقات کے لئے گیا تھا۔ ترنگ زئی نے ان کو بتایا کہ ایک انگریز افسر کو جو یورپ کی جنگوں میں شریک رہ چکا تھا اس نے اپنے لوگوں سے کہا کہ یہ تو مٹھی بھر آدمی ہیں۔ ان کے پاس کوئی ٹرینگ نہیں ہتھیار نہیں پھر بھی ہم ان پر فتح نہیں پاتے۔ میں خود چلتا ہوں۔ چنانچہ وہ انگریز افسر خود میدان میں آیا۔ اس نے باقاعدہ اپنی فوجوں کو پھیلا کر لگا لیا۔ حاجی ترنگ زئی کہتے تھے کہ میرے چار بیٹے تھے۔ ایک بیٹا اس پہاڑی پر لگا دیا، دوسرا اس جانب۔ ایک دوسری جانب اور ایک اس جانب تھا۔ خود ترنگ زئی چل نہیں سکتے تھے، ہاتھ پیر چل نہیں سکتے تھے۔ چار پائی پر ان کو اٹھا کر لے جاتے تھے۔ انگریزوں نے ادھر سے اس کثرت سے گولہ باری شروع کر دی کہ گویا دھواں دار بارش ہو رہی ہو۔ حاجی ترنگ زئی خود کہتے تھے کہ ہمارے مجاہدان گولیوں میں اس طرح پھرتے تھے جیسے کہ بارش کی بوندوں میں پھرتے ہیں مگر کوئی اثر ان پر گولیوں کا نہیں ہوا۔ اس معرکہ میں چودہ مجاہد شہید ہوئے۔ ایک ہزار سے زائد آدمی انگریز کی فوج کے مارے گئے۔ خود وہ افسر بھی قتل ہوا اور مرنے سے پہلے کہہ گیا کہ حکومت سے کہہ دو کہ یہاں فتح کا خیال دل سے نکال دے۔ یہاں تو کوئی اور ہی طاقت کام کرتی ہے۔

ایک جنگ میں کافروں کے بڑے نے اعلان کیا کہ مسلمانوں کے لشکر کے امیر صلاح الدین کا سر جو شخص لے کر آئے گا اس کو میری لڑکی دی جائے گی۔ سارے کافر بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ بہت جوش و خروش کافروں کی طرف سے نظر آ رہا ہے۔ ان کو بتایا گیا کہ معاملہ یہ ہے اور اس طرح انعام کا اعلان کیا گیا ہے۔ ان صاحب نے کہا ایسا

کیوں نہیں کرتے کہ ان کی جوتی ان کے ہی سر۔ چنانچہ اعلان کیا گیا کہ مسلمانوں میں جو شخص رچرڈ کی بیٹی کو اٹھا لائے گا اسی کو دی جائے گی۔

یہ اعلان صبح سویرے نو بجے کے قریب کیا گیا تھا۔ شام کے قریب ہی ایک صاحب یہ کام پورا کر کے آئے کہ لیجئے یہ ہے وہ۔

غازی انور پاشاؒ کا آخری معرکہ اور شہادت

خلافت عثمانیہ کی بقاء کے لئے بیسویں صدی کے اوائل میں جو جنگیں لڑی گئیں اس میں ایک عظیم ترک جرنیل غازی انور پاشا نے یورپین حملہ آوروں کے مقابل سیاسی اور حربی میدان میں بے مثال جوہر دکھائے۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکیہ کی شکست وریخت کے بعد مصطفیٰ کمال سے اختلافات کی وجہ سے انور پاشا روس چلے گئے تاکہ وسطی ایشیاء کے ترکی النسل مسلمانوں اور افغانوں کی مدد سے احیائے خلافت کی کوشش کی جائے۔ اسی جہاد میں بالآخر وہ روسیوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

جولائی ۱۹۲۲ء تک غازی انور پاشاؒ کی حربی صلاحیت خاصی مفلوج ہو چکی تھی ان کے مسلمان جہادی ساتھی، ترکستان کے مقامی ''باسماچی'' شکست کھانے کے بعد تتر بتر ہو چکے تھے۔ روسی افواج کی فتوحات کی وجہ سے ہوا کا رخ تبدیل ہو گیا تھا ایسے میں افغانستان کے بادشاہ امان اللہ خان نے بھی ہاتھ کھینچ کر اپنے افغان رضا کار جنگجوؤں کو واپس بلا لیا تھا انورؒ اور ان کے چند وفادار ساتھی جانتے تھے کہ اب مکمل تباہی سے بچنا صرف اس طرح ممکن ہے کہ وہ سطح مرتفع پامیر کو عبور کر کے چینی ترکستان یا پھر افغانستان کی طرف نقل مکانی کر جائیں لیکن لفظ ''فرار'' یا ''اعتراف شکست'' اس خوددار مرد جری کی لغت میں موجود نہ تھا انور پاشاؒ نے اپنی اہلیہ کے ساتھ خط کے ذریعہ میدان جنگ سے بھی باقاعدگی سے رابطہ قائم رکھا اور یہیں سے انہوں نے اپنی اہلیہ کے نام زندگی کا آخری خط لکھا۔

یہ خط تاجکستان کے سرحدی گاؤں ستامیس **Sstslmis** سے لکھا گیا جو افغان سرحد سے صرف پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ اس وقت سرخ افواج نے انور پاشا اور ان کے تھکے ماندے ساتھیوں پر اپنا بے رحمانہ دباؤ بڑھایا تھا۔ دوشنبے کا شہر بھی ہاتھ سے نکل چکا تھا گاؤں کے

اردگرد جو حفاظتی چوکیاں قائم کی گئی تھیں وہ بے فائدہ ثابت ہوئیں کیونکہ انور پاشا کے بے قاعدہ غیر تربیت یافتہ مقامی ساتھی خندق میں جم کر لڑنے کے فن سے ناواقف تھے۔ دن بھر زخمیوں کو گاؤں کی طرف بھیجنے کے بعد انور کو فراغت کے چند لمحے خط لکھنے کے لئے میسر آ گئے۔ انہوں نے لکھا:

''آج موسم بہت اداس ہے ایک عجیب سی دھند فضا میں چھائی ہوئی ہے جس کی وجہ سے سورج کی روشنی ناکافی محسوس ہو رہی ہے دشمن کی صفوں میں کوئی حرکت دکھائی نہیں دے رہی۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ آخری وقت قریب ہے انہوں نے لکھا ''اے میری جان میری عزیز اہلیہ میں تمہیں خدائے واحد کے سپرد کرتا ہوں اب مجھے یہ خط ختم کرنا چاہئے جو جنگلی پھول ہیں ہر روز تمہیں ارسال کرتا رہا ہوں۔ ان کے ساتھ آج میں اس درخت کی ایک شاخ بھی بھیجتا ہوں جس کے سائے تلے ابھی ابھی میں نے آرام کی چند گھڑیاں بسر کی ہیں اور جس کے تنے پر میں نے تمہارا پیارا نام کندہ کر رکھا ہے''۔

انور پاشاؒ کی اہلیہ کو اس کے بعد اور کوئی نامہ ان کی طرف سے کبھی موصول نہ ہوا۔

دس روز بعد ۴ اگست ۱۹۲۲ء کو بالآخر موت نے اسلامی دنیا کے عظیم رہنما انور پاشاؒ کو آلیا وہ دنیا سے اس طرح رخصت ہوئے جس کی سرفروش ترک سپاہی ہمیشہ تمنا کرتے ہیں یعنی بے مثال بہادری اور شجاعت کی شہادت۔

اس صبح کو انور پاشاؒ کے مٹھی بھر رفقاء اور معتقدین نے جو زیادہ تر ترک قوم سے تعلق رکھتے تھے عیدالاضحیٰ منائی اور قربانی کی رسم آب دریا کے گاؤں میں انجام دی یہی گاؤں شہید کا آخری پڑاؤ تھا انور پاشاؒ شہید نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک کچے مکان میں ایک آخری ملاقات کر کے تہنیت اور تحائف کا تبادلہ کیا زمین پر جانوروں کی قربانی سے بہنے والا خون پھیلا ہوا تھا سب حاضرین کو صورت حال کا پورا ادراک تھا کہ روسی افواج نے ان کو مکمل گھیرے میں لے رکھا ہے اس ملاقات کے بعد دوبارہ ملنے کے امکانات بالکل معدوم تھے۔

شوکت عادمیر نے اس المناک الوداعی ملاقات کا حال یوں بیان کیا ہے:

''انور پاشاؒ نے عیدالاضحیٰ کی نماز اپنے باقی ماندہ (تقریباً تمیں) ساتھیوں کے ساتھ ادا کی اور سپاہیوں میں تھوڑی تھوڑی رقم تقسیم کی۔ افسران کے لئے کچھ نہ بچا اس کی

بجائے ان کو باہمی رفاقت کی نشانی کے طور پر تحریری اعزاز سے نوازا گیا ہر سرٹیفکیٹ پر افسر کا درجہ' انور پاشاؒ کے دستخط اور مہر ثبت تھے۔

اسی دوران اچانک ایک پیغام کے ذریعہ انتباہ موصول ہوا کہ تین سو روسی فوجی گاؤں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد ہی گولہ باری کی آواز سنائی دینے لگی جو انور پاشاؒ کے خارجی چوکیوں سے دشمن پر کی جارہی تھی بہادر سپہ سالار تلوار سونت کر ایک دم اپنے گھوڑے پر کود کر جا بیٹھا جو لوگ اس معرکے سے کسی طرح بچ نکلے ان کے بیان کے مطابق انور پاشاؒ سرپٹ گھوڑا دوڑاتے دشمن کے عین سامنے جا پہنچے۔"

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

ان کے گھڑ سوار ساتھی شمشیر بکف برق رفتاری سے ان کے پیچھے پیچھے آرہے تھے انگریز مصنف لکھتا ہے کہ اس بے مثال' بے خوفی کے مظاہرے کا مقابلہ انگریزوں کے ہیرو' مثالی لائٹ بریگیڈ کے مشہور حملے Charge of the light brigade سے ہی کیا جاسکتا ہے جسے انگریزی افواج اپنی بہادری کا بہت بڑا کارنامہ قرار دیتی ہیں۔ ان پچیس تلواریں لہراتے ہوئے سواروں کے اللہ اکبر اور "فتح یا شہادت" کے نعروں میں برستی گولیوں کے سامنے حملہ کرنے کے انداز نے روسی کمانڈر قلی قوف کے سپاہیوں کو کچھ دیر کے لئے مبہوت کر دیا۔

ترک مجاھدین دشمن کی پہلی مشین گن پر پل پڑے اور اسے خاموش کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن باقی دو مشین گنیں سامنے سے بڑھتے ہوئے سواروں پر زبردست گولہ باری کرتی رہیں انور پاشاؒ سب سے آگے تھے اور وہ سب سے پہلے گرے اور وہ اپنے سلیٹی رنگ کے گھوڑے "درویش" سے گر گئے۔ گھوڑے کو بھی گولیاں لگیں وہ گھٹنوں کے بل گرا اور پھر لڑھکنے لگا انور پاشاؒ کے تلوار بکف رفقاء گولیوں کی مسلسل برسات کا سامنا کرتے ہوئے ایک کے بعد ایک گرتے رہے آخر تلواریں مشین گنوں کا کب تک مقابلہ کرسکتی ہیں چند ہی منٹوں میں سب تمام ہو گیا۔ پہاڑی کے دامن میں شہداء کے لاشے' قریب المرگ زخمی سپاہی اور گھوڑوں کے اجسام بکھرے ہوئے تھے۔ ایک دو زخمی کسی طرح بچ کر نکل کر گاؤں والوں کو المناک انجام کی کہانی سنانے کے لئے پہنچے مگر مقامی قبائلی' "باساچی" گاؤں خالی کر کے جا چکے تھے۔

قلی کوف کے آدمیوں نے نعشوں کا معائنہ کرنے کے لئے ان کو مکمل طور پر بے لباس کر دیا وہ شناختی کاغذات کی تلاش میں تھے ایک جوان رعنا کی لاش کو دیکھ کر وہ کچھ حیران ہوئے جوتر کی طرز کے خاکی کوٹ میں ملبوس اور تسموں والے جرمن بوٹ پہنے تھا لیکن اس کی چست پتلون اور استر خوانی ٹوپی کا ڈیزائن انہوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا اس کی تلوار بھی مختلف طرز کی تھی اور دوربین بھی غیر ملکی ساخت کی تھی ایک جیب سے کچھ خطوط نکلے ایک خط نامکمل تھا اس کی جیب سے قرآن مجید کا ایک چھوٹا سا نسخہ بھی ملا۔ معائنہ سے پتہ چلا کہ اسے سات گولیاں لگی تھیں روسی کمانڈر اس اجنبی کی یقینی شناخت نہ کر سکا اس لئے اس نے برآمد کی گئی تمام اشیاء اور کاغذات ماہرین کے معائنہ کے لئے اپنے ہیڈ کوارٹر تاشقند بھیج دیئے روسی سپاہی عجلت میں گمنام مجاہد کے جسد خاکی کو اس کے خون آلود کپڑوں پر پڑا چھوڑ کر باسماچی باغیوں کے تعاقب میں چلے گئے۔

دو روز بعد ایک مسلمان عالم دین کا ادھر سے گزر ہوا تو اس نے نعش کو دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ اس عظیم الوطن مسلمان مجاہد کی لاش ہے جو اپنے ملک ترکیہ سے تنسیخ خلافت کے بعد لادین (سیکولر) ترک حکومت سے گردن زدنی قرار پایا اور احیائے خلافت کے لئے متبادل ملک میں اسلامی حکومت کے قیام کا سہانا خواب لے کر روسی ترکستان کی طرف ہجرت کر کے آیا تھا گاؤں والوں نے فوراً سب شہداء کے اجسام اور باقیات کو اکٹھا کیا روسی تب تک وہاں سے روانہ ہو چکے تھے تجہیز و تکفین کا بندوبست ہو رہا تھا کہ انور پاشاؒ شہید کی لاش کی دریافت کی خبر چاروں طرف پھیل گئی ایک اطلاع کے مطابق کوئی پندرہ ہزار سوگوار دور و نزدیک سے اس کرشمہ ساز ہیرو کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے جمع ہو گئے جوان کے ہمراہ ایک عظیم جہاد میں شرکت کے لئے ان کے ملک میں وارد ہوا تھا۔

جنازہ کے بعد شہید کو ایک اخروٹ کے درخت کے تلے ''آب دریا'' کے کنارے ایک بے نشان قبر میں دفن کیا گیا یہ علاقہ ترکی النسل قوم کا مسکن ہے شہید کی خواہش بھی یہی تھی کہا جاتا ہے کہ اب تک ہر سال انور پاشاؒ کی برسی کے موقع پر دور دور سے ان کے مجاہد ساتھیوں کی اولاد کے لوگ ان کی تنہا قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے آتے ہیں اور شہید کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(۱۸ ستمبر ۲۰۰۲ روزنامہ اوصاف ملتان)

★

فلسطین میں یہودیت کب، کیوں اور کیسے داخل ہوئی؟

۱۹۳۶ء میں ''اعلان بالفور'' کے تحت یہ طے پایا تھا کہ یورپ اور دیگر علاقوں سے ہجرت کر کے فلسطین میں آباد ہونے کے لیے ہر ماہ تین ہزار یہودی فلسطین میں داخل ہوسکیں گے۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوگئی تو یورپ سے یہودیوں کا اخراج وسیع پیمانے پر شروع ہو گیا۔ بلکہ نازی ڈکیٹر ہٹلر کے برسراقتدار آجانے کے بعد ہی جرمنی سے یہودیوں کو جبراً نکالنا شروع کردیا گیا تھا۔ دوران جنگ جوں جوں یورپی ممالک پر نازیوں کا قبضہ ہوتا چلا گیا یورپ سے یہودیو فرار نے ایک خطرناک صورت حال پیدا کردی فلسطین میں ماہوار تین ہزار یہود کے داخلہ کا کوٹا کاغذ پر ہی رہ گیا۔ یہودی ہر ماہ دس دس' بارہ بارہ ہزار کی تعداد میں آنے لگے' چونکہ وہ ایک متمول قوم کی حیثیت رکھتے تھے اس لئے سپیشل جہاز چارٹر کر کے فلسطین پہنچتے تھے۔ بالفور ڈیکلریشن کے مطابق ہر ماہ تین ہزار یہودی بلا روک ٹوک اور اپنے کاغذات سفر کے بل بوتے پر فلسطین کی بندرگاہوں پر اتر جاتے تھے اس کے بعد باقی ہزاروں یہودیوں سے بھرے ہوئے جہاز ساحل فلسطین سے پیچھے ہٹ کر بین الاقوامی سمندروں میں لنگر انداز ہوجاتے یہودی مہاجرین رات کی تاریکی میں چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں اتر کر یا تیر کر سمندر سے ساحل پر جا پہنچتے اور پھر وہ دن بھر پہاڑوں کی غاروں میں کھجوروں کے درختوں کے ذخیروں میں' کھیتوں' ریت کے ٹیلوں کی اوٹ میں چھپتے رہتے اور راتوں رات سفر اختیار کر کے یہودی بستیوں کا رخ کرتے۔ سینکڑوں عربوں کی گولیاں کا نشانہ بن جاتے تھے سینکڑوں سمندر پار کرتے وقت ڈوب جاتے تھے' اور سینکڑوں دیگر حادثات کا شکار ہوجاتے تھے' لیکن ہزاروں گرتے پڑتے یہودی بستیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

یہودیوں نے فلسطین میں بالکل ایسا ہی نظام قائم کر رکھا تھا جیسا کہ ہمارے ہاں بنیادی جمہورتیوں کی شکل میں موجود ہے لیکن ان کی یونین کونسلیں جو ''غیطو'' کہلاتی تھیں محض انتخابی اداروں اور برسراقتدار پارٹی کی آلہ کار نہ تھیں' بلکہ وہ حددرجہ فعال اداروں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ''غیطو'' ہی یہودیوں کی پنچائت ہوتی تھی۔ وہی میونسپلٹی ہوتی تھی وہی عدالت ہوتی تھی اور وہی ایک ایسی حکومت کا مضبوط پرزہ ہوتی تھی۔ جو دراصل قائم ہو چکی تھی' لیکن ابھی اس کے وجود کا اعلان نہیں ہوا تھا۔

یہودی مہاجر ''غیطو'' میں رپورٹ کر کے اسے اپنے تمام کوائف سے آگاہ کر دیتے تھے' اور پوری دیانت داری سے بتا دیتے تھے کہ وہ جہاں سے ہجرت کر کے آئے تھے وہاں ان کی حیثیت کیا تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ جو کچھ بھی اپنے ساتھ لا سکتے تھے مثلاً بانڈز' شیورٹیاں' سیکورٹیاں' جواہرات' زیورات' سونا وغیرہ وغیرہ وہ سب کا سب ''غیطو'' کے بیت المال میں جمع کرا دیتے تھے' یہودیوں کا یہ بیت المال مختصر سی مدت کے اندر اندر اربہا پاونڈ کی مالیت تک پہنچ گیا۔ فلسطینی عربوں کا یہ حال تھا کہ چند قبائل کے شیوخ کو چھوڑ کر باقی سب مفلس اور قلاش تھے۔ یہودیوں نے اپنے بیت المال سے ان سے کوڑیوں کے مول زمینیں خریدنی شروع کر دیں' اور دوسرے ممالک سے لا تعداد ٹریکٹر اور بلڈوزر درآمد کر دیئے۔ مشینری منگوالی اور ہر بستی میں تعمیراتی سامان کے ذخیرے جمع کر دیئے۔ ہر مہاجر یہودی کنبے کو اس کی حیثیت کے مطابق رہائشی مکان کی تعمیر کے لئے پلاٹ الاٹ کر دیا جاتا۔ مکان کا نقشہ دے دیا جاتا ''غیطو'' کے سٹور سے سامان تعمیر فراہم کر دیا جاتا کہ وہ سب سے پہلے سر چھپانے کے لئے مکان تعمیر کر لیں۔ مکان کا کرایہ اس حساب سے مقرر ہوتا تھا کہ ۱۹ برس میں مکان کی قیمت ادا ہو جائے' اور مالکانہ حقوق قابض کو تفویض کر دیئے جائیں۔

بنجر زمینیں کوڑیوں کے مول عربوں سے خرید کر ٹریکٹر اور بلڈوزروں کی مدد سے ہموار کر کے قابل زراعت بنائی گئیں' ٹیوب ویل نصب کئے گئے' مرد زمینوں کو درست کرنے میں مصروف رہنے لگے تو عورتیں اور بچے مکانات کی تعمیر اور گھریلو صنعتوں سے متعلق مختلف سرگرمیوں میں لگ گئے' [illegible] نے دیکھا کہ ہم تین چار سال پہلے فوجی نقل و حرکت کے سلسلہ میں جن ایسے [illegible] گئے تھے جہاں ریت کے سوا [illegible] ہوتا تھا اور ان [illegible] پر عرب تربوز کے بیج یا مکئی

یا گیہوں کے بیج پھینک دیتے تھے اور اگر بارش ہو جائے تو اچھی بری فصل پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ ریت کے ٹیلے اور صحرا مالٹے ناشپاتی خوبانی اور دیگر ثمر دار اشجار کے باغات میں تبدیل* ہو چکے تھے' ان باغات سے ملحق فروٹ انڈسٹری کی فیکٹریاں قائم ہو چکی تھیں' جن میں لڑکے لڑکیاں اور عورتیں دن رات پھل میووں کی اشیاء تیار کرتی دیکھی جاتی تھیں اور اس صنعت پر یہودیوں کی مکمل اجارہ داری قائم ہو گئی تھی' چنانچہ اتحادیوں کی افواج متعینہ مشرق وسطیٰ کی کینٹینوں اور نافی شاپس (NAHFI SHOPS) ''نیوی آرمی اینڈ ائیر فورس انسٹی ٹیوٹ کی دکانیں'' میں مشروبات اور نفیس اغذیہ مثلاً شرابیں شربت' اچار' چٹنیاں' مربے' مارملاڈ۔ کیک جام اور ڈبوں میں بند ہر قسم کی اشیاء انہی یہودیوں فیکٹریوں کی ہوا کرتی تھیں' شاید ہی ان میں سے کوئی ایسی چیز ہو جس پر (MADE IN PALESTINE) نہ لکھا ہو۔

اس کے ساتھ ہی قومی رضا کاروں اور لیبر کور کے نام سے یہودیوں نے نوجوانوں کو فوجی تربیت بھی دینا شروع کر دی۔ اور جب ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کی حکومت قائم ہوئی اور مشرق وسطیٰ کی چھاتی پر یہ ناسور عملی طور پر وجود میں آ گیا تو وہاں پہلے سے صنعت و حرفت بھی موجود تھیں۔ بنک بھی تھے' تجارتی سنڈی کیٹ بھی تھے' فوج بھی تھی' آب پاشی' صنعت و حرفت' زراعت اور کان کنی سے متعلق تمام سکیمیں اور منصوبے بھی پہلے سے تیار تھے' یہودیوں نے سب سے زیادہ ترقی قرآن حکیم اور انجیل سے استفادہ کر کے کی۔

ایک خاص ریسرچ سنڈی کیٹ قائم کیا گیا جس میں عربی اور طبرانی زبانوں کے ماہر مذہبی لیڈر سال بھر تحقیق و تدقیق میں مصروف رہتے تھے' یہودیوں کے پاس اپنی الہامی کتاب تورات تو تھی ہی نہیں لیکن انہوں نے قرآن حکیم اور قدیم انجیل کی آیات کے مطالعہ اور ان کے مضامین کے تجزیہ اور مزید تحقیق سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے عاد و ثمود کی قوم پر قہر خداوندی کا نزول آگ اور پتھر کیسے بستیوں پر برسے' اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ وہاں یقیناً زمین کے نیچے آتشگیر مادوں مثلاً گیس یا تیل کے ذخائر ہوں گے پیغمبروں کی اس سرزمین میں سروے کیا گیا وہ جگہ ڈھونڈ لی گئی جہاں عاد و ثمود آباد تھے اور وہاں سے پٹرول نکال لیا۔ حضرت سلیمان کی تانبے کی کانوں کا ذکر انجیل میں پڑھا تو بحیرہ روم کے کنارے تانبے کی کانیں دریافت کر لیں' جن سے سالانہ دو لاکھ ٹن

تانبہ نکالا جاتا ہے۔

انجیل میں پڑھا کہ فلاں مقام پر حضرت داؤد علیہ السلام اپنی گائیں چرا رہے تھے' گائیں ادھر ادھر پھیل گئیں' لیکن لحنِ داؤدی سنتے ہی وہ پھر اکٹھی ہوگئیں اس واقعہ کا بھی تجزیہ شروع کیا گیا۔ اگر اس زمانے میں حضرت داؤد وہاں گائیں چراتے تھے تو یقیناً گھاس اور درخت ہوتے ہوں گے' اور نباتات پانی کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتی' یہ جگہ اب لق ودق بنجر علاقہ ہے' وہ پانی کہاں سے آتا تھا؟ اسرائیل میں سالانہ صرف (سوا تین انچ) بارش ہوتی ہے' پھر اس زمانے میں یہ علاقہ شاداب کیونکر تھا؟ بس جناب متعلقہ محکموں کے ماہرین نے تحقیق اور سروے شروع کر دیئے اور دو سال کے اندر اندر یہ انکشاف ہوا کہ اس علاقے میں دو ہزار سال سے مٹی کے پہاڑوں کا ٹوٹا پھوٹا سلسلہ سمجھا جاتا رہا تھا۔ وہ دراصل داؤد علیہ السلام کے زمانے میں ایک بڑا (DAM) بند تھا۔ اس ٹوٹے پھوٹے بند کو از سرِ نو درست کیا گیا اور سال بھر میں (سوا تین انچ) بارش سے اتنا پانی کا ذخیرہ جمع کر لیا گیا کہ اس ڈیم سے نہریں نکال کر خشک زمینوں کی آب پاشی کر کے اس علاقے کو زرخیز زرعی علاقے میں بدل دیا گیا غور کرنے کا مقام ہے کہ "یقین محکم" اور کسے کہا جاتا ہے قرآن اور انجیل سے عملی استفادہ کون کر رہا ہے؟ اتحاد' اخوت' محنت' دیانتداری' اور استقلال ایسے اوصاف ہیں جنہیں قدرت کے عالمگیر قوانین کی حیثیت حاصل ہے ان پر کافر اور ملحد بھی عمل پیرا ہو تو اسے فائدہ پہنچے گا۔ اور ان سے انحراف کرنے والے مومن اتنا ہی نقصان اٹھائیں گے جتنا کہ ان پر عمل کرنے والے غیر مومن فائدہ اٹھا سکیں گے۔

دنیائے عرب کی افسوسناک حالت

یہودیوں کے مقابلے میں راقم الحروف نے عربوں کی زندگی بھی دیکھی بیان کرتے ہوئے دکھ ہوتا ہے' لیکن اس کا کیا علاج کہ عربوں کے طور بتا رہے تھے کہ ایک نہ ایک دن ان پر ضرور کڑی آزمائش کی گھڑی آئیگی اور یہودی قوم اتحاد یقین محکم اور تنظیم کی بدولت کامیابی حاصل کر لے گی' عرب زمینداروں اور کسانوں کی اکثریت تربوز۔ مکئی۔ گندم۔ جو یا دیگر اجناس کی کھڑی فصلیں یہودیوں کے ہاتھ فروخت کر دیتی تھی۔ اور اعراب فلسطینی ہوں یا عراقی ہوں یا اردنی عرب' قیمت وصول کر کے چند دینار بال بچوں کو قوت لایموت کے لئے دے کر باقی رقم اپنے کیسوں میں بھر کر

شہروں کا رخ کر لیتے اور دو تین مہینے وہاں دن بھر جوا کھیل کر اور راتیں لہو ولعب اور عیاشی کے مشغلوں میں گزار کر پھر قلاش گھروں کو لوٹ آتے تھے۔

عبا و قبا میں ملبوس باریش اور ایمان افروز صورتوں والے اعراب قحبہ خانوں میں اور بازار حسن میں ہر طرح کی اخلاق سوز حرکات کرتے دیکھے جاتے تھے' بازاروں اور گلی کوچوں میں عرب بھکاریوں اور اور بھکارنوں کے سوا کبھی کسی اور قومیت کا فرد بھیک مانگتا ہوا نظر نہ آیا۔ حتیٰ کہ یہ بھی المناک منظر دیکھنے میں آیا ہے کہ اچھی خاصی پوزیشن میں ملبوس عرب بچے سکول جارہے ہیں اور راہ میں جاتے جاتے ہندوستانی فوجیوں سے "رفیق بخشیش" کی صدا لگا کر دو چار فلس کی بھیک وصول کر رہے ہیں۔ دکاندار بددیانت اور جھوٹے' تاجر مکار' سرکاری ملازم راشی اور متمول افراد عیاش۔

تفرج اور تعیّش

ایک قابل ذکر واقعہ ملاحظہ ہو' عراق میں اگرچہ کونسل آف ایجنسی قائم تھی کیونکہ شاہ فیصل ثانی مرحوم نابالغ تھے' اور حکومت امیر عبداللہ اور وزیر اعظم نوری السعید پاشا کی کہی جاتی تھی۔ لیکن دراصل عراق میں چند قبائل شیوخ کا راج تھا دوسری عالم گیر جنگ کے دوران ان کو حکومت برطانیہ ششماہا وظائف دیتی تھی۔ جسے **SUBSIDY** کہا جاتا تھا۔ اور ہر وظیفہ لاکھوں پونڈ ہوتا تھا۔ یہ شیوخ ہر چھ ماہ بعد بغداد میں آ کر اپنے وظائف برطانوی سفارت خانے سے وصول کیا کرتے تھے' اور دو دو ہفتے ایک ایک ماہ بغداد میں قیام کر کے دادِ عیش دیا کرتے تھے اور اس عیش کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ جب رات کے وقت قحبہ خانوں یا کیبریز **CABARETTES** یعنی رقص خانوں میں جاتے اور پیشہ ور رقاصاؤں اور بیسواؤں کو ایک رات کے لئے باقاعدہ نیلامی کی بولیوں کی طرح بولیاں دے کر حاصل کیا جاتا تھا۔ اور بعض اوقات ایک رات کی عیاشی کے لئے بولی تین ہزار دینار یعنی ۴۰'۴۰ ہزار روپے تک جا پہنچتی تھی۔

غرضیکہ جہاں اسرائیل کی سنگلاخ زمین سے نکال کر بنجر اراضی کو سبزہ زاروں کھیتوں اور باغات میں بدل کر' پہاڑوں کے جگر چیر کر معدنیات نکال کر اور عورتوں اور بچوں کو لیبر فورس میں بدل کر اور مردوں کو مشقت پسند اور جفاکش مزدور یا سپاہی بنا کر یہودیوں نے بے پناہ طاقت حاصل کر لی وہاں عربوں کو قدرت نے تیل کی دولت تو بخشی لیکن وہ تیل ان کے حق میں لہو ولعب اور تعیش کا

زہر قاتل بن گیا۔

میں نے ۱۹۴۵ء کے جون کے مہینہ میں یروشلم اور حیفا کے درمیان سفر کرتے ہوئے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ سخت گرمی پڑ رہی تھی اور درجہ حرارت ۱۲۲ تھا ہر دس بارہ میل کے بعد مجھے بارہ سال کی عمر سے لے کر پندرہ سولہ سال تک کے لڑکوں اور لڑکیوں کے گروہ دکھائی دیئے جو خاکی وردیوں میں ملبوس تھے' پیدل مارچ کر رہے تھے' اور چلتے چلتے تنکوں کی ٹوپیاں ریشم یا اون کی نکٹائیاں' کاغذ کے پھول اور کھلونے بناتے جاتے تھے' آخر ایک گروہ کو روک کران کے مونیٹر سے میں نے پوچھا کہ وہ کیا کرتے پھرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ یہودی بچوں کو گرمی کی تعطیلات کے لئے یہ کام ملا ہے کہ وہ آٹھ ہفتوں کے اندر اندر حیفا سے یروشلم تک آنے جانے کا سینکڑوں میل کا سفر پا پیادہ کریں ریل۔ بس یا کسی سواری پر ایک درہم بھی صرف نہ کریں کسی کا عطیہ قبول نہ کریں۔ خود چیزیں بنائیں بیچیں اور ان سے حاصل شدہ آمدنی سے اپنی ضروریات پوری کریں' انہیں ہر قریہ' ہر قصبہ اور ہر شہر کے ''غیطو'' سے یہ تصدیق کرانا ہوتی تھی کہ وہ ان اصولوں پر عمل کر رہے تھے' ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ یہودی قوم اپنی آنے والی نسل کو کس قدر جفاکش مشقت پسند اور باحوصلہ بنا رہی تھی۔ چنانچہ یہی وہ بچے تھے جو ۱۹۵۶ء میں جوان ہو چکے تھے' اور جنہوں نے اس زمانہ میں بھی مصری افواج کو بری طرح پیٹا تھا۔ (''عرب اور اسرائیل'' سے ماخوذ)

ملا محمد عمر کا اچانک ظہور

یہ اکتوبر ۱۹۹۴ء کی ایک شام تھی۔ افغانستان کے جنوبی شہر قندھار کے مضافات میں براتیوں سے بھری ایک بس جا رہی تھی۔ اچانک ایک سنسان سی جگہ جدید ترین اسلحے سے لیس ایک گروہ نے بس روک لی۔ ان کا تعلق ''عصمت ملیشیا'' نامی ایک گروہ سے تھا جو خود کو ''مجاہدین'' کہلواتے تھے۔ گروہ کے کمانڈر نے تمام مسافروں کو نیچے اتار کر قیمتی سامان اور نقدی حوالے کرنے کا حکم دیا۔ اچانک اس کی نظر روایتی قبائلی عروسی لباس میں ملبوس دلہن پر پڑی۔ دلہن کی خوبصورتی نے اسے سحر زدہ کر دیا اور اس کے شیطانی ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے بڑے کرخت لہجے میں براتیوں سے کہا کہ یہ تو ہمارے قبیلے کی خاتون ہے جو کچھ عرصہ قبل گم ہو گئی تھی۔ تم لوگوں کو ہمت کیسے

ہوئی ہماری ''عزت'' پر ہاتھ ڈالنے کی۔ یہ کہہ کر اس نے بلاتوقف اپنی اسٹین گن سیدھی کی اور دلہا کو گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ اس کے ساتھیوں نے دلہن کو پکڑا اور جیپ میں ڈال دیا۔ مزاحمت کرنے پر دو اور افراد کو گولی مار دی گئی۔ یہ گروہ اس بہیمانہ واردات کے بعد آناً فاناً غائب ہو گیا۔

مسافروں میں ایک ۳۷ سالہ مجاہد طالب علم بھی شامل تھا جو نہتا ہونے کے باعث بے بس کھڑا تھا۔ یہ غیور افغان غصے سے پیچ و تاب کھاتا ہوا قندھار اپنے مدرسے میں پہنچا۔ عصمت ملیشیا کی اس درجہ گھٹیا کارروائی سے وہ دنگ رہ گیا۔ افغانستان میں جاری اقتدار کی رسہ کشی اور نام نہاد جہادی لیڈروں کے لالچ اور منافقت سے وہ پہلے ہی تنگ تھا۔ اس نے علاقے کے علماء کو بلایا اور انہیں بتایا کہ نام نہاد مجاہدین یہ کچھ کر رہے ہیں۔ علماء نے متفقہ طور پر فتویٰ دیا:

''ان چوروں، ڈاکوؤں، قاتلوں اور لٹیروں کے خلاف جہاد فرض ہے۔ جہاد کرتے ہوئے جو مارا جائے گا وہ شہید کہلائے گا جبکہ مخالفین میں سے جو مرے گا وہ مردار اور جہنمی ہوگا۔''

ملا عمر نامی اس مجاہد نے اس فتوے کے بعد علماء، دکانداروں اور دوسرے شرفاء کی مدد سے ''طالبان'' کو منظم کیا اور سپین بولدک سے جہاد کا آغاز کر دیا۔ طالبان نے عصمت ملیشیا اور اس کے کمانڈر امیر لالہ کا خاتمہ کر دیا۔ برہان الدین ربانی کا کمانڈر نقیب اللہ اور حکمت یار کا کمانڈر سرکاتب بھی جرائم پیشہ تھے، لہٰذا ان کا بھی سر کچل دیا گیا۔ طالبان کا منشور بہت مختصر تھا:

''امن و امان قائم کریں گے، راستے کھولیں گے، زنجیریں توڑیں گے اور اسلامی شریعت نافذ کریں گے۔''

قرآن مجید کو انہوں نے ہاتھ میں لیا اور نکل پڑے۔ لوگ ربانی، حکمت یار کی جنگ اور دیگر جرائم پیشہ عناصر سے تنگ آئے ہوئے تھے، اس لئے انہوں نے طالبان کا خیر مقدم کیا۔ دیگر جماعتوں کے مجاہدین اور علاقائی کمانڈر اس میں شامل ہوتے گئے۔

مذکورہ بالا واقعے کے راوی معروف کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی ہیں۔

(اردو ڈائجسٹ اکتوبر ۱۹۹۸ء۔ از محمد عامر ہاشم خاکوانی)

......☆......

ورلڈٹریڈسنٹر

(۱۱ستمبر۲۰۰۱ء میں تباہی سے قبل ایک پاکستانی سیاح کے مشاہدات)

''ہم گھر سے دنیا کی سب سے زیادہ بلند عمارت ورلڈ ٹریڈسنٹر دیکھنے کا ارادہ کر کے نکلے تھے۔ مین ہٹن پہنچنے کے بعد لبرٹی مارکیٹ اور ویسٹ کے درمیان واقع ۱۱۶ ایکڑ رقبے پر محیط بنکوں' ریستورانوں' دکانوں' دفاتر اور تجارتی نمائش کی دلچسپ جگہوں کو دیکھتے ہوئے اب ہم دو ایک جیسے بلند ٹاورز کے قدموں میں کھڑے تھے۔ ورلڈٹریڈسنٹر کے نام سے تو ہم اس وقت سے واقف تھے جب ایمپائرسٹیٹ بلڈنگ کی بلند ترین عمارت کی حیثیت سے شہرت دھندلانے لگی تھی۔ تصاویر بھی اکثر و بیشتر نظروں سے گذرتی رہتی تھیں لیکن آج جب ہم اس کے بالکل سامنے کھڑے تھے تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ان ٹوئن ٹاورز میں سے ہر ایک کی ۱۱۰منزلیں ہیں۔ ٹاور نمبر۲ کے اوپر کی منزل مشاہداتی کہلاتی ہے۔ یہ ٹاورز مین سے ۱۳۷۷فٹ بلند ہیں اور ان کی سیر کرنے کے لئے لائن میں کھڑے ہو کر ٹکٹ لینا پڑتا ہے۔ قطار بڑے لان کے آخری سرے تک جا کر پھر مڑ آتی تھی اس طرح ٹریڈسنٹر کے نیچے سارا خالی پلیٹ فارم ان لائنوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم بھی لائن میں لگ گئے۔ نیویارک کی رنگارنگی یہاں پوری طرح عیاں تھی۔ ان لائنوں میں چینیوں اور کوریائی باشندوں کے علاوہ پاکستانی۔ ہندوستانی خاص طور پر مدارسی اور کیرالہ والوں کے علاوہ پاکستانیوں کی بھاری اکثریت قدم قدم آگے بڑھ رہی تھی۔ فیملیاں ہی فیملیاں نظر آرہی تھیں۔ ہر فیملی عام طور پر اپنے روائتی لباس میں تھی اور آپس میں اپنی اپنی بولیاں بول رہی تھیں۔ ہندوستان اور کراچی کے لوگ اردو بولتے تو صاف پہچانے جاتے اور پنجاب سے آئے ہوئے لوگ بھی اپنی شکلوں لباس اور بولی کی وجہ سے نمایاں تھے۔ ایک چیز جو قدرے کھٹکتی تھی وہ یہ کہ یہ پتہ چل جانے کے باوجود بھی کہ ہم سے آگے پیچھے یا ساتھ کھڑے ہوئے لوگ ہمارے اپنے وطن کے ہیں' کوئی ایک دوسرے سے سلام دعا یا تعارف کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا اور اس دیار غیر میں بھی ایک زبان ایک کلچر اور ایک وطن سے تعلق ہونے پر بھی ہر ایک دوسرے سے اجنبیت کی دیوار حائل رکھنا چاہتا تھا۔ ہندوستانی عورتیں یہاں بھی پان چبا رہی تھیں۔

گجراتی اور کاٹھیاواڑی عورتیں گھٹیا ساڑھیوں میں ملبوس تھیں ایسی ساڑھیاں جن میں وہ اپنے پورے پیٹ اور کمر کو چھپانے کی بالکل ضرورت محسوس نہ کرتیں۔ پنجابی عورتیں قمیص شلوار اور سکھ عورتیں بھی کم وبیش اسی لباس میں تھیں۔ قطاریں لمبی ہونے کے باوجود ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے اندر سارے فاصلے طے کر کے ہر ایک لفٹ کے دروازے تک پہنچ جاتا تھا اور رنگا رنگ کے لوگوں کے مطالعہ میں یہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گذرتے پتہ بھی نہ چلتا۔

۱۹۹۰ء میں اسی ٹریڈ سنٹر ٹاور کو دھماکے سے اڑانے کی کوشش کی گئی جس میں چھ سیاح ہلاک اور ۲۰۰ زخمی ہو گئے تھے۔ بعد میں دھماکہ کرنے کے الزام میں نیوجرسی کی ایک مسجد کے نابینا امام **عمر عبدالرحمٰن** اور اس کے بہت سے عقیدت مندوں کو حراست میں بھی لیا گیا جن پر ایک عرصہ تک مقدمہ چلتا رہا۔

ٹریڈ سنٹر کی آبزرویشن ڈیک زمین سے چوتھائی میل بلند ہے۔ اور یہاں کھڑے ہوئے آپ کو پورا نیویارک اپنے قدموں میں محسوس ہوگا جس کے مختلف حصے ہمہ جہت بکھرے پڑے ہوں گے۔ جنوب میں نیویارک بندرگاہ اور عظیم الشان مجسمہ آزادی اور تاریخی جزیرہ ایلس نظر آئے گا جب کہ شمال میں نیویارک مڈٹاؤن کی فلک بوس عمارتیں اپنی عظمت وشکوہ کی داستانیں کہتی ملیں گی۔ مغرب کی جانب نظر اٹھائیں تو نیوجرسی کا شہر اور **مشرق کی طرف** بروکلین کا علاقہ ہوگا۔

اس کی سب سے اوپر والی منزل جسے آبزرویشن ڈیک کہتے ہیں ہر طرف سے شیشے سے کور ہے اس کی **۲۳۲** کھڑکیاں ہیں جو چاروں طرف کے ناقابل فراموش اور سدا یادگار منظر پیش کرتی ہیں اس کے اوپر بھی آؤٹ ڈور اوپن آبزرویشن ڈیک ہے۔ ہر ایک آبزرویشن ڈیک پر ۷۰ سے زیادہ بوتیک گفٹ شاپ۔ بک سٹال۔ فوٹوگرافی کی دکانیں۔ ہوٹل اور ریسٹورنٹ ہیں جو صبح ساڑھے سات بجے سے شام ساڑھے چھ بجے تک کھلے رہتے ہیں۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر دیکھنے کے لئے آنے والوں کے لئے پارکنگ کا انتظام اس کی بیسمنٹ میں کر دیا گیا ہے۔ اس سنٹر کو ہر روز تقریباً دو لاکھ لوگ دیکھنے کے لئے آتے ہیں اور پچاس ہزار افراد اس سنٹر کے اندر موجود دفاتر اور اداروں میں کام کرتے ہیں۔

اس سنٹر کا ڈیزائن منورو یاماساکی نے تیار کیا تھا اور نیویارک اور نیوجرسی کی پوسٹ اتھارٹی

نے بین الاقوامی تجارت کے ہیڈ کوارٹر کے طور پر تعمیر کیا تھا۔ اس کی تعمیر ۱۹۶۶ء میں شروع اور دسمبر ۱۹۷۰ء میں مکمل ہوئی تھی۔ اب یہ اس کے موجودہ نام ونسب سے اپریل ۱۹۷۳ء میں منسوب کیا گیا تھا۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر کو اس وقت دنیا کی سب سے بلند عمارت کا اعزاز حاصل ہے اب شکاگو میں بھی اس جیسے بلند ترین ٹاور تعمیر کر لئے گئے ہیں اور انہیں اتنا اونچا لے جایا جا رہا ہے کہ یہ اعزاز اس عمارت سے چھن جانے کو ہے۔ اس سے پہلے یہ اعزاز ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کو حاصل تھا۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی ۱۱۰ منزلوں میں سے ۱۰۷ منزلیں لفٹ کے ذریعے طے کرنا پڑتی ہیں۔ لفٹ کا ٹکٹ سات ڈالر فی کس ہے۔ لفٹ ایک بہت بڑے مربع نما کمرے میں لگی ہے یہ کمرہ جس میں بیک وقت پچاس سیاح کھڑے ہو سکتے ہیں جب بھر جاتا ہے تو ڈیڑھ منٹ میں ۱۰۷ منزلیں طے کر کے سیاحوں کو اوپر پہنچا دیتا ہے۔ لفٹ روم میں داخل ہوتے ہی ہر سیاح چونک اٹھتا ہے کیونکہ کمرے کی دیواروں پر دنیا بھر کی معروف زبانوں میں استقبالی کلمات لکھے نظر آتے ہیں۔ یہاں اردو میں ''خوش آمدید'' پنجابی میں ''جی آیاں نوں'' عربی میں ''اھلاً وسھلاً مرحبا'' انگریزی میں ''ویلکم'' اسی طرح ''ہندی'' بنگالی، ملیالم، گورمکھی، چینی، جاپانی، فرانسیسی اور سپینش وغیرہ میں خیر مقدمی جملے لکھے ہیں۔ لفٹ نے دیکھتے ہی دیکھتے ہم سب کو ۱۰۷ ویں منزل پر لے جا کر اتار دیا۔ وہاں سے باہر نکلے تو ٹاور میں ہر طرف شیشے ہی شیشے لگے ہوئے تھے۔ اور نیو یارک ہمیں نیچے، بہت نیچے تحت الثریٰ میں سویا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس فلور پر بہت سی دکانیں۔ ہوٹل اور بک شاپس تھیں اور ایلی ویٹر چل رہے تھے ہم ایلی ویٹر کے ذریعے آخری منزل یعنی ٹاور کی آبزرویشن ٹاپ پر پہنچے۔ یہاں سینکڑوں سیاح اور بیسیوں جوڑے مووی اور سٹل کیمروں سے تصویریں بنانے میں مصروف تھے۔ چاروں طرف کھلی فضا میں دوربینیں نصب تھیں۔ جن میں ایک کوارٹر کا سکہ ڈال کر دور کے مناظر کو صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ اب ہم خود کو زمین سے بہت بلندی پر اور آسمان سے بہت قریب محسوس کر رہے تھے۔ موسم صاف تھا اس لئے چالیس پچاس میل تک کا علاقہ نیو جرسی کا شہر اور اس سے بھی پرے کا علاقہ راستے میں پڑنے والے عظیم الہیت پل اور بڑے بڑے دریا ندی نالوں کی طرح پھیلے نظر آ رہے تھے۔ جھیلوں باغات اور جنگلوں کے سلسلے بھی ہر طرف بکھرے ہوئے تھے جہاز پاس سے گذرتے تو یوں لگتا جیسے ہوائی جہاز نیچے ہوں اور ہم اوپر۔ ہم نے بھی اس جگہ خوب جی بھر کر تصویریں کھینچیں اور

فلمیں بنائیں وہ تصویریں جو ساری زندگی کی یادگار تھیں۔ جب وقت یہاں پہنچ کر ختم گیا تھا۔ واپسی پر سارا ڈیڑھ منٹ لگا اور ہم نیچے پہنچ چکے تھے جہاں سے ٹکٹ خریدے تھے۔

(بادباں کھول دو از وحید قیصر)

القاعدہ اور خفیہ ہاتھ

افغانستان میں ایک جنگ میدان میں لڑی جارہی تھی مگر اصل اور اہم معرکہ میڈیا اور کیمروں کی آنکھ سے دور خفیہ ایجنسیوں کے درمیان لڑا جارہا تھا' اسامہ بن لادن اور ان کے رفقاء کار کی تلاش کے لئے اس خفیہ جنگ میں جہاں عالمی ایجنسیوں کی معاونت کے فرائض مغربی اور علاقائی میڈیا سے تعلق رکھنے والے افراد سرانجام دے رہے تھے وہاں دنیا کی جدید ترین ٹیکنالوجی اور انسانی وسائل بھی وافر مقدار میں استعمال کئے گئے، پہلی مرتبہ امریکی فوج کے ساتھ کروڑوں ڈالر نقدی کی شکل میں افغانستان بھیجے گئے تاکہ ہنگامی صورتحال میں موقع پر رشوت دے کر مطلوبہ افراد کے متعلق معلومات حاصل کی جاسکیں، مگر افغانستان کے پہاڑوں اور غاروں نے اسامہ اور ملا عمر کو اُگلنے سے انکار کردیا۔ اس جنگ نے جہاں جہادی تنظیموں کے بہت سے کمزور پہلوؤں کو اجاگر کر کے طشت از بام کیا ہے وہاں ذرائع کے مطابق ایک فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ دنیا بھر کا جہادی نیٹ ورک ان کمزوریوں کے ازالے اور اپنی اصلاح کے لئے تیزی کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔

پیرس کے ذرائع کے مطابق فرانسیسی ادارہ برائے قومی سلامتی کے ارکان کے مطابق امریکہ اور برطانیہ کے خفیہ اداروں نے اسامہ بن لادن کی تلاش کے لئے تین طریقے استعمال کئے جن میں اسامہ بن لادن اور ان کے رفقاء کار کی ٹیلی فون گفتگو کے ذریعے ان کے خفیہ مقامات کا پتا چلانا بھی شامل تھا ان میں اسامہ کے وہ رفقاء کار بھی شامل ہیں جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بحری، بری اور فضائی وسائل میں نصب سننے کے جاسوسی آلات ہمہ وقت اس مشن پر معمور ہیں۔

اسامہ کی تلاش کا دوسرا طریقہ ان قوتوں نے رات دن کی فضائی نگرانی کی شکل میں اختیار کیا اس مقصد کے لئے جدید ترین راڈ طیارے **Jointstarseec** کا استعمال کیا گیا۔ تیسرا طریقہ **Dc 130** بمبار طیاروں کا استعمال تھا۔ ان طیاروں میں ایسے حساس کیمرے نصب تھے جو پہاڑوں کے اوپر گشت کے دوران ہلکی سی حرارت محسوس کر کے غاروں میں چھپے افراد کی نشان دہی کر

سکتے تھے۔ تیسرا طریقہ بین الاقوامی اور علاقائی سطح پر ایسے لوگوں کا بڑی تعداد میں بھرتی کرنا تھا جو ڈالروں کے عوض اسامہ بن لادن، ملا عمر اور ان کے ساتھیوں کے خفیہ ٹھکانوں کی نشاندہی کر سکیں۔

پیرس کے ذرائع کے مطابق اسامہ بن لادن سے متعلق خفیہ معلومات سی آئی اے کو فروخت کرنے والوں میں سے ایک کا تعلق مصر کی اسلامی تحریک ''الجماعۃ الاسلامیہ'' سے ہے۔ اس کا نام مصلحتاً ظاہر نہیں کیا گیا اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس جماعت کی قیادت میں چوتھے درجے پر آتا تھا یعنی ایمن الظواہری' ابوحفص اور رفاعی احمد طٰہ کے بعد اس کا نمبر آتا تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسامہ بن لادن سے اختلاف کی وجہ سے ۱۱ ستمبر کے واقعات کے بعد اس نے افغانستان کے ایک پڑوسی ملک سے امریکیوں کے ساتھ رابطہ قائم کیا تا کہ انہیں القاعدہ کے ارکان اور ان کی نقل و حرکت اور القاعدہ کے عالمی نیٹ ورک کے بارے میں مطلع کر سکے، جب سی آئی اے کے ارکان نے اس سے براہ راست ملاقات کی تو اس نے حیرت انگیز انکشافات کیے۔ اس نے امریکیوں کو باور کرایا کہ اسامہ بن لادن امریکی کارروائیوں کے خلاف جراثیمی ہتھیار استعمال کر سکتا ہے۔ پیرس کے ذرائع کے مطابق یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا جس میں اسامہ کے بارے میں امریکیوں کو مخبری کی گئی ہو بلکہ اس سے پہلے مارچ ۲۰۰۲ء میں امریکی سی آئی اے نے مصری اسلامی تحریک کے ایک بڑے رکن محمد الظواہری المعروف مھندس (ایمن الظواہری کے بھائی) کو مصر سے افغانستان جاتے ہوئے عرب امارات میں ٹرانزٹ کے دوران اپنی تحویل میں لے لیا تھا، سی آئی اے حکام نے محمد الظواہری پر بے پناہ تشدد کیا اور دھمکی دی کہ اگر اس نے امریکیوں کے ساتھ تعاون نہ کیا تو اسے مصری حکومت کے حوالے کر دیا جائے گا۔ محمد الظواہری سے افغانستان میں القاعدہ اور اس کے قائدین کے ذرائع مواصلات اور جدید تکنیک کے بارے میں امریکیوں نے مفید معلومات حاصل کیں خاص طور پر ان قائدین کے زیر استعمال سٹیلائٹ ٹیلی فونوں کے بارے میں تا کہ القاعدہ کی افغانستان میں نقل و حرکت کے بارے میں جاسوسی آسانی کے ساتھ کی جا سکے۔ فرانسیسی ذرائع کے مطابق معلومات حاصل کرنے کے بعد محمد الظواہری کو حیرت انگیز طور پر رہا کر دیا گیا! جو امریکیوں کا ایک طریقہ واردات ہے اس سلسلے میں شاید پردہ کئی سال بعد اٹھ سکے۔

فرانسیسی ادارہ برائے قومی امن کے ایک ذمہ دار آفیسر کے مطابق افغانستان کی جنگ

شروع ہونے سے چند ہفتے قبل امریکیوں کو سب سے زیادہ کامیابی طالبان کے اندر اس نیٹ ورک کے ذریعے حاصل ہو سکی جو آئی ایس آئی کے ایک سابق ڈائریکٹر جنرل کے دور میں قائم کیا گیا تھا، جنگ کی ابتدا ہی میں اس نیٹ ورک کے ذریعے طالبان صفوں میں بہت سے لوگ داخل کیے گئے تھے جن میں ایک تاجمین جاوا (Tajmin Jawa) ملا محمد عمر کے بہت قریب تصور کیا جاتا تھا۔ اسی کے ذریعے طالبان قیادت کو ایسے مواصلاتی ذرائع مہیا کیے گئے تھے جن میں لگے خفیہ آلات کی مدد سے امریکی طالبان فورس کی نقل وحرکت اور جنگی منصوبوں کو آسانی کے ساتھ اپنے مشاہدے میں رکھ سکتے تھے۔

اس سارے تناظر میں سب سے زیادہ تباہی تین سٹیلائٹ فونوں نے مچائی، یہ ٹیلی فون ۱۱ستمبر کے واقعات سے پہلے دیگر آلات کے ساتھ ساتھ "مہیا کردہ" تھے جس نے بعد کے واقعات میں ایجنسیوں کی جنگ میں انتہائی اہم اور فیصلہ کن کردار ادا کیا، ان ہی کی مدد سے جنگ کے شروع میں امریکیوں نے بعض حساس ٹھکانوں پر بمباری کی تھی' ایسے ہی آلات کے ذریعے مغربی ایجنسیاں اسامہ اور القاعدہ کے دیگر رہنماؤں کے ساتھ ساتھ طالبان میں اسامہ کے دوستوں کی جاسوسی کرتی رہیں' ان تین سٹیلائٹ ٹیلی فونوں نے امریکی اور دیگر مغربی ایجنسیوں کو اسامہ اور ملا محمد عمر کے بہت نزدیک پہنچا دیا تھا۔

ان ٹیلی فونوں میں سے ایک سیٹ القاعدہ کے ملٹری چیف ابوحفص کے استعمال میں تھا جس کا نمبر ۹۲۸۲۸۳۷۶۵۵ تھا۔ یہ ٹیلی فون ابوحفص کی شہادت سے ایک ماہ قبل القاعدہ تنظیم کے ایک فرد کے ذریعے لندن سے خریدا گیا تھا اس ٹیلی فون کی جانچ پڑتال افغانستان میں القاعدہ کے الیکٹرانک کے ماہرین نے کی تھی۔ اس کے لئے ابوحفص اسے اطمینان سے استعمال کر رہے تھے مگر برطانوی ایجنسی نے القاعدہ میں موجود اپنے ایجنٹ کے ذریعے اس فون کی خریداری سے پہلے ہی اس میں سننے کے آلات نصب کر دیئے تھے۔ اس اطمینان کے لئے کہ اس میں کوئی خفیہ آلہ نہ نصب ہو اس فون کے ذریعے آزمائشی طور پر کئی ممالک میں کالیں کی گئی تھیں۔ سٹیلائٹ فون پر بات کرنے کے فوراً بعد ابوحفص اپنی جگہ تبدیل کر لیتے تھے۔ اسی دوران ۱۱ستمبر کے واقعے کے چند روز بعد برطانوی ایجنسی نے ابوحفص اور دبئی میں موجود ایک غیر معروف شخص کے درمیان گفتگو بھی سنی جس

کی بنیاد پر برطانویوں نے دعویٰ کیا تھا کہ امریکہ میں ہونے والے دھماکوں کے پیچھے اصل ماسٹر مائنڈ ابوحفص تھے۔اسی ٹیلی فون کی مدد سے برطانوی ایجنسی نے جنگ کے دوران ابوحفص کے ٹھکانے کا پتا چلا کر امریکیوں کو مطلع کیا تھا جنہوں نے علاقے میں شدید بمباری کر کے ابوحفص کو شہید کرنے کا دعویٰ کیا۔

ذرائع کے مطابق دوسرا ٹیلی فون ملا محمد عمر کے استعمال میں تھا جس کا نمبر ۹۲۵۱۲۲۵۳۵۰ تھا۔اس ٹیلی فون کا استعمال ملا محمد عمر ۱۵ نومبر تک کرتے رہے۔اس پر سے آخری کال اسامہ بن لادن کو دی گئی تھی؛ جس کے ذریعے امریکیوں کو علم ہوا کہ ملا محمد عمر اس وقت کابل میں ہیں اور اسامہ بن لادن قندھار کے قریب کسی خفیہ مقام پر ہیں۔یہ شمالی اتحاد کے کابل میں داخلے سے پہلے کی بات ہے۔امریکیوں کے مطابق اس آخری گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ ملا عمر اور اسامہ بن لادن میں جنگی حکمت عملی کے معاملے میں اختلاف ہے مگر جلد ہی نامعلوم وجوہات کی بنا پر یہ رابطہ اچانک منقطع ہو گیا جس سے امریکیوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔اسی لمحے ملا عمر نے کابل کو خالی کر کے جنوبی افغانستان میں اپنی قوت مجتمع کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ امریکہ کے خلاف گوریلا جنگ کا آغاز کیا جائے مگر اس فیصلے سے اسامہ لاعلم تھے۔جیسے ہی امریکیوں کو اس بات کا علم ہوا کہ اسامہ اور طالبان قیادت کے درمیان مواصلات کا رابطہ منقطع ہو چکا ہے انہوں نے شمالی اتحاد کو کابل کی جانب پیش قدمی کا اشارہ دے دیا۔یوں امریکی بمباری کے سائے تلے سوائے قندھار کے شمالی اتحاد تمام افغانستان پر چھاتا چلا گیا مگر اس تمام عرصے میں امریکی بزدلوں کی طرح ہمیشہ شمالی اتحاد کی پچھلی لائنوں میں رہے۔

ان سٹیلائٹ ٹیلی فونوں میں تیسرا فون اسامہ بن لادن کے استعمال میں تھا جس کا نمبر ۹۲۸۱۸۳۷۸۲۵ تھا۔ذرائع کے مطابق یہ ٹیلی فون بھی جنگ سے ایک ماہ قبل لندن سے "الشیخ محمد الناہید" کے فرضی نام سے خریدا گیا تھا۔اسامہ کی عادت کے مطابق یہ فون بھی صرف ایک مرتبہ ہی استعمال کیا گیا تھا اس بات کا علم امریکیوں کو بھی تھا کہ اسامہ کے پاس ایک وقت میں کئی فون ہوتے ہیں جنہیں ایک مرتبہ استعمال کرنے کے بعد تلف کر دیا جاتا ہے۔اس لئے مغربی ایجنسیوں کو اس بات کا علم تھا کہ ایک مرتبہ اسامہ نے اس فون کو بھی استعمال کرنا ہے اس لئے اسامہ کے ایک

ساتھی کے ذریعے یہ سٹیلائٹ فون اس تک پہنچادیا گیا اس کے بعد سے امریکیوں نے اسامہ کی ایک ایک لمحے کی جاسوسی شروع کردی، مبادا اُسامہ کس وقت اس فون کو استعمال کرلیں۔ جیسے ہی اسامہ نے اس فون کو استعمال کیا امریکیوں کو معلوم ہوگیا کہ اسامہ مغربی قندھار کی جانب ایک قبیلے میں اسی کلومیٹر مربع کے علاقے میں موجود ہیں۔

فرانسیسیوں کے مطابق ۲۰ر اکتوبر کو امریکی کمانڈوز نے قندھار میں ایک گوریلا کاروائی کے دوران طالبان کے ایک اہم مرکز پر قبضہ کرکے وہاں سے اہم دستاویزات اپنے قبضے میں لے لی تھیں جن سے طالبان کے آئندہ جنگی منصوبوں اور اسامہ کے دوٹھکانوں کا علم امریکیوں کو ہوا۔ ان میں سے ایک مرکز وسطی افغانستان میں اورزغان میں تھا جب کہ دوسرے مرکز کا علم نہیں ہوسکا مگر اس کے بارے میں اتنا ہی معلوم ہوسکا کہ یہ پاکستانی سرحد کے قریب ایک قبائلی علاقے میں بین الاقوامی امدادی تنظیم سے متصل تھا جس کی فرضی تین ایمبولینسوں میں مواصلات کی نگرانی کا جدید ترین نظام نصب کیا گیا تھا اسی کے ذریعے اس جگہ کی مکمل نشاندہی حاصل کی گئی اور یہاں خوفناک بمباری کی گئی۔ ذرائع کے مطابق امریکی مقامی ایجنٹوں کی مدد سے اسامہ بن لادن اور ملا عمر کے قریب پہنچ چکے تھے کہ اچانک ایک نہ نظر آنے والے "ہاتھ" نے انہیں اُچک لیا اس کے بعد امریکیوں کو اسامہ اور ملا محمد عمر کے ٹھکانوں کا علم نہ ہوسکا اور وہ اندھوں کی طرح صرف شہری آبادی کو شک کی بنیاد پر نشانہ بناتے رہے۔

افغانستان کی جنگ میں امریکی دہشت گردی کے جلو میں شمالی اتحاد نے جہاں تمام ملک میں ظلم وستم کا بازار گرم کیا ان میں قندوز کا چھ روزہ محاصرہ بھی تھا جس کا ڈراپ سین قلعہ جنگی میں قیدیوں کے بے رحمانہ قتل عام پر ہوا۔ اس محاصرے کے دوران غیر افغانی مجاہدین پر کیا گزری؟ اس سلسلے میں لندن کے ذرائع نے اسامہ بن لادن کے ایک قریبی ساتھی "ابوصعب" سے رابطہ کیا جو خود اس وقت قندوز میں محاصرے میں تھا اور یہاں سے دیگر مجاہدین کے ساتھ جنگ کرتا ہوا آخرکار قندھار اور قندھار خالی کردینے کے بعد محفوظ مقام پر پہنچ گیا تھا۔ ابوصعب نے انکشاف کیا کہ قندوز کے معرکے میں محاصرے کے دوران شدید جنگ لڑی گئی جس کی قیادت اسامہ بن لادن نے "محمد داداللہ" کے نام سے کی مگر اس بات کی ہوا آخری وقت تک امریکیوں اور شمالی اتحاد والوں کو نہ لگ

سکی۔ جنگ کے آخری مرحلے میں مجاہدین کے پاس اسلحہ انتہائی قلیل تعداد میں رہ گیا تھا اس کے علاوہ زخمی مجاہدین کی تعداد خطرناک حد تک بڑھ چکی تھی۔ جب مجاہدین تک یہ خبر پہنچی کہ طالبان فورس ایک مرکز کی جانب سمٹ رہی ہے تاکہ طویل گوریلا جنگ کی جا سکے تو علاقے میں موجود مجاہدین دیگر قیادت کے مشورے سے قندوز خالی کر کے شمالی اتحاد کے درمیان سے باحفاظت نکل گئے اور شمالی اتحاد کو اس بات کی خبر تک نہ ہو سکی کہ قندوز خالی کرنے والے مجاہدین کی سب سے آگے والی گاڑی کے بعد جو گاڑی تھی اسامہ اس میں سوار ہیں۔ اسامہ اس وقت ہمارے ساتھ تھے جب امریکہ اور اس کے حواری انہیں پہاڑیوں اور وادیوں میں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ محمد داد اللہ کے نام سے اسامہ بن لادن وائرلیس سسٹم سے قندوز میں دیگر مجاہدین کو جنگ کے دوران ہدایت دیتے تھے ان کا اس وقت مرکز قندوز کا ہوائی اڈا تھا جو ایک کھلی جگہ ہے اور یہیں آسمان تلے اسامہ جہادی کاروائیوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ ابوصعب کے مطابق ''قندوز میں اس وقت زیادہ تر غیر افغانی مجاہدین تھے جن کا تعلق القاعدہ سے تھا جبکہ طالبان فورس کی تعداد انتہائی قلیل تھی جس کے ذمے مزار شریف کا دفاع تھا مگر جس وقت مزار شریف خالی کرنے کا حکم آیا تو ہم لوگ سمجھ گئے کہ اب القاعدہ اور طالبان فورس جنوب کی جانب سمٹ کر جنگ کی حکمت عملی اپنا رہی ہے۔ اس لئے ہم شہر کی کئی سمتوں سے باحفاظت نکلے اس لئے آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اس وقت یہاں سے نکلنا شروع کر دیا تھا جب ابھی شمالی اتحاد قندوز کا محاصرہ بھی پوری طرح نہیں کر پایا تھا مگر ایک مشکل ہمارے ساتھ یہ تھی کہ ہم میں بیمار اور زخمی مجاہدین کی تعداد بھی تھی اس لئے ہم نے اپنے آپ کو دو حصوں میں تقسیم کیا' ایک وہ جو لڑنے کے قابل تھے اور دوسرا حصہ وہ جو زیر علاج تھا' یہ لوگ زیادہ تر یہیں قلعہ میں بند ہو کر لڑنا چاہتے تھے۔ پہلے حصے میں ۶۰۰ مجاہدین تھے جن میں ۲۱۰ پاکستانی' ۹۰ ازبکی ۱۳ عرب اور باقی افغان تھے۔''

اسامہ کے ساتھی ابوصعب کے ان انکشافات کے بعد ثابت ہو گیا کہ اسامہ ان علاقوں میں سرے سے تھے ہی نہیں جہاں امریکی انہیں ڈھونڈ رہے تھے۔ بعد میں ان کی جہاں بھی نشاندہی ہوئی وہ ان کے موبائل فونوں کی وساطت سے تھی مگر وہ یہ ذریعہ استعمال کرنے کے فوراً بعد علاقہ چھوڑ دیتے تھے۔ فرانسیسی ذرائع کے مطابق امریکہ کے مواصلاتی ذرائع ہمہ وقت اسامہ کی کالوں کے انتظار میں چوکس کر دیئے گئے تھے۔ اس وقت دنیا میں سٹیلائٹ فونوں کی سب سے زیادہ سروس

امریکی کمپنیاں مہیا کرتی ہیں جن میں دو بڑی کمپنیاں ایریڈوم اور انمارسٹ ہیں۔ان کو شروع میں ہدایت تھی کہ وہ افغانستان جیسے ممالک میں سروس مہیا نہ کریں لیکن چونکہ اس قسم کی سروس کے لئے مواصلاتی سیارے استعمال ہو سکتے ہیں انہی سہولیات کو دیکھتے ہوئے جہادی تنظیموں کے ارکان آپس میں رابطے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔افغانستان میں بھی القاعدہ تنظیم نے انہیں آپس کے رابطوں کے لئے استعمال کیا جس کے بعد مغربی ایجنسیاں ان ذرائع کو القاعدہ کی جاسوسی کے لئے استعمال کرنے لگیں اور انہیں اس سلسلے میں اہم معلومات بھی حاصل ہوتی رہیں۔انہی ذرائع پر بھروسا کرتے ہوئے امریکیوں نے اپنے میزائلوں میں خاص قسم کے آلات نصب کیے جو سٹیلائٹ فون کی لہروں کے ساتھ ساتھ اصل فون کو نشانہ بناتے تھے۔لازمی بات ہے کہ اس طرح مطلوبہ شخص بھی ہلاک ہو جاتا۔پیرس کے ذرائع کے مطابق امریکیوں نے ان خاص میزائلوں کو اپنے مفادات کے خلاف استعمال ہونے والے ذرائع کو تباہ کرنے کے لئے تخلیق کیا ہے۔اس میزائل کا نام AGM 80 HARM ہے۔اس قسم کے میزائل سب سے پہلے روس نے بنائے تھے جو سٹیلائٹ فونوں کی لہروں پر سفر کرتے ہوئے اپنے ہدف تک پہنچتے تھے۔شیشان کے مجاہد رہنما کو ہر دو دلیف کو اسی تکنیک سے شہید کیا گیا تھا۔امریکیوں نے ان کے فون کے ذریعے ان کے ٹھکانے کی نشاندہی کی تھی جبکہ روسیوں نے امریکیوں کی مدد سے میزائل داغ کر اپنا مقصد پورا کیا تھا۔ان مواصلاتی ذرائع سے نکلنے والی مواصلاتی لہریں ایک ریلوے لائن کی مانند میزائل کو اس آخری مطلوبہ منزل تک پہنچا دیتی ہیں جہاں سے اسے استعمال کیا جا رہا ہوتا ہے۔

لندن کے ذرائع کے مطابق امریکہ کی خصوصی خفیہ فورس ''ڈیلٹا فورس'' اور سی آئی اے کے ارکان اس وقت مقامی افغان لباس میں اسامہ اور ان کے رفقاء کار کو تلاش کرتے رہے۔قبائلی علاقے کے رہنے والے ایک شخص محمد خان آفریدی کے مطابق امریکہ نے جنوبی افغانستان میں جو کامیابی حاصل کی وہ جنوبی افغانستان کے پشتون قبائل کے چند اہم افراد کو ڈالروں کی بنیاد پر اسامہ اور القاعدہ کے دیگر افراد کی جاسوسی کے لئے تیار کرنا تھا۔مگر پشتون افراد کی بڑی تعداد بھاری ڈالروں کی رشوت کے باوجود اسامہ بن لادن اور ان کے ساتھیوں سے ہمدردی رکھتی ہے۔ذرائع کے مطابق اسامہ کی نشاندہی کے لیے رکھے گئے ۲۵ ملین ڈالر کے انعام کی رقم نے بہت سے پشتون

قبائلی سرداروں کو ایمان فروشی پر مجبور کر دیا مگر ان کے آبائی علاقوں میں عوام کے نزدیک ان کی وہ عزت نہیں رہی جو پہلے تھی۔ ان میں حضرت علی نامی قبائلی لیڈر نے سب سے زیادہ گھناؤنا کردار ادا کیا یہ شخص پہلے شمالی اتحاد میں نائب وزیر دفاع تھا اس کی کوشش تھی کہ امریکیوں سے زیادہ ڈالر حاصل کیے جا سکیں۔ ذرائع کے مطابق ان عناصر نے طالبان سے تعلق رکھنے والے کئی افراد کو جاسوسی کے لئے تیار کیا تھا مگر ان افراد نے امریکہ نواز پشتون قبائل اور امریکی ذرائع کو ہمیشہ ایسی جگہ کی نشاندہی کی جہاں اسامہ اور اس کے ساتھیوں کا وجود بھی محال تھا۔

امریکی سیکورٹی ادارے کے ایک اہلکار رچرڈ باؤچر کے مطابق ۱۱ ستمبر کے واقعات کے بعد سے اسے اب تک مختلف ذرائع سے اسامہ کے خلاف ۲۲ ہزار شہادتیں حاصل کی گئی ہیں اور انہیں بنیادوں پر اسامہ کی تلاش جاری ہے۔ اس لئے صرف افغانستان میں ۷۰۰ ایسے مقامات ہیں جہاں اسامہ کی نشاندہی کی گئی مگر اس سلسلے میں امریکی اور ان کے حواری بری طرح ناکام رہے ہیں۔ بعض افغان ذرائع ان کے پاکستان منتقل ہونے کا دعویٰ کرتے رہے مگر حکومت پاکستان اس کی بھرپور انداز میں تردید کر چکی ہے۔ افغانستان سے پاکستان میں داخل ہونے کے ۲۰۰ راستے ایسے ہیں جن کے ذریعے بذریعہ کار یا بڑی گاڑی سرحد عبور کی جا سکتی ہے جب کہ ہزاروں راستے ایسے ہیں جہاں پیدل اور گھوڑے کے ذریعے سرحد عبور کی جا سکتی ہے انہی احتمالات کو سامنے رکھ کر پاکستان مخالف عناصر ان خبروں کو ہوا دے رہے تھے۔ لندن کے ذرائع کے مطابق اسامہ کی تلاش میں اب تک تمام ذرائع کے ناکام ہونے کے بعد امریکی ایک بالکل نیا جاسوس طیارہ ''گلوگل ہاک'' افغانستان لے آئے اس سے پہلے یہ طیارہ کسی مہم میں استعمال نہیں کیا گیا تھا اس میں لگے حساس آلات زمین اور فضاء میں زبردست نگرانی کا کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ برطانیہ سے شائع ہونے والے ایک سیاسی عربی ہفت روزہ کے اسلام آباد میں مقیم نمائندے بکر عطیانی کے مطابق اس طیارے کو پاکستانی خفیہ ایجنسی کی مدد سے کام میں لایا جا رہا تھا جو پشتون قبائل کے ساتھ ساتھ طالبان صفوں تک رسائی رکھتی ہے۔ رپورٹ کے مطابق اس وقت تک اسلام آباد پوری طرح واشنگٹن کی افغانستان میں معاونت کرتا رہا۔ اس کے علاوہ خلیج میں امریکی فوجوں کے سربراہ ٹومی فرینکس کو اسلام آباد طلب کر کے ان سے اسامہ کی تلاش میں مدد حاصل کی گئی کیونکہ پاکستان نے امریکہ کی

افغانستان میں جنگ کے حوالے سے اپنی سرحدوں سے باہر کسی بھی عسکری کاروائی سے معذوری ظاہر کردی تھی۔ ذرائع کے مطابق سی آئی اے کے بعض سابق اہلکار افسران نے امریکی حکومت کو خبردار کیا ہے کہ اسامہ کی تلاش میں پاکستانی آئی ایس آئی پر مکمل طور پر اعتماد نہ کیا جائے کیونکہ اس ایجنسی میں طالبان اور اسامہ کے بہت ہمدرد پائے جاتے ہیں۔ لندن کے ذرائع کے مطابق امریکہ کے پاس جدید ترین ٹیکنالوجی اور ڈالر ہیں جب کہ اسامہ کے پاس جغرافیے کا علم اور بے پناہ ٹھکانے اور ہمدرد ہیں اگر اس بات کو ہی تسلیم کرلیا جائے کہ اسامہ جنوبی افغانستان کے پہاڑوں میں ہیں تو انہیں تلاش کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے کسی بھوسے کے ڈھیر میں سے سوئی تلاش کرنا۔

(مدینہ سے وائٹ ہاؤس تک۔ محمد انیس الرحمٰن)

......☆......

''بلبل''

ماہر فلکیات اور درویش منش محقق ضیاء الدین لاہوری نے دی ٹائمز (لندن) کا تراشہ ای میل کیا ہے، جس نے طالبان کے بعد قندھار کی صورتحال پر اپنے نمائندے ٹم ریڈ کی سٹوری شائع کی ہے، ٹم لکھتے ہیں کہ ''ملا عمر کے جانے کے بعد قندھار میں صرف ٹیلی ویژن، پتنگوں اور استرے، بلیڈ کی واپسی نہیں ہوئی بلکہ ''بلبل'' بھی اڑانیں بھرنے لگے ہیں۔

۱۹۹۴ء میں طالبان کی آمد سے پہلے کی طرح قندھار کے کوچہ و بازار میں ان خوش فکروں کا راج ہے جو چودہ پندرہ سال کے خوش شکل لڑکے کو بغل میں لیے گھومتے ہیں اور سر عام بوس و کنار میں مصروف رہتے ہیں۔'' ٹم نے قندھار کو جنوبی ایشیا میں اس فن کا سب سے بڑا مرکز قرار دیا ہے جہاں طالبان کی آمد سے قبل لوگ فخریہ انداز میں خوبصورت لڑکوں کو اپنے ساتھ چمٹائے رکھتے اور اسے ''آشنا'' یا ''بلبل'' کا نام دیا جاتا۔ ۱۹۹۴ء میں دو افغان کمانڈروں کی ایک بلبل پر لڑائی ہوئی جس میں ''بلبل'' مارا گیا، کہا جاتا ہے کہ یہ بلبل ایک کمانڈر نے ملا عمر کے دینی مدرسے سے اغوا کیا تھا، اسی کمانڈر نے ایک غریب خاندان کی لڑکی کو اغوا کر کے گورنر ہاؤس پہنچادیا جس کی فریاد لے کر لوگ ایک دینی مدرسہ کے معلم ملا عمر کے پاس پہنچے اور گلہ کیا کہ لوگوں کی عزتیں لوٹی جارہی ہیں مگر وہ اطمینان سے مدرسے میں بیٹھا دینی تعلیم دے رہا ہے۔ چنانچہ ملا عمر اپنے ساتھی اساتذہ اور طلبہ کے

ساتھ اٹھے اور اس ظلم و بربریت کا خاتمہ کر دیا یوں قندھار کے عوام نے انہیں اپنا حکمران مان لیا۔ ٹم لکھتے ہیں کہ ”ملا عمر نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اس شرمناک کھیل اور خوبصورت لڑکوں کو آشنا کی حیثیت سے ساتھ لے کر چلنے پر پابندی لگا دی اور ایسے مجرموں کے لئے سخت سزاؤں کا اعلان کیا، ایسے مجرموں پر دیوار گرائی جاتی تھی۔ ۱۹۹۸ء میں ایسے ہی تین مجرموں پر پکی اینٹوں کی ایک اونچی دیوار ٹینکوں کے ذریعے گرائی گئی، دو افراد موقع پر ہلاک ہو گئے جبکہ ایک زندہ بچ گیا۔“

گورنر قندھار گل آغا شیرازی کے ایک وفادار سپاہی تورا جان نے ٹم کو بتایا کہ ”طالبان کی آمد سے پہلے ہر گلی کے کونے، دکان پر، کوچہ و بازار میں اور ہوٹلوں کی لابی میں لوگ شاہد بکنار گھومتے، خوش فعلیاں کرتے اور اس بدکاری پر فخر کرتے کیونکہ یہ زندگی کا حصہ تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ (ربانی، احمد شاہ مسعود، دوستم اور دیگر) وارلارڈز کے چہیتوں نے زور و زبردستی کا آغاز کر دیا، وہ خوبصورت لڑکوں کو گھروں سے گن پوائنٹ پر اٹھاتے، جب تک چاہتے انہیں اپنے پاس رکھتے اور جب دل بھر جاتا انہیں قتل کر دیتے تاکہ کوئی دوسرا ان سے تعلق قائم نہ کر سکے، یہ شاید ان کی ”غیرت“ کے منافی تھا۔“ طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد یہ سلسلہ پھر چل پڑا ہے۔ اب کمانڈروں کے بنگلوں اور فوجی بیرکوں میں بھی خوش شکل لڑکے نظر آتے ہیں اور ان کمانڈروں، لشکریوں اور جنگجوؤں کا بیشتر وقت ان لڑکوں سے لاڈ پیار میں گزرتا ہے۔

ایک شہری محمد شاہ نے ٹم کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ ”کمانڈر، جنگجو سپاہی اور عام شہری کا دل جب کسی اچھی شکل کے لڑکے پر آ جاتا ہے تو وہ اسے سرعام ساتھ چلنے اور مستقل تعلق قائم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس مقصد کے لئے فٹ بال گراؤنڈ، سینما ہال یا کسی گلی کا انتخاب کیا جا سکتا ہے اور آشنائی کا آغاز کسی تحفہ سے ہوتا ہے بالعموم حشیش کے سگریٹ، گھڑی اور موٹر سائیکل کا تحفہ پسند کیا جاتا ہے، سب سے بہتر تحفہ لڑاکا کبوتر سمجھا جاتا ہے جس کی مالیت چار پانچ سو ڈالر ہوتی ہے، یہ بچے معصوم ہیں مگر غربت انہیں اس بے ہودہ شغل کا حصہ بنا دیتی ہے۔“

طالبان کی جن ”زیادتیوں“ اور ”غلطیوں“ کو بنیاد بنا کر امریکہ نے حملہ کیا اور وارلارڈز شمالی اتحاد کے خونخوار کمانڈروں اور اس کلچر کے رسیا قبائلی سرداروں نے پورے جوش و جذبے سے اس کا ساتھ دیا، ان میں ایک بلبل پرستی پر پابندی تھی جسے ہم جنس پرستی کے نام پر امریکہ اور برطانیہ

میں انجوائے کیا جاتا ہے، جہاں مرد مرد سے شادی کر سکتا ہے اور امریکی فوج میں ہم جنس پرستوں سے کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جاتا، اب امریکہ کے ہم جنس پرست سپاہیوں' افسروں اور خوبصورت افغان لڑکوں میں مقابلہ حسن ہوا کرے گا اور امریکہ کے گماشتہ مجمی ذوق رکھنے والے قبائلی سردار اس کے منصف اور تماشائی، جو جیتے گا وہی "بلبل" ان قبائلی سرداروں کی آنکھ کا تارا ہوگا۔ طالبان کے قدامت پسندانہ اسلامی کلچر کی جگہ امریکہ کے اس ترقی پسندانہ کلچر کو پروان چڑھانے کے لیے قندھار بہترین جگہ ہے جسے ٹم نے جنوبی ایشیا میں ہم جنس پرستی کا سب سے بڑا مرکز قرار دیا ہے۔

(ارشاد احمد عارف، بشکریہ نوائے وقت)

......☆......

لفظ "بربریت" یا "سربریت"

ہمارے یہاں اردو زبان میں ایک لفظ "بربریت" کا بہت استعمال ہے۔ مثلاً کہیں ہم پڑھتے ہیں کہ "کشمیریوں پر ظلم و بربریت کی انتہا ہوگئی۔" کہیں اس کا کچھ استعمال ہوتا ہے، کہیں کچھ۔ مگر اس لفظ کی حقیقت اور معانی سے ہم واقف نہیں ہیں ورنہ اس کا استعمال نہ کرتے۔ آیئے! ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ "بربریت" ہے کیا؟

افریقہ کے ایک جنگجو قبیلے نے اسلام کی سچائی سے متاثر ہو کر دین اسلام قبول کر لیا' جس کے بعد تیزی سے دوسرے قبائل والوں نے بھی دین اسلام کو سمجھا اور اپنایا۔ وہاں کے یہ جنگجو قبائل "بربر" کہلاتے تھے۔ ان قبائل نے اسلام کی سربلندی اور ظلم واستعمار کے خاتمے کے لئے جواں مردی دکھائی۔ مغرب کو یعنی اسلام دشمن طاقتوں کو افریقہ میں اسلام کے غلبے سے بڑی تکلیف پہنچی۔ اس نے ایک سازش کے تحت بربر قبائل کو بدنام کرنے کے لئے لفظ بربر کو "بربریت" کا نام دے کر گالی بنا دیا۔ اور وحشی لوگوں کے لیے مغرب نے لفظ **Barbarians** کا استعمال شروع کر دیا۔ اصل مقصد مسلمانوں کی جرأت، عظمت اور سربلندی کے حقائق کو مٹانے کی سازش تھی۔ ہم نے اس کو کامیاب بنانے کے لیے اس لفظ کو ظلم و ناانصافی جیسے معنوں میں لینا شروع کر دیا۔ کیا اب بھی آپ اس لفظ کا استعمال کریں گے؟......نہیں ناں! پھر اس کی جگہ ہم کیا استعمال کریں تو سنیے! آپ اس کی جگہ "سربریت" استعمال کریں، کیونکہ یورپی ملک سربیا کے سرب عیسائیوں نے بوسنیا کے

مسلمانوں پر وہ ظلم توڑے ہیں کہ درندے بھی شرما جائیں۔ اس لیے ظلم وستم کی صحیح علامت لفظ سربریت ہے۔

(نقیب ختم نبوت، فروری ۲۰۰۳ء از محمد عارف ایاز)

......☆......

دُعا

میرے قاری جناب طارق صدیقی اور محترمہ ماہین نے بار بار ''دعائے رمضان'' ای میل کی ہے۔ افغانستان کے پس منظر میں یہ دعا پوری امہ کی حالت زار کا عکس ہے اور اعتراف ہے۔ اسے طنز اور شکوے پر محمول کیا جا سکتا ہے لیکن یہ ایک مسلمان کے اندرونی دکھ اور اضطراب کا مظہر بھی ہے۔ طوالت پر معذرت لیکن ہر صاحب دل اور حساس انسان کیلئے اس میں غور وفکر کے کئی پہلو موجود ہیں۔

''اے اللہ! ہمیں معاف کر دے، ہم کمزور ہیں، عاجز ہیں، خطا کار ہیں، پر تیری رحمتوں کے سزاوار ہیں، ہمیں معاف کر دے کہ ہم نے تیرے بندے بیچ دیئے، ڈیڑھ کروڑ مسلمان فروخت کر دیئے، سارے افغان مول دے دیئے، ان کی جان، مال، عزت وآبرو بھی بیچ دی، انہیں درندوں اور بھیڑیوں کے حوالے کر دیا، تو یقین کر ہم یہ نہ کرتے مگر مجبور تھے، کمزور تھے، ڈٹ نہ سکے، عاجز تھے لڑ نہ سکے، عاصی تھے بول نہ سکے اور خطا کار تھے نبھا نہ سکے، لیکن اے اللہ! تو دلوں کے حال جانتا ہے۔ تجھے معلوم ہے ہم مجبور تھے، یہ نہ کرتے تو کیا کرتے؟ اس وقت تو ہماری نمازیں دیکھ اور خوش ہو جا، ہمارے روزے دیکھ اور راضی ہو جا، ہماری خیرات پر نظر رکھ اور کرم کر دے، ہمارے صدقات قبول کر اور رحم برسا دے، ہماری قوالیاں قبول فرما، نعرے مقبول فرما، تقریریں منظور کر لے، واویلے پر بخش دے، تو یقین کر ہم دکھی ہیں، بے گناہ افغانوں کی شہادت پر مل کر روتے ہیں، پھر مل کے کھاتے ہیں۔ اے مولا! ہمارے عمل پر مت جا، زبان کا یقین کر، دلوں کو مت دیکھ، دماغ کی داد دے، کردار پر مت جا باتوں سے مان لے، اخلاق نہ دیکھ مجبوریوں پر دھیان رکھ۔ اے اللہ! تو یقین رکھ ہم شہیدوں پر روئیں گے، کفن بھیجیں گے، لحد پر پھول چڑھائیں گے، اگربتی جلائیں گے، مسور کی دال چھڑکیں گے، پانی ڈالیں گے، کتبہ لگائیں گے، نوحے پڑھیں گے، آنسو

بہائیں گے، لوٹیں لگائیں گے، کپڑے پھاڑیں گے، بال نوچیں گے، جلسے کریں گے، تعزیت بھیجیں گے، غم کھائیں گے، فاتحہ پڑھیں گے، دیگیں پکائیں گے، سوز خوانی کریں گے، چاندنی بچھائیں گے، تیجہ منائیں گے، چہلم سجائیں گے، برسی منائیں گے، لیکن اے اللہ! تجھے تیرا واسطہ ہمیں جہاد کے لئے نہ کہہ، اسلامی رشتے یاد نہ دلا، ہم کمزور دل ہیں، رو پڑیں گے، ہمیں چپ رہنے دے، تو اللہ ہے تو ہی ان کی مدد کر، ہم پر بوجھ نہ ڈال، ہمارے کندھے کمزور ہیں، دل نرم ہیں، جہاد کے علاوہ جو کہے گا کریں گے، اگر بس میں ہوا اور تو ناراض نہ ہو، کیا ہوا جو ہم نے انہیں بیچ دیا، بھائی ہی بھائیوں کے کام آتے ہیں۔ افغان ہمارے بھائی ہیں، ہمارے کام آ گئے تو کیا ہوا۔ تو یقین جان وہ بہادر ہیں، اسے جھیل لیں گے۔ سخت جان ہیں گزار لیں گے اور ایمان والے ہیں مشکل سے نکل آئیں گے۔ وہ ہم سے زیادہ تجھ پر یقین رکھتے ہیں۔ بس تو ہی مدد کر دے ہم خوشی سے دیکھیں گے۔

اے اللہ! ہم کمزور ہیں لڑ نہیں سکتے، عاصی ہیں جھیل نہیں سکتے، خطا کار ہیں گزار نہیں سکتے، نادان ہیں سمجھ نہیں سکتے، اس لئے ہمیں رعایت دے اور انہیں ہمت دے، ہم سے درگزر فرما۔ انہیں آزمائش میں ڈال دے۔ افغان شہری صاحب عزیمت ہیں، انہیں عزیمت دے، ہم صاحب رخصت ہیں ہمیں رخصت دے دے۔ انہوں نے دین کا سبق یاد رکھا انہیں آگے رکھ، ہم بھول گئے ہمیں چھٹی دے دے۔ یا اللہ! ناراض نہ ہو، کیا ہوا جو کبھی کبھار تیرے بندوں سے مانگ لیا۔ ہم تو تجھ سے ہی مانگتے ہیں، ویسے جن سے مانگا ہے وہ بھی تیرے بندے ہیں، اے اللہ! بُش کے دل میں نرمی ڈال دے، ہماری محبت پیدا کر دے، وہ بھیجے کی بجائے جیب سے سوچے، پاؤں کی جگہ ڈالر کو بھیجے۔ اسے توفیق دے کہ ہمیں کیش دے، چیک دے، نوٹوں کی برسات کر دے، ہم تیرے شکر گزار بندوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں، ہمیں شکر گزار کر دے، تیری رحمتوں کے بوجھ سے جھک جانا چاہتے ہیں، ہم پر نوٹوں کا بوجھ ڈال دے اور کاندھوں کی فکر نہ کر، اتنا بوجھ تو اٹھا ہی لیں گے۔

اے اللہ! ہم تجھے یاد رکھیں گے، تیرا حکم مانیں گے، ڈالروں کی زکوٰۃ دیں گے مگر اللہ! یہ ڈھائی فیصد تھوڑا زیادہ ہے اسے کچھ کم کر دے، دیکھ ناراض نہ ہو ایک فیصد کر دے، ہماری تسلی ہو جائے گی۔ یہ ہم افغانوں پر خرچ کریں گے، انہیں خیمے دیں گے، پلاسٹک کی بالٹی دیں گے، پرانے جوتے دیں گے، وہ اچھے ہوتے ہیں، کھلے ہوتے ہیں، پاؤں کو کاٹتے نہیں۔ اے اللہ! ان کے

یتیموں کو چندہ دیں گے، بھوکوں کو راشن دیں گے، بوڑھوں کی عینک بنوائیں گے، لڑکیوں کو سلائی مشین دیں گے، ان کا خیال رکھیں گے، تو بے فکر رہ ہم ہیں نا ان کے، ہم نہیں کریں گے تو کون کرے گا؟ اسلامی بھائی ہیں، ہمسائے ہیں، ان کا بڑا حق ہے ہم پر، تو فکر نہ کر، یہ سائیڈ ہم سنبھال لیں گے، دنیا بھر سے امداد لیں گے اور مل جل کے کھائیں گے۔ بس تو یہ ڈالر والا کام کردے اور فوری کردے۔ ہم انتظار کریں گے۔''

(ارشاد احمد عارف، روزنامہ نوائے وقت ملتان)

✿✿✿✿✿

باب چہارم
ادبیات

ادبیات

اس سے پہلے کہ مہلت ختم ہو جائے

نواز شریف نے مولانا سے عرض کی...... حضرت! آپ یہ حدیث مبارکہ کابینہ کو سنا دیں...... مولانا نے درخواست قبول کر لی...... یہ ستمبر ۱۹۹۹ء کی بات ہے کہ مولانا طارق جمیل صاحب وزیراعظم نواز شریف سے ملاقات کے لئے پرائم منسٹر ہاؤس گئے...... نواز شریف ان دنوں پریشان تھے۔ مولانا نے فرمایا ''جناب! عذاب دو قسم کے ہوتے ہیں زمینی اور آسمانی۔ زمین آفتوں کے حل کیلئے تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے چند اصول وضع کئے ہیں۔ رہی آسمانی آفتیں تو ان کا صرف ایک ہی حل ہے ''توبہ''۔ مولانا نے ساتھ ہی حدیث مبارکہ کا ذکر بھی کیا اور فرمایا... دنیا کے پچیس مسائل ہیں...... فرد ہو یا قوم انہی پچیس مسائل کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کا حل اللہ کے رسول ﷺ نے کچھ یوں تجویز فرمایا...... یہ کہتے ہوئے مولانا نے ایک طویل حدیث مبارکہ سنائی...... نواز شریف حدیث مبارکہ سن کر چونک اٹھے...... مسائل اور ان کے حل یوں سامنے پڑے تھے جیسے میز پر قہوے کی پیالیاں دھری ہوں...... وزیراعظم فرط جذبات سے کھڑے ہوئے اور مولانا سے بغل گیر ہو کر عرض کی ''حضرت! آپ یہ حدیث مبارکہ کابینہ کو سنا دیں''...... مولانا نے درخواست قبول کر لی۔ پچھلے ہفتے مولانا طارق جمیل صاحب اسلام آباد تشریف لائے...... انہوں نے مجھے شرف بازیابی بخشا۔ گفتگو شروع ہوئی تو نواز شریف کا ذکر ہوا۔ میں نے وہ حدیث مبارکہ دہرانے کی درخواست کی...... مولانا درخواست قبول کرتے ہوئے دو زانو ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا......

''ایک بدو حضور ﷺ کے دربار میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ فرمایا ہاں کہو! دربار میں اس وقت حضرت خالد بن ولیدؓ بھی موجود تھے...... انہوں نے یہ

حدیث مبارکہ تحریر کر کے اپنے پاس رکھ لی بعد ازاں یہ فرمان کنز العمال مسند احمد میں نقل ہوا......

بدو نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں امیر (غنی) بننا چاہتا ہوں۔

فرمایا قناعت اختیار کرو امیر ہو جاؤ گے۔

عرض کیا میں سب سے بڑا عالم بننا چاہتا ہوں۔

فرمایا تقویٰ اختیار کرو، عالم بن جاؤ گے۔

عرض کیا عزت والا بننا چاہتا ہوں۔

فرمایا مخلوق کے سامنے ہاتھ پھیلانا بند کردو باعزت ہو جاؤ گے۔

عرض کیا اچھا آدمی بننا چاہتا ہوں۔

فرمایا لوگوں کو نفع پہنچاؤ......

عرض کیا عادل بننا چاہتا ہوں

فرمایا جسے اپنے لئے اچھا سمجھتے ہو وہی دوسروں کے لئے پسند کرو......

عرض کیا طاقتور بننا چاہتا ہوں

فرمایا اللہ پر توکل کرو......

عرض کیا اللہ کے دربار میں خاص (خصوصیت) درجہ چاہتا ہوں

فرمایا کثرت سے ذکر کرو......

عرض کیا رزق کی کشادگی چاہتا ہوں

فرمایا ہمیشہ باوضو رہو......

عرض کیا دعاؤں کی قبولیت چاہتا ہوں

فرمایا حرام نہ کھاؤ......

عرض کیا ایمان کی تکمیل چاہتا ہوں

فرمایا اخلاق اچھے کرلو......

عرض کیا قیامت کے روز اللہ سے گناہوں سے پاک ہو کر ملنا چاہتا ہوں

فرمایا جنابت کے فوراً بعد غسل کیا کرو......

عرض کیا گناہوں میں کمی چاہتا ہوں

فرمایا کثرت سے استغفار کیا کرو......

عرض کیا قیامت کے روز نور میں اٹھنا چاہتا ہوں

فرمایا ظلم کرنا چھوڑ دو......

عرض کیا چاہتا ہوں اللہ مجھ پر رحم کرے

فرمایا اللہ کے بندوں پر رحم کرو......

عرض کیا چاہتا ہوں اللہ میری پردہ پوشی کرے

فرمایا لوگوں کی پردہ پوشی کرو......

عرض کیا رسوائی سے بچنا چاہتا ہوں

فرمایا زنا سے بچو......

عرض کیا چاہتا ہوں اللہ اور اس کے رسول کا محبوب بن جاؤں

فرمایا جو اللہ اور اس کے رسول کو محبوب ہو اُسے اپنا محبوب بنالو......

عرض کیا اللہ کا فرمانبردار بننا چاہتا ہوں

فرمایا فرائض کا اہتمام کرو......

عرض کیا احسان کرنے والا بننا چاہتا ہوں

فرمایا اللہ کی یوں بندگی کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو یا جیسے وہ تمہیں دیکھ رہا ہے......

عرض کیا یا رسول اللہ! کیا چیز گناہوں سے معافی دلائے گی؟

فرمایا آنسو، عاجزی اور بیماری......

عرض کیا کیا چیز دوزخ کی آگ کو ٹھنڈا کرے گی؟

فرمایا دنیا کی مصیبتوں پر صبر......

عرض کیا اللہ کے غصے کو کیا چیز سرد کرتی ہے؟

فرمایا چپکے چپکے صدقہ اور صلہ رحمی......

عرض کیا سب سے بڑی برائی کیا ہے؟

فرمایا بد اخلاقی اور بخل......

عرض کیا سب سے بڑی اچھائی کیا ہے؟

فرمایا اچھے اخلاق، تواضع اور صبر

عرض کیا اللہ کے غصے سے بچنا چاہتا ہوں

فرمایا لوگوں پر غصہ کرنا چھوڑ دو......

حدیث مبارک ختم ہوگئی...... مولانا سیدھے ہو کر بیٹھے اور فرمایا میں نے کابینہ کے ارکان سے کہا ''ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرتے ہیں لہٰذا ہم دنیاوی مسائل سے کیسے بچ سکتے ہیں؟ ہم من حیث القوم اسراف کا شکار ہیں لہٰذا امیر (غنی) کیسے ہو سکتے ہیں؟ اللہ کی مخلوق کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں لہٰذا باعزت کیسے ہو سکتے ہیں؟ بے وضو رہتے ہیں لہٰذا ہمارا رزق کیسے کشادہ ہو سکتا ہے؟ توکل اختیار نہیں کرتے لہٰذا ہم طاقتور کیسے بن سکتے ہیں؟ بد اخلاق ہیں لہٰذا ہمارا ایمان کیسے مکمل ہو سکتا ہے؟ بندوں پر رحم نہیں کرتے لہٰذا اللہ ہم پر کیسے رحم کرے گا؟ صدقات سے پرہیز کرتے ہیں لہٰذا اللہ کے غصے سے کیسے بچ سکتے ہیں؟ نواز شریف نے پوچھا ''حضرت پھر ہمیں اللہ کی رحمت کے حصول کیلئے کیا کرنا چاہئے؟'' مولانا نے فرمایا جناب! اللہ سے توبہ کریں اور عوام سے توبہ کی اپیل کریں...... اللہ آنسو بہانے، گڑگڑانے اور معافی مانگنے والوں کو معاف کر دیا کرتا ہے...... جناب وزیراعظم یقین کر لیجئے یہ مسائل زمینی نہیں آسمانی ہیں۔ جب تک اللہ کی مدد، اللہ کی رہنمائی اور اللہ کی رحمت نہیں آئے گی یہ ملک ٹھیک نہیں ہوگا...... اور نہ ہی اس ملک کے مسئلے ختم ہوں گے'' نواز شریف نے کہا ''حضرت! آپ مجھے تقریر لکھ دیں میں قوم سے خطاب کروں گا اور اس سے توبہ کرنے کی اپیل کروں گا'' میٹنگ ختم ہوگئی، مولانا نے تقریر لکھنا شروع کر دی لیکن نواز شریف کی مہلت ختم ہوگئی۔

مولانا طارق جمیل صاحب جب یہ حدیث مبارکہ سنا رہے تھے...... تو میں سوچ رہا تھا موجودہ حکمرانوں کو بھی...... اس حدیث کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی نواز شریف کو تھی۔ ان کو بھی احساس دلانا ضروری ہے...... کہ جو لوگ مہلت کو غنیمت نہیں سمجھتے ہیں وہی لوگ تو دراصل خسارے میں رہتے ہیں۔ اللہ کے نام پر بننے والے ملک میں اللہ کے احکامات کی جس قدر خلاف ورزی کی گئی

اب اس کے عذاب سے بچئے...... اب اس سے معافی کا صرف ایک ہی راستہ ہے "توبہ"۔ آیئے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر گڑگڑائیں اور اس سے اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگیں...... اس سے توبہ کریں...... اس سے پہلے کہ توبہ کے سارے دروازے بند ہو جائیں...... اس سے پہلے کہ مہلت ختم ہو جائے۔ (جاوید چودھری۔ بشکریہ "روزنامہ جنگ")

رسول اللہ ﷺ کی صفت جامعیت

ایک ایسی شخصی زندگی، جو ہر طائفۂ انسانی اور ہر حالتِ انسانی کے مختلف مظاہر اور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا مجموعہ ہو، صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ہے، اگر دولتمند ہو تو مکہ کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو۔ اگر غریب ہو تو شعبِ ابوطالب کے قیدی اور مدینہ کے مہمان کی کیفیت سنو، اگر بادشاہ ہو تو سلطانِ عرب کا حال پڑھو، اگر رعایا ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر دیکھو، اگر فاتح ہو تو بدر و حنین کے سپہ سالار پر نگاہ دوڑاؤ۔ اگر تم نے شکست کھائی ہے تو معرکۂ اُحد سے عبرت حاصل کرو، اگر تم استاد اور معلم ہو تو صُفّہ کی درسگاہ کے معلم قدس کو دیکھو۔ اگر شاگرد ہو تو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر جماؤ، اگر واعظ اور ناصح ہو تو مسجد مدینہ کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو، اگر تنہائی و بےکسی کے عالم میں حق کی منادی کا فرض انجام دینا چاہتے ہو تو مکہ کے بے یار و مددگار نبی کا اسوۂ حسنہ تمہارے سامنے ہے، اگر تم حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمنوں کو زیر اور مخالفوں کو کمزور بنا چکے ہو تو 'فاتحِ مکہ' کا نظارہ کرو، اگر اپنے کاروبار اور دنیاوی جدوجہد کا نظم و نسق درست کرنا چاہتے ہو تو بنی نضیر، خیبر اور فدک کی زمینوں کے مالک کے کاروبار اور نظم و نسق کو دیکھو، اگر یتیم ہو تو عبداللہؓ و آمنہؓ کے جگر گوشہ کو نہ بھولو، اگر بچہ ہو تو حلیمہ سعدیہؓ کے لاڈلے بچے کو دیکھو، اگر تم جوان ہو تو مکہ کے چرواہے کی سیرت پڑھو، اگر سفری کاروبار میں ہو تو بصریٰ کے کارواں سالار کی مثالیں ڈھونڈو، اگر عدالت کے قاضی اور پنچایتوں کے ثالث ہو تو کعبہ میں نورِ آفتاب سے پہلے داخل ہونے والے ثالث کو دیکھو جو حجرِ اسود کو کعبہ کے گوشے میں کھڑا کر رہا ہے۔ مدینہ میں کچی مسجد کے صحن میں بیٹھنے والے منصف کو دیکھو جس کی نظر انصاف میں شاہ و گدا اور امیر و غریب برابر تھے۔

اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہؓ اور عائشہؓ کے مقدس شوہر کی حیاتِ پاک کا مطالعہ کرو، اگر اولاد والے ہو تو فاطمہؓ کے باپ اور حسنؓ و حسینؓ کے نانا کا حال پوچھو، غرض تم جو کوئی بھی ہو اور کسی

حال میں بھی ہو، تمہاری زندگی کے لئے نمونہ تمہاری سیرت کی درستی و اصلاح کے لئے سامان، تمہارے ظلمت خانہ کے لئے ہدایت کا چراغ اور رہنمائی کا نور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جامعیت کبریٰ کے خزانہ میں ہر وقت اور ہمہ دم مل سکتا ہے، اس لئے طبقۂ انسانی کے ہر طالب اور نور ایمانی کے ہر متلاشی کے لئے صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ہدایت کا نمونہ اور نجات کا ذریعہ ہے، جس کی نگاہ کے سامنے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ہے اس کے سامنے نوحؑ و ابراہیمؑ، ایوبؑ و یونسؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ علیہم السلام سب کی سیرتیں موجود ہیں، گویا تمام دوسرے انبیائے کرامؑ کی سیرتیں صرف ایک ہی جنس کی اشیاء کی دوکانیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت، اخلاق و اعمال کی دنیا کا سب سے بڑا بازار (مارکیٹ) ہے، جہاں ہر جنس کے خریدار اور ہر شے کے طلب گار کے لئے بہترین سامان موجود ہے۔

بادشاہ ایسا کہ ایک پورا ملک اس کی مٹھی میں ہو، اور بے بس ایسا کہ خود اپنے کو بھی اپنے قبضہ میں نہ جانتا ہو بلکہ خدا کے قبضہ میں، دولتمند ایسا ہو کہ خزانے کے خزانے اونٹوں پر لدے ہوئے اس کے دارالحکومت میں آ رہے ہوں اور محتاج ایسا کہ مہینوں اس کے گھر چولہا نہ جلتا ہو اور کئی کئی وقت اس پر فاقے سے گزر جاتے ہیں۔ سپہ سالار ایسا ہو کہ مٹھی بھر نہتے آدمیوں کو لے کر ہزاروں غرق آہن فوجوں سے کامیاب لڑائی لڑا ہو اور صلح پسند ایسا کہ ہزاروں پرجوش جان نثاروں کی ہمرکابی کے باوجود صلح کے کاغذ پر بے چوں و چرا دستخط کر دیتا ہو۔ شجاع اور بہادر ایسا ہو کہ ہزاروں کے مقابلہ میں تنِ تنہا کھڑا ہو، اور نرم دل ایسا کہ کبھی اس نے انسانی خون کا ایک قطرہ بھی اپنے ہاتھ سے نہ بہایا ہو، با تعلق ایسا کہ عرب کے ذرہ ذرہ کی اس کو فکر، بیوی بچوں کی اس کو فکر، غریب و مفلس مسلمانوں کی اس کو فکر، خدا کی بھولی ہوئی دنیا کے سدھارنے کی اس کو فکر، غرض سارے سنسار کی اس کو فکر ہو، اور بے تعلق ایسا کہ اپنے خدا کے سوا کسی اور کی یاد اس کو نہ ہو، اور اس کے سوا ہر چیز اس کو فراموش ہو۔ اس نے کبھی اپنی ذات کے لئے اپنے بُرا کہنے والوں سے بدلہ نہیں لیا اور اپنے ذاتی دشمنوں کے حق میں دعائے خیر کی اور ان کا بھلا چاہا۔ لیکن خدا کے دشمنوں کو اس نے کبھی معاف نہیں کیا اور حق کا راستہ روکنے والوں کو ہمیشہ جہنم کی دھمکی دیتا اور عذابِ الٰہی سے ڈراتا رہا۔

عین اس وقت جب اس پر ایک تیغ زن سپاہی کا دھوکہ ہوتا ہو، وہ ایک شب زندہ دار زاہد کی

صورت میں جلوہ نما ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ عین اس وقت جب اس پر کشور کشا فاتح کا شبہ ہو' وہ پیغمبرانہ معصومیت کے ساتھ ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔۔۔۔۔ عین اس وقت جب ہم اس کو شاہِ عرب کہہ کر پکارنا چاہتے ہیں' وہ کھجور کی چھال کا تکیہ لگائے کھردری چٹائی پر بیٹھا درویش نظر آتا ہے۔۔۔۔۔ عین اس وقت اس دن جب عرب کے اطراف سے آ آ کر اس کے صحنِ مسجد میں مال و اسباب کا انبار لگا ہوتا ہے' اس کے گھر میں فاقہ کی تیاری ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ عین اس عہد میں جب لڑائیوں کے قیدی مسلمانوں کے گھروں میں لونڈی اور غلام بن کر بھیجے جا رہے ہیں۔ فاطمہؓ بنتِ رسول اللہؐ جا کر اپنے ہاتھوں کے چھالے اور سینہ کے داغ باپ کو دکھاتی ہیں' جو چکی پیستے پیستے اور مشکیزہ بھرتے بھرتے ہاتھ اور سینہ پر پڑ گئے تھے۔۔۔۔۔ عین اس وقت جب آدھا عرب اس کے زیرِ نگیں ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ حاضرِ دربار ہوتے ہیں اور اِدھر اُدھر نظر اٹھا کر کاشانۂ نبوت کے سامان کا جائزہ لیتے ہیں' آپ ایک کھردری چارپائی یا چٹائی پر آرام فرما رہے ہیں' جسم مبارک پر بانوں کے نشان پڑ گئے ہیں' ایک طرف مٹھی بھر جَو رکھے ہیں' ایک کھونٹی میں خشک مشکیزہ لٹک رہا ہے' سرورِ کائنات کے گھر کی یہ کائنات دیکھ کر حضرت عمرؓ رو پڑتے ہیں' سبب دریافت ہوتا ہے' عرض کرتے ہیں یا رسول اللہؐ اس سے بڑھ کر رونے کا اور کیا موقع ہوگا؟ قیصر و کسریٰ باغ و بہار کے مزے لوٹ رہے ہیں اور آپ پیغمبرؐ ہو کر اس حالت میں ہیں ارشاد ہوتا ہے عمرؓ! کیا تم اس پر راضی نہیں کہ قیصر و کسریٰ دنیا کے مزے لوٹیں اور ہم آخرت کی سعادت؟ (سید سلیمان ندویؒ، خطبات مدراس)

حضرت نوحؑ علیہ السلام کی زندگی کفر کے خلاف غیظ و غضب کا ولولہ پیش کرتی ہے' حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات بت شکنیوں کا منظر دکھاتی ہے' حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کفار سے جنگ و جہاد' شاہانہ نظم و نسق اور اجتماعی دستور و قوانین کی مثال پیش کرتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی لائف صرف خاکساری' تواضع' عفو و درگذر اور قناعت کی تعلیم دیتی ہے۔ حضرت سلیمانؑ کی زندگی شاہانہ اولوالعزمیوں کی جلوہ گاہ ہے' حضرت ایوبؑ کی حیات صبر و شکر کا نمونہ ہے' حضرت یونسؑ کی سیرت ندامت و انابت اور اعتراف کی مثال ہے۔ حضرت یوسف کی زندگی قید و بند میں بھی دعوتِ حق اور جوشِ تبلیغ کا سبق ہے۔ حضرت داؤدؑ کی سیرت گریہ و بکاہ' حمد و ستائش اور دعا و زاری کا صحیفہ ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی زندگی امید خدا پر توکل اور اعتماد کی مثال ہے

لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ کو دیکھو تو اس میں نوح اور ابراہیمؑ موسیٰ اور عیسیٰ سلیمان اور داؤدؑ ایوب اور یونس یوسف اور یعقوب کی زندگیاں اور سیرتیں سمٹ کر سما گئی ہیں۔

محدث خطیب بغدادیؒ کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کی پیدائش کے وقت ندا آئی کہ محمد ﷺ کو ملکوں ملکوں پھراؤ اور سمندر کی تہوں میں لے جاؤ کہ تمام دنیا ان کے نام کو پہچان لے، جن وانس، چرند و پرند بلکہ ہر جاندار کے سامنے ان کو لے جاؤ، ان کو آدمؑ کا خلق، شیثؑ کی معرفت، نوحؑ کی شجاعت، ابراہیمؑ کی دوستی، اسماعیلؑ کی زبان، اسحاقؑ کی رضا، صالحؑ کی فصاحت، لوطؑ کی حکمت، موسیٰؑ کی سختی، ایوبؑ کا صبر، یونسؑ کی اطاعت، یوشعؑ کا جہاد، داؤدؑ کی آواز، دانیالؑ کی محبت، الیاسؑ کا وقار، یحییٰؑ کی پاکدامنی اور عیسیٰؑ کا زہد عطا کرو اور تمام پیغمبروں کے اخلاق میں ان کو غوطہ دو۔'' جن علماء نے اس روایت کو اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے، ان کا منشاء در حقیقت یہی ہے کہ پیغمبر اسلام علیہ السلام کی صفتِ جامعیت کو نمایاں کریں، کہ جو کچھ اور انبیاء علیہم السلام کو متفرق طور پر عطا ہوا تھا، وہ سب مجموعی طور سے آنحضرت ﷺ کو عطا ہوا۔ (ایضاً)

......☆......

مولانا ابوالکلام آزادؒ کے ادبی شہ پارے

کائنات کی تخریب بھی تعمیر کے لئے ہے

البتہ یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ دنیا عالمِ کون وفساد ہے۔ یہاں ہر بننے کے ساتھ بگڑنا ہے۔ اور سمٹنے کے ساتھ بکھرنا، لیکن جس طرح سنگ تراش کا توڑنا پھوڑنا بھی اس لئے ہوتا ہے کہ خوبی ودل آویزی کا ایک پیکر تیار کر دے اسی طرح کائنات عالم کا تمام بگاڑ بھی اس لئے ہے کہ بناؤ اور خوبی کا فیضان ظہور میں آئے۔ تم ایک عمارت بناتے ہو لیکن اس ''بنانے'' کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ کیا یہی نہیں ہوتا کہ بہت سی بنی ہوئی چیزیں ''بگڑ'' گئیں؟ چٹانیں اگر نہ کاٹی جاتیں، بھٹے اگر نہ سلگائے جاتے، درختوں پر آرہ اگر نہ چلتا تو ظاہر ہے عمارت کا بناؤ بھی ظہور میں نہ آتا۔ پھر یہ راحت وسکون جو تمہیں ایک عمارت کی سکونت سے حاصل ہوتا ہے، کس صورت حال کا نتیجہ ہے؟

یقیناً اسی شور وشر اور ہنگامہ تخریب کا جو سر وسامان تعمیر کی جدو جہد نے عرصہ تک جاری رکھا تھا۔ اگر تخریب کا یہ شور وشر نہ ہوتا تو عمارت کا عیش وسکون بھی وجود میں نہ آتا۔ پس یہی حال فطرت کی تعمیری سرگرمیوں کا بھی سمجھو۔ وہ عمارت ہستی کا ایک ایک گوشہ تعمیر کرتی رہتی ہے۔ وہ اس کارخانہ کا ایک ایک کیل پرزہ ڈھالتی رہتی ہے' وہ اس کی درستگی وخوبی کی حفاظت کے لئے ہر نقصان کا دفعیہ اور ہر فساد کا ازالہ چاہتی ہے۔ تعمیر و درستگی کی یہی سرگرمیاں ہیں جو تمہیں بعض اوقات تخریب ونقصان کی ہولناکی دکھائی دیتی ہیں۔ حالانکہ یہاں تخریب کب ہے؟ جو کچھ ہے تعمیر ہی تعمیر ہے۔ سمندر میں تلاطم' دریا میں طغیانی' پہاڑوں میں آتش افشانی' جاڑوں میں برف باری' گرمیوں میں سموم' بارش میں ہنگامۂ ابروباد' تمہارے لیے خوش آئند مناظر نہیں ہوتے' لیکن تم نہیں جانتے کہ ان میں سے ہر حادثہ کائنات ہستی کی تعمیر و درستگی کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جس قدر دنیا کی کوئی مفید سے مفید چیز تمہاری نگاہ میں ہوسکتی ہے۔ اگر سمندر میں طوفان نہ اٹھتے تو میدانوں کو زندگی وشادابی کے لئے ایک قطرہ بارش میسر نہ آتا۔ اگر بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک نہ ہوتی تو بارانِ رحمت کا فیضان بھی نہ ہوتا۔ اگر آتش فشاں پہاڑوں کی چوٹیاں نہ پھٹتیں تو زمین کے اندر کا کھولتا ہوا مادہ اس کرہ کی تمام سطح پارہ پارہ کر دیتا۔ تم بول اٹھو گے: یہ مادہ پیدا ہی کیوں کیا گیا؟ لیکن تمہیں جاننا چاہئے کہ اگر یہ مادہ نہ ہوتا تو زمین کی قوت نشو ونما کا ایک ضروری عنصر مفقود ہو جاتا۔ یہی حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے جا بجا اشارات کیے ہیں۔ (ایضاً)

......☆......

جمال فطرت

لیکن فطرت کے افادہ وفیضان کی سب سے بڑی بخشایش اس کا عالم گیر حسن وجمال ہے۔ فطرت صرف بناتی اور سنوارتی ہی نہیں' بلکہ اس طرح بناتی اور سنوارتی ہے کہ اس کے ہر بناؤ میں حسن وزیبائی کا جلوہ اور اس کے ہر ظہور میں نظر افروزی کی نمود پیدا ہوگئی ہے۔ کائنات ہستی کو اس کی مجموعی حیثیت میں دیکھو یا اس کے ایک ایک گوشۂ خلقت پر نظر ڈالو' اس کا کوئی رخ نہیں جس پر حسن ورعنائی نے ایک نقاب زیبائش نہ ڈال دی ہو۔ ستاروں کا نظام اور ان کی سیر وگردش' سورج کی روشنی اور اس کی بوقلمونی' چاند کی گردش اور اس کا اتار چڑھاؤ' فضاء آسمانی کی وسعت اور اس کی

نیرنگیاں' بارش کا سماں اوراس کے تغیرات' سمندر کا منظراور دریاؤں کی روانی' پہاڑوں کی بلندیاں اور وادیوں کا نشیب' حیوانات کے اجسام اوران کا تنوع' نباتات کی صورت آرائیاں اور باغ وچمن کی رعنائیاں' پھولوں کی عطر بیزی اور پرندوں کی نغمہ سنجی' صبح کا چہرہ خنداں اورشام کا جلوہ محجوب' غرضیکہ تمام تماشا گاہ ہستی کے پیچھے حسن افروزی وجلوہ آرائی کی کوئی قوت کام کررہی ہے جو چاہتی ہے کہ جو کچھ بھی ظہور میں آئے' حسن وزیبائش کے ساتھ ظہور میں آئے اور کارخانۂ ہستی کا ہر گوشہ نگاہ کے لئے بہشت راحت وسکون بن جائے!

دراصل کائنات ہستی کا مایۂ خمیر ہی حسن وزیبائی ہے۔ فطرت نے جس طرح اس کے بناؤ کے لئے مادی عناصر پیدا کیے' اسی طرح اس کی خوب روئی اور رعنائی کے لئے معنوی عناصر کا بھی رنگ وروغن آراستہ کردیا۔ روشنی' رنگ' خوشبو اور نغمہ حسن ورعنائی کے وہ اجزا ہیں جن سے مشاطہ فطرت چہرہ وجود کی آرائش کررہی ہے۔ (ایضاً)

......☆......

بلبل کی نغمہ سنجی اورزاغ وزغن کا شوروغوغا

بلاشبہ کاروبارِ فطرت کے بعض مظاہر ایسے بھی ہیں جن میں تمہیں حسن وخوبی کی کوئی گیرائی محسوس نہیں ہوتی۔ تم کہتے ہو قمری وبلبل کی نغمہ سنجیوں کے ساتھ زاغ وزغن کا شوروغوغا کیوں ہے؟ لیکن تم بھول جاتے ہو کہ ارغنون ہستی کا نغمہ کسی ایک آہنگ ہی سے نہیں بنا ہے اور نہ بننا چاہئے تھا۔ جس طرح تمہارے آلات موسیقی کے پردوں میں زیروبم کے تمام آہنگ موجود ہوتے ہیں' اسی طرح سازِ فطرت کے تاروں میں بھی اتار چڑھاؤ کے تمام آہنگ موجود ہیں۔ اس میں ہلکے سے ہلکے سُر بھی ہیں جن سے باریک اور سریلی صدائیں نکلتی ہیں' موٹے سے موٹے سر بھی ہیں جو بلند سے بلند اور بھاری سے بھاری صدائیں پیدا کرتے ہیں۔ ان تمام سروں کے ملنے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے' وہی موسیقی کی حلاوت ہے' کیونکہ دنیا کی تمام چیزوں کی طرح موسیقی کی حقیقت بھی مختلف اجزاء کے امتزاج وتالیف سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی ایک ہی سر سے نغمے کی حلاوت پیدا ہوجائے۔ اگر تم بین یا ستار اٹھا کر صرف اس کے چڑھاؤ کا کوئی ایک پردہ چھیڑ دو گے' یا پیانو کی بھاری کنجیوں میں سے کوئی ایک کنجی ہی بجانے لگو گے تو یہ نغمہ نہ ہوگا' بھاں بھاں کی ایک کرخت آواز

ہوگی۔ یہی حال موسیقیٔ فطرت کے زیر و بم کا بھی ہے۔ تمہیں کوے کی کائیں کائیں اور چیل کی چیخ میں کوئی دل کشی محسوس نہیں ہوتی' لیکن موسیقیٔ فطرت کی تالیف کے لئے جس طرح قمری و بلبل کا ہلکا سر ضروری تھا' اسی طرح زاغ و زغن کا بھاری اور کرخت سر بھی ناگزیر تھا۔ بلبل و قمری کو اس سرگم کا اتار سمجھو اور زاغ و زغن کو چڑھاؤ۔

......☆......

قدرت کا خودرو سامانِ راحت و سرور اور انسان کی ناشکری

ایک لمحہ کے لئے تصور کرو کہ دنیا موجود ہے' مگر حسن و زیبائی کے تمام جلوؤں اور احساسات سے خالی ہے...... آسمان ہے مگر فضا کی یہ نگاہ پرور نیلگونی نہیں ہے...... ستارے ہیں مگر ان کی درخشندگی و جہاں تابی کی یہ جلوہ آرائی نہیں ہے...... درخت ہیں مگر بغیر سبزی کے...... پھول ہیں مگر بغیر رنگ و بو کے...... اشیاء کا اعتدال' اجسام کا تناسب' صداؤں کا ترنم' روشنی و رنگت کی بوقلمونی' ان میں سے کوئی چیز بھی وجود نہیں رکھتی' یا یوں کہا جائے کہ ہم میں ان کا احساس نہیں ہے۔ غور کرو! ایک ایسی دنیا کے ساتھ زندگی کا تصور کیسا بھیانک اور ہولناک منظر پیش کرتا ہے؟ ایسی زندگی جس میں نہ تو حسن کا احساس ہو نہ حسن کی جلوہ آرائی' نہ نگاہ کے لئے سرور ہو نہ سامعہ کے لئے حلاوت' نہ جذبات کی رقت ہو نہ محسوسات کی لطافت' یقیناً عذاب و جاں کاہی کی ایسی حالت ہوتی جس کا تصور بھی ہمارے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔

لیکن جس قدرت نے ہمیں زندگی دی' اس نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ زندگی کی سب سے بڑی نعمت یعنی حسن و زیبائی کی بخشش سے بھی مالا مال کر دے۔ اس نے ایک ہاتھ سے ہمیں حسن کا احساس دیا' دوسرے ہاتھ سے تمام دنیا کو جلوہ حسن بنا دیا۔ یہی حقیقت ہے جو ہمیں رحمت کی موجودگی کا یقین دلاتی ہے۔ اگر پردہ ہستی کے پیچھے صرف خالقیت ہی ہوتی' رحمت نہ ہوتی' یعنی پیدا کرنے یا پیدا ہو جانے کی قوت ہوتی' مگر افادہ و فیضان کا ارادہ نہ ہوتا تو یقیناً کائنات ہستی میں فطرت کے فضل و احسان کا یہ عالم گیر مظاہرہ بھی نہ ہوتا۔

......☆......

انسانی طبیعت کی یہ عالمگیر کمزوری ہے کہ جب تک وہ ایک نعمت سے محروم نہیں ہو جاتا'

اس کی قدر و قیمت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں کر سکتا۔ تم گنگا کے کنارے بستے ہو اس لئے تمہارے نزدیک زندگی کی سب سے زیادہ بے قدر چیز پانی ہے۔ لیکن اگر یہی پانی چوبیس گھنٹے تک میسر نہ آئے تو تمہیں معلوم ہو جائے اس کی قدر و قیمت کا کیا حال ہے۔ یہی حال فطرت کے فیضان جمال کا بھی ہے۔ اس کے عام اور بے پردہ جلوے شب و روز تمہاری نگاہوں کے سامنے سے گزرتے رہتے ہیں اس لئے تمہیں ان کی قدر و قیمت محسوس نہیں ہوتی...... صبح اپنی ساری جلوہ آرائیوں کے ساتھ روز آتی ہے اس لئے تم بستر سے سر اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے...... چاندنی اپنی ساری حسن افروزیوں کے ساتھ ہمیشہ نکھرتی رہتی ہے' اس لئے تم کھڑکیاں بند کر کے سو جاتے ہو...... لیکن جب یہی شب و روز کے جلوہ ہائے فطرت تمہاری نظروں سے روپوش ہو جاتے ہیں یا تم میں ان کے نظارہ وسماع کی استعداد باقی نہیں رہتی تو غور کرو اس وقت تمہارے احساسات کا کیا حال ہوتا ہے؟ کیا تم محسوس نہیں کرتے کہ ان میں سے ہر چیز زندگی کی ایک بے بہا برکت اور معیشت کی ایک عظیم الشان نعمت تھی؟...... سرد ملکوں کے باشندوں سے پوچھو جہاں سال کا بڑا حصہ ابر آلود گزرتا ہے۔ کیا سورج کی کرنوں سے بڑھ کر بھی زندگی کی کوئی مسرت ہو سکتی ہے؟...... ایک بیمار سے پوچھو جو نقل و حرکت سے محروم بستر مرض پر پڑا ہے وہ بتائے گا کہ آسمان کی صاف اور نیلگوں فضا کا ایک نظارہ راحت و سکون کی کتنی بڑی دولت ہے...... ایک اندھا جو کہ پیدائشی اندھا نہ تھا' تمہیں بتا سکتا ہے کہ سورج کی روشنی اور باغ و چمن کی بہار دیکھے بغیر زندگی بسر کرنا کیسی نا قابل برداشت مصیبت ہے!...... تم بسا اوقات زندگی کی مصنوعی آسائشوں کے لئے ترستے ہو اور خیال کرتے ہو کہ زندگی کی سب سے بڑی نعمت چاندی سونے کا ڈھیر اور جاہ و حشم کی نمائش ہے لیکن تم بھول جاتے ہو کہ زندگی کی حقیقی مسرتوں کا جو خود رو سامان فطرت نے ہر مخلوق کے لئے پیدا کر رکھا ہے' اس سے بڑھ کر دنیا کی دولت و حشمت کون سا سامانِ نشاط مہیا کر سکتی ہے؟ اور اگر انسان کو وہ سب کچھ میسر ہو تو پھر اس کے بعد کیا باقی رہ جاتا ہے؟...... جس دنیا میں سورج ہر روز چمکتا ہو...... جس دنیا میں صبح ہر روز مسکراتی اور شام ہر روز پردہ شب میں چھپ جاتی ہو...... جس کی راتیں آسمان کی قندیلوں سے مزین اور جس کی چاندنی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہو...... جس کی بہار سبزہ و گل سے لدی ہوئی اور جس کی فصلیں لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے گراں بار ہوں...... جس دنیا

میں روشنی اپنی چمک، رنگ اپنی بوقلمونی، خوشبو اپنی عطر بیزی اور موسیقی اپنا نغمہ وآہنگ رکھتی ہو، کیا اس دنیا کا کوئی باشندہ آسائش حیات سے محروم اور نعمتِ معیشت سے مفلس ہوسکتا ہے؟ کیا کسی آنکھ کے لئے جو دیکھ سکتی ہو اور کسی دماغ کے لئے جو محسوس کرسکتا ہو، ایک ایسی دنیا میں نامرادی و بدبختی کا گلہ جائز ہے؟ قرآن نے جابجا انسان کو اس کے اسی کفرانِ نعمت پر توجہ دلائی ہے۔

......☆......

پھر دیکھو! کارسازِ فطرت کی یہ کیسی کرشمہ سازی ہے کہ حالات متفاوت ہیں، طبائع متنوع ہیں، اشغال مختلف ہیں، اغراض متضاد ہیں، لیکن معیشت کی دل بستگی اور سرگرمی سب کے لئے یکساں ہے اور سب ایک ہی طرح اس کی مشغولیتوں کے لئے جوش وطلب رکھتے ہیں۔ مرد وعورت، طفل و جواں، امیر وفقیر، عالم وجاہل، قوی وضعیف، تندرست و بیمار، مجرد ومتاہل، حاملہ ومرضعہ سب اپنی اپنی حالتوں میں منہمک ہیں اور کوئی نہیں جس کے لئے زندگی کی کاوشوں میں محویت نہ ہو۔ امیر اپنے محل کے عیش ونشاط میں اور فقیر اپنی بے سروسامانیوں کی فاقہ مستی میں زندگی بسر کرتا ہے، لیکن دونوں کے لئے زندگی کی مشغولیتوں میں دل بستگی ہوتی ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کون زیادہ مشغول ہے۔ ایک تاجر جس انہماک کے ساتھ اپنی لاکھوں روپیہ کی آمدنی کا حساب کرتا ہے، اسی طرح ایک مزدور بھی دن بھر کی محنت کے چند پیسے گن لیا کرتا ہے اور دونوں کے لئے یکساں طور پر زندگی محبوب ہوتی ہے۔ ایک حکیم کو دیکھو جو اپنے علم ودانش کی کاوشوں میں غرق ہے اور ایک دھقان کو دیکھو جو دوپہر کی دھوپ میں برہنہ سر ہل جوت رہا ہے اور پھر بتاؤ! کس کے لئے زندگی کی مشغولیتوں میں زیادہ دل بستگی ہے؟

پھر دیکھو! بچے کی پیدائش ماں کے لئے کیسی جاں کاہی ومصیبت ہوتی ہے! اس کی پرورش ونگرانی کس طرح خود فروشانہ مشقتوں کا ایک طول طویل سلسلہ ہے! تاہم یہ سارا معاملہ کچھ ایسی خواہشوں اور جذبوں کے ساتھ وابستہ کردیا گیا ہے کہ ہر عورت میں ماں بننے کی قدرتی طلب ہے اور ہر ماں پرورشِ اولاد کے لئے مجنونانہ خود فراموشی رکھتی ہے۔ وہ زندگی کا سب سے بڑا دکھ سہے گی اور پھر اسی دکھ میں زندگی کی سب سے بڑی مسرت محسوس کرے گی۔ وہ جب اپنی معیشت کی ساری راحتیں قربان کردیتی ہے اور اپنی رگوں کے خون کا ایک ایک قطرہ دودھ بنا کر پلا دیتی ہے تو اس کے دل کا ایک ایک ریشہ زندگی کے سب سے بڑے احساسِ مسرت سے معمور ہو جاتا ہے!

پھر کاروبارِ فطرت کے یہ تصرفات دیکھو کہ کس طرح نوع انسانی کے منتشر افراد اجتماعی زندگی کے بندھنوں سے باہم دگر مربوط کر دیئے گئے ہیں اور کس طرح صلہ رحمی کے رشتہ نے ہر فرد کو سینکڑوں ہزاروں افراد کے ساتھ جوڑ رکھا ہے!

فرض کرو! زندگی و معیشت ان تمام موثرات سے خالی ہوتی، لیکن قرآن کہتا ہے کہ خالی نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے کہ فطرت کائنات میں رحمت کارفرما ہے اور رحمت کا مقتضیٰ یہی تھا کہ معیشت کی مشقتوں کو خوش گوار بنا دے اور زندگی کے لئے تسکین و راحت کا سامان پیدا کر دے۔ یہ رحمت کی کرشمہ سازیاں ہیں جنہوں نے رنج میں راحت، الم میں لذت اور سختیوں میں دل پذیری کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

......☆......

جامعیت پیغمبرؐ

اسلام کا داعی مسیحیت کے مقدس پہاڑی واعظ کی طرح صرف ایک اخلاقی معلم ہی نہ تھا اور نہ ہی دنیا کے فاتح حکمرانوں کی طرح محض ایک جہانگیر اور عالم ستان شہنشاہ تھا۔ اسلام نے دین کو دنیا سے اور شریعت کو حکومت و جہانبانی سے الگ نہیں رکھا۔ وہ یہ سکھلانے آیا تھا کہ دین و دنیا دو نہیں ایک ہی چیز ہیں اور شریعت سے حکومت و سلطنت الگ نہیں۔ بلکہ سچی حکومت اور خدا کی مرضی کے مطابق سلطنت وہی ہے جس کو شریعت نے خود پیدا کیا ہو۔ پس اسلام کے داعی کا وجود ایک ہی وقت میں ان تمام حیثیتوں اور منصوبوں کا جامع تھا جو ہمیشہ دنیا کی صدہا مختلف شخصیتوں کے اندر منقسم رہی ہے۔ وہ اللہ کا پیغمبر تھا۔ شریعت کا مقنن تھا، امت کا بانی تھا، ملکوں کا حاکم اور سلطنت کا مالک تھا۔ وہ اگر پتوں اور چھال سے پٹی ہوئی مسجد کے منبر پر وحی الٰہی کا ترجمان اور انسانی سعادت و ہدایت کا واعظ تھا تو اسی کے صحن میں یمن کا خراج تقسیم کرنے والا اور فوجوں کو میدان جنگ میں بھیجنے کے لیے سپہ سالار لشکر بھی تھا۔ وہ ایک ہی وقت اور ایک ہی زندگی میں گھروں کا نظام معاشرت درست کرتا، نکاح و طلاق کے قوانین نافذ کرتا، ساتھ ہی بدر کے کنارے دشمنوں کا حملہ بھی روکتا اور مکہ کی گھاٹیوں میں سے ایک فاتح حکمران کی طرح نمایاں بھی ہوتا تھا۔ غرضیکہ اس کی ایک شخصیت کے اندر مختلف حیثیتیں اور مناصب جمع تھے۔ اسلام کا نظام دینی یہی تھا کہ یہ ساری قوتیں ایک ہی فرد میں جمع

رہیں...... جب آپ دنیا سے تشریف لے گئے تو خلفاء راشدین کی خلافت خاصہ اسی اجتماع قوی و مناصب پر قائم ہوئی اور اس لیے اس کو منہاج نبوت سے تعبیر کیا گیا یعنی یہ نیابت ٹھیک ہر لحاظ اور ہر پہلو سے شخص جامع نبوت کی سچی قائمقامی اپنے اندر رکھتی تھی۔

اطاعت امیر اور اس کا دائرۂ کار

قرآن نے اس قانونِ شریعت کا اعلان کیا ہے کہ خلیفہ و امام کی اطاعت مسلمانوں پر فرض ہے اور اس کا وجود نظام جماعت کے مرکزی اقتدار کا مالک کیوں کہ کسی جماعت کی جماعتی زندگی بغیر کسی مرکزی قوت کے ناممکن ہے...... تم پانچ آدمیوں کی بھی کوئی مجلس منعقد کرتے ہو تو سب سے پہلے ایک پریذیڈنٹ کا انتخاب کرتے ہو کہ جب تک کسی کو صدر نہ مان لیں گے، پانچ آدمیوں کی مجلس بھی کوئی صحیح کام نہ کر سکے گی......

فوج ترتیب دیتے ہوئے تو دس آدمیوں کو بھی بغیر ایک افسر کی نہیں چھوڑتے اور اس کی اطاعت ماتحتوں کے لیے فرض سمجھتے ہو اور یقین کرتے ہو کہ بغیر اس کے فوج کا نظام باقی نہیں رہ سکتا...... پانچ دس آدمی بھی اگر بغیر امیر کے کام نہیں کر سکتے تو قومیں کیوں کر بلا امیر اپنے فرائض انجام دے سکتی ہیں۔ اس سے بھی سادہ تر مثال یہ ہے کہ اپنے اپنے گھروں اور خاندانوں کو دیکھو، خود تمہارا گھر بھی ایک چھوٹی سی آبادی ہے۔ اگر بیوی تمہارا حکم نہ مانے تو تم کیوں بگڑتے ہو۔ اگر گھر کے لوگ تمہارے کہنے پر نہ چلیں تو تم کیوں لڑتے ہو۔ تم کہتے ہو کہ فلاں گھر میں امن و نظام نہیں، روزانہ خانہ جنگی ہوتی رہتی ہے۔ یہ سب کچھ کیوں ہے......؟ نہ صرف اس لیے کہ کوئی جماعت امن و نظم پا نہیں سکتی جب تک کہ اس کا کوئی امیر نہ ہو۔ گھر اور خاندان بھی ایک چھوٹی سی جماعت ہے۔ تم گھر کے بڑے ہو یعنی امیر، پس گھر کی عافیت اور انتظام و کامیابی اس پر موقوف ہے کہ سب تمہاری سنیں اور تمہارے کہنے پر چلیں تو پھر اسلام بھی یہی کہتا ہے کہ اقوام عالم کا نظم و ضبط اس وقت تک ہو نہیں سکتا جب تک کہ ایک امیر و صدر خلیفہ و حاکم مرکزی نہ ہو اور اس کی اطاعت نہ کی جائے۔

جغرافیائی مرکزیت

کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جب تک اس کا کوئی ارضی مرکز نہ ہو...... کوئی تعلیم باقی نہیں رہ

سکتی جب تک اس کی ایک قائم و جاری درس گاہ نہ ہو...... کوئی دریا جاری نہیں رہ سکتا جب تک ایک محفوظ سرچشمہ سے اس کا لگاؤ نہ ہو۔

نظام شمسی کا ہر ستارہ، روشنی اور حرارت صرف اپنے مرکز شمسی ہی سے حاصل کرتا ہے اسی کی بالاتر جاذبیت ہے، جس نے یہ پورا معلق کارخانہ سنبھال رکھا ہے...... یہی قانون الٰہی ہے جس پر اس کی شریعت کے تمام جماعتی احکام مبنی ہیں۔ پس جس طرح اسلام نے امت کے بقاء اور حق و ہدایت کے لیے ہر طرح کے مرکز قرار دیئے ضرور تھا کہ ایک ارضی مرکز بھی قیامت تک کے لیے قرار دے دیا جائے...... اسلام نے اس غرض سے سرزمینِ حجاز کو منتخب فرمایا۔ یہی نافِ زمین کی آخری اور دائمی ہدایت و سعادت کے لئے مرکزی سرچشمہ اور روحانی درسگاہ قرار پائی اور چونکہ سرزمینِ حجاز جزیرہ عرب میں واقع تھی، وہی اسلام کا اولین وطن رہی۔ اس کا سب سے پہلا یہی سرچشمہ تھا اس لیے ضرور تھا کہ اسلامی مرکز کے قریبی گرد و پیش کا بھی وہی حکم ہوتا جو اصل مرکز کا تھا۔ لہٰذا یہ تمام سرزمین بھی جو حجاز کی وادی غیر ذی زرع کو گھیرے ہوئے ہے، اس حکم میں داخل ہوگئی۔

ذالک تقدیر العزیز العلیم . (۳۶:۳۸)

مرکزی ارض سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی دعوت ایک عالمگیر اور دنیا کی بین المللی دعوت تھی۔ وہ کسی خاص ملک اور قوم میں محدود نہ تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کے اجزاء تمام کرہ ارض میں بکھر جانے اور پھیل جانے والے تھے۔ پس ان بکھرے ہوئے اجزاء کو ایک دائمی متحدہ قومیت کی ترکیب میں قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ کوئی ایک مقام ایسا مخصوص کر دیا جاتا جو ان تمام متفرق و منتشر اجزاء کے لیے اتحاد و انضمام کا مرکزی نقطہ ہوتا۔ سارے بکھرے ہوئے اجزاء وہاں پہنچ کر سمٹ جاتے۔ تمام پھیلی ہوئی شاخیں وہاں اکٹھی ہو کر جڑ جاتیں۔ ہر شاخ کو اس جڑ سے زندگی ملتی، ہر نہر اس سرچشمہ سے سیراب ہوتی، ہر ستارہ اس سورج سے روشنی اور گرمی لیتا، ہر دوری اس سے قرب پاتی، ہر فصل کو اس سے مواصلات ملتی اور ہر انتشار کو اس سے اتحاد و یگانگی حاصل ہوتی۔ تاکہ وہی مقام تمام امت کی تعلیم و ہدایت کے لیے ایک وسطی درس گاہ کا کام دیتا۔ وہی تمام کرہ ارض کی پھیلی ہوئی کثرت کے لئے نقطۂ وحدت ہوتا۔ ساری دنیا ٹھنڈی پڑ جاتی پر اس کی تنویر کبھی نہ بجھتی۔ ساری دنیا تاریک ہو جاتی مگر اس کی روشنی گل نہ ہوتی۔ اگر تمام دنیا اولاد آدم کے باہمی جنگ و جدال اور فتنہ و

فساد سے خونریزی کا دوزخ بن جاتی' پھر بھی ایک گوشۂ قدس ایسا رہتا جو ہمیشہ امن و صحت کا بہشت ہوتا اور انسانی فتنہ و فساد کی پرچھائیں بھی وہاں نہ پڑسکتیں۔

اس کا ایک ایک چپہ مقدس ہوتا' اس کا ایک ایک کونہ خدا کے نام پر محترم ہوتا۔ اس کا ایک ایک ذرہ اس کے جلال و قدوسیت کی جلوہ گاہ ہوتا۔ خونریز اور سرکش انسان ہر مقام کو اپنے ظلم و فساد کی نجاست سے آلودہ کرسکتا' پر اس کی فضاء مقدس ہمیشہ پاک و محفوظ رہتی اور جب زمین کے ہر گوشے میں انسانی سرکشی اپنی مجرمانہ خداوندی کا اعلان کرتی تو وہاں خدا کی سچی عبادت کا تخت عظمت وجلال بچھ جاتا اور اس کا ظل عاطفت تمام بندگانِ حق کو اپنی طرف کھینچ بلاتا...... دنیا پر کفر و شرک کے جماؤ اور اٹھان کا کیسا ہی سخت اور برا وقت آجاتا مگر سچی توحید اور بے حیل خدا پرستی کا وہ ایک ایسا گھر ہوتا جہاں خدا اور اس کی صداقت کے سوا نہ کسی خیال کی پہنچ ہوتی نہ کسی صدا کی گونج اٹھ سکتی۔ وہ انسان کی پھیلی نسل کے لیے ایک مشترک اور عالمگیر گھر ہوتا۔ کٹ کٹ کر قومیں وہاں جڑتیں اور بکھر بکھر کے نسلیں وہاں سمٹتیں' پرند جس طرح اپنے آشیانوں کی طرف اڑتے ہیں اور پروانوں کو تم نے دیکھا کہ روشنی کی طرف دوڑتے ہیں' ٹھیک اسی طرح انسانوں کے گروہ اور قوموں کے قافلے اس کی طرف دوڑتے اور زمین کی خشکی و تری کی وہ ساری راہیں جو اس تک پہنچ سکتیں وہ ہمیشہ مسافروں اور قافلوں سے بھری رہتیں۔

دنیا بھر کے زخمی دل وہاں پہنچتے اور شفا اور تندرستی کا مرہم پاتے۔ بے قرار و مضطرب روحوں کے لئے اس کے آغوشِ کرم میں آرام و سکون کی ٹھنڈک ہوتی۔ گناہوں کی کثافتوں سے آلودہ جسم وہاں لائے جاتے اور محرومی اور نامرادی کی مایوسیوں سے گھائل دل چیختے اور تڑپتے ہوئے اس کی جانب دوڑتے' تو اس کی پاک ہوا امید و مراد کی عطر بیزی سے مشک بار ہوجاتی۔ اس کے پہاڑوں کی چوٹیاں خدا کی محبت و بخشش کے بادلوں میں چھپ جاتیں اور اس کی مقدس فضا میں رحمت کے فرشتے غول در غول اتر کر اپنی معصوم مسکراہٹ اور اپنے پاک نغموں کے ساتھ مغفرت اور قبولیت کی بشارتیں بانٹتے۔

شاخوں کی شادابی جڑ پر موقوف ہے۔ درختوں کی اگر جڑ سلامت ہے تو شاخوں اور پتوں کے مرجھا جانے سے باغ اجڑ نہیں سکتا۔ دس ٹہنیاں کاٹ دی جائیں گی تو بیس نئی نکل آئیں گی۔ اس

طرح قوم کا مرکز ارضی اگر محفوظ ہے تو اس کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کی بربادی سے قوم نہیں مٹ سکتی۔ سارے ٹکڑے مٹ جائیں' اگر مرکز باقی ہے تو پھر نئی نئی شاخیں بھی پھوٹیں گی اور نئی نئی زندگیاں بھی ابھریں گی۔ پھر جس طرح مسلمانوں کے مجموعی دائرہ کے لیے خلیفہ و امام کے وجود کو مرکز ٹھہرایا گیا' اسی طرح ان کی ارضی وسعت و انتشار کے لیے عبادت کدہ ابراہیمی کا کعبۃ اللہ اس کی سرزمین حجاز اور اس کا ملک جزیرہ عرب' دائمی مرکز قرار پایا۔

......☆......

فکری وحدت اور فکری مرکزیت

قرآن کہتا ہے اقتدار اعلیٰ وقوتِ حاکمہ صرف خدا کے لیے مانی جائے۔ اس کے سوا کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کے سامنے سرِ نیاز خم کیا جائے اور اپنی پیشانیوں کو جھکایا جائے۔ وہی وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے۔ صرف وہ ایک ہی اس لائق ہے کہ اس کے لیے قوتِ حاکمہ اور اقتدارِ اعلیٰ مانا جائے۔ وہی ایک صرف اس قابل ہے کہ بنی نوعِ انسان کے دلوں پر حکومت کرے۔ وہی اس کا مستحق ہے کہ جبینِ نیاز اور سرِ عجز اس کے سامنے خم کیا جائے۔ دل و دماغ میں صرف اس کا خوف سمائے۔ امیدیں اسی سے وابستہ کی جائیں۔ حاکم و بادشاہ' شہنشاہ' واضع قانون' شارع اور قانون ساز صرف اس کو مانا جائے۔ ماننے کے لائق اور تسلیم کے قابل صرف اس کا قانون ہو سکتا ہے...... صرف اس کے لیے جانی و مالی قربانی کی جائے...... ایثار و فداکاری کے لائق صرف وہی ہے...... وہی ہے جس سے محبت کی جائے اور دل لگایا جائے...... اسی سے ڈرایا جائے...... اس کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں۔ کوئی ماویٰ و ملجا نہیں...... اس کے سوا کوئی نہیں جو نفع پہنچا سکے یا ضرر دے سکے...... وہ جس کو ضرر دینا چاہے تو کوئی طاقت اس کو روکنے والی نہیں...... اگر وہ کسی کو نفع پہنچانا چاہے تو کوئی اس کے ہاتھ روک نہیں سکتا...... وہی الٰہ ہے۔ وہی معبود' وہی رب' وہی حاکم' الا لہ الحکم والامر' خبردار اس کے لیے حکومت ہے اور اسی کا امر قابل قبول ہے' کوئی نہیں جس کا حکم مانا جائے' کوئی نہیں جس کا امر تسلیم کیا جائے' انسان کے ظاہر و باطن پر صرف اسی کی حکمرانی ہے...... وہ کہتا ہے" جب تم دیکھتے ہو کہ تمہارے وجود کے اندر اور باہر عالم تکوین میں صرف اسی کی حکمرانی ہے تو پھر تمہارے قلوب' اعمال' افعال اور کاروبارِ زندگی میں اسی کی حکمرانی کیوں نہ ہو"...... وہ کہتا ہے' دنیا

مختلف قسم کے الٰہ و معبود بنا لیتی ہے۔ کہیں انسانی استبداد و استبعاد کے وہ مہیب بت ہیں، جنھوں نے اپنی غلامی کی زنجیروں سے خدا کے بندوں کو جکڑ رکھا ہے اور ان کی قوت شیطانی کے مظاہر کبھی حکومتوں کے جبر و تسلط کی صورت میں، کبھی دولت و مال میں، کبھی عزت و جاہ کے غرور میں، کبھی جماعتوں کی رہنمائی و حکمرانی کے ادعاء میں، کبھی علم و فضل اور کبھی زہد و تقویٰ کے گھمنڈ میں غرض مختلف شکلوں میں اور مختلف ناموں سے اللہ کے بندوں کو اللہ سے چھیننا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ کہیں چاندی اور سونے کے ڈھیروں کے بت، کہیں قیمتی کپڑوں، موٹروں اور ہوٹلوں اور کوٹھیوں کے بت، اس میں لیڈروں و حکام کے بت ہیں اور کہیں پیروں، مولویوں، پیشواؤں اور رہنماؤں کے بت ہیں تو کہیں خواہشاتِ نفسانی کے بت ہیں۔ رسولِ عربیؐ کے وقت میں تو تین سو ساٹھ بت تھے جن سے بیت خلیل کی دیواریں چھپ گئی تھیں لیکن آج ان کی امت میں تو ہر چمکیلی ہستی لات اور منات کی قائم مقام ہے اور ہر حاکم، ہر رئیس اور سب سے آخر مگر سب سے پہلے ہر خوش لباس لیڈر ایک بت کا حکم رکھتا ہے۔ پوری ملت موحد انہی کی پوجا و پرستش میں مشغول ہے۔ پس قرآن کہتا ہے، یہ سب کچھ جو تم کر رہے ہو، شرک ہے اور کفر ہے۔ یہ اس کی صفات میں ساجھی ٹھہرانا ہے اور اس کی حاکمیت میں غیروں کو سہیم و حصہ دار بنانا ہے جس کا مٹانا قرآن کا اولین فرض ہے۔

کیا دنیا بھول گئی کہ مسلمان نے اپنے رسول ﷺ اور خلفائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے ناموں سے پکارا اور اپنے خلفاء کو بات چیت پر ٹوکا۔ ان پر سخت اعتراض کیے۔ ان کو خطبہ دیتے ہوئے روک دیا اور اس وقت تک خطبہ نہیں دینے دیا جب تک خلیفہ اپنی صفائی نہیں پیش کر چکے۔ اپنے خلفاء کو تلوار کی دھار، نیزہ کی اَنی اور تیر کے پھل سے درست کرنے کی دھمکی دی اور خلفا نے ان باتوں پر بجائے ناراض ہونے کے فخر کیا اور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا کہ الحمد للہ ایسے حق گو امت میں موجود ہیں لیکن اس کے مقابلے میں آج بادشاہوں اور ریاستوں کو چھوڑ کر صرف اپنی قوم کے ان لوگوں کو دیکھو جن کے پاس جائیداد کا کوئی حصہ یا چاندی سونے کا کچھ حصہ جمع ہو گیا ہو۔ ان میں بہت سے لوگ دولت کو تمام فضیلتوں کا منبع قرار دیتے ہیں اور........ اس لیے لیڈر ہیں۔ پیشوائی کے مدعی ہیں۔ ان میں بہت سے فراعنہ اور نماردہ تم کو ایسے ملیں گے جن کا نام اگر ان خطابوں سے الگ کر کے زبان سے نکالا جائے جو ان کے شیطانی خبث وغرور نے گھڑ

لیے ہیں یا حکومت کی خوشامد وغلامی کا صطباغ لے کر حاصل کیے ہیں تو ان کے چہرے مارے غضب کے درندوں کی طرح خونخوار ہو جاتے ہیں اور چار پایوں کی طرح ہیجان وغصہ اور غلاظت کو روک نہیں سکتے۔ اس بدترین نسل فراعنہ سے کوئی نہیں پوچھتا کہ یہ کیا نمرودیت وفرعونیت وشیطانیت ہے۔ کیا ہے جس نے ان کے نفسوں کو مغرور کر دیا ہے اور وہ کونسا ورثہ عظمت وجلال ہے جو تکبر اور غرور کی طرح ان کو اپنے مورث اعلیٰ فرعون اور نمرود سے ملا ہے۔ اگر دولت کا گھمنڈ ہے تو مجھے اس میں شک ہے کہ ان کے پاس جہل کی طرح دولت بھی کثیر ہے اور اگر ان پرستاروں اور مصاحبوں کا انہیں غرور ہے جو غلامی اور دولت پرستی کے کیڑے ہیں تو میں یہ باور کرنے کے لیے کوئی وجہ نہیں پاتا کہ دنیا کے مغرور و مستبد بادشاہوں سے بھی بڑھ کر اپنے پرستاروں اور غلامی کا حلقہ ارد گرد دیکھتے ہیں۔ بہر حال کچھ بھی ہو مگر میری آواز کا ہر سامع آج انہیں ان کو قوت کی ناکامی کا پیام پہنچادے۔ اب ان کی تباہی و بربادی کا آخری وقت آ گیا۔ وہ دنیا جس نے بحر احمر میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کو غرق ہوتے دیکھا تھا اور اس طرح کے ان گنت تماشے ہزاروں بار دیکھ چکی ہے، وقت آ گیا ہے کہ ہندوستان کے اندر بحر حریت وصداقت میں جس کی موجیں نہ صرف نام ہی کو نہیں بلکہ حقیقت میں بھی احمر ہوں گی، ان مغرور لیڈروں کے غرق ہونے کا تماشہ دیکھ لے گی۔ وہ وقت دور نہیں جبکہ ان کے اور ان کے مصاحبوں کے لیے آتش کدے تیار ہوں گے اور ان کے خاکستر کو تند وتیز ہوا کے جھونکوں میں اڑتے ہوئے دیکھے گی۔

آج ارض وسماء، بحر و بر، فضائے آسمانی اور خلاء سلطانی میں ان کی ہلاکت و بربادی کی آندھیاں چل رہی ہیں اور مرد مومن کی چشم بصیرت کو یہ تمام تماشۂ انقلاب امم واستبدال دول واقوم کا نظر آ رہا ہے۔ اس کی آنکھیں وہ سب کچھ دیکھ رہی ہیں کہ جو ان کی بربادی وتباہی کا سامان ہو رہا ہے۔ آج کی رفتار، دریا کی روانی، لیل ونہار کی گردش، اقوام وملل کے تغیرات اور گردشِ زمانہ کی حرکت افراد واشخاص کے نفسیاتی تمول، اذہان وقلوب کے میلانات، طبائع انسانی کے رجحانات یہ سب بتا رہے ہیں کہ نمارده فراعنہ دورِ حاضر کی ہلاکت وفلاکت، تباہی و بربادی، خسروان ومغفوریت کا وقت بالکل قریب آ چکا ہے۔ وہ وقت دور نہیں جبکہ ان کی دولت ومال اور عز وجاہ کے جنازے نکلیں گے اور یہ صفحۂ ہستی سے یوں مٹائے جائیں گے کہ تاریخ عالم میں ان کے افسانے رہ جائیں گے، اور نام و

نشان باقی نہ رہیں گے۔ان کی اس تباہی و بربادی پر کوئی نوحہ و ماتم کرنے والا نہ ہوگا۔ نہ زمین ان پر ترس کھائے گی اور نہ ہی آسمان روئے گا۔

مومن و مسلم ہستی وہ ہے جو صرف ایک ہی کی محکوم ہے' اس کے گلے میں محکومی کی ایک بوجھل زنجیر ضرور ہے' پر مختلف سمتوں میں کھینچنے والی بہت سی ہلکی زنجیریں نہیں ہیں...... وہ ماں باپ کی اطاعت اور فرمانبرداری کرتا ہے کیونکہ اس کے ایک ہی حاکم نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے......وہ دوستوں سے محبت رکھتا ہے کیونکہ اسے رفیقوں اور ساتھیوں کے ساتھ سچے برتاؤ کی تلقین کی گئی ہے......وہ اپنے سے ہر بزرگ اور بڑے کا ادب ملحوظ رکھتا ہے کیونکہ اس کے ادب آموز حقیقی نے ایسے ہی بتایا ہے۔وہ پادشاہوں اور حاکموں کا حکم بھی مانتا ہے کیوں کہ حاکموں کے ماننے سے اسے نہیں روکا گیا ہے جو اس کے حاکم حقیقی کے حکم کے خلاف نہ ہو......وہ دنیا کے ایسے پادشاہوں کی اطاعت کرتا ہے جو اس کی آسمانی پادشاہت کی اطاعت کرتے ہیں کیونکہ اسے تعلیم دی گئی ہے کہ وہ ہمیشہ ہی ایسا کرے لیکن یہ سب کچھ جو وہ کرتا ہے تو اس لیے نہیں کرتا کہ سب کے لئے کوئی حکم ماننا اور ان کو جھکنے کی جگہ سمجھتا ہے بلکہ صرف اس لیے کہ اطاعت ایک ہی کے لیے ہے اور حکم صرف ایک ہی کا ہے۔ جب اس ایک ہی حکم دینے والے نے ان سب باتوں کا حکم دے دیا تو ضرور ہے کہ خدا کے لیے ان سب بندوں کو بھی مانا جائے اور اللہ کی اطاعت کی خاطر وہ اس کے بندوں کا بھی مطیع ہو جائے۔

......☆......

کارساز قدرت کی بھی کیا کرشمہ سازیاں ہیں۔ کچھ خاک امید کی لی اور کچھ خاکستر حسرت کی' دونوں کی آمیزش سے ایک پتلا بنایا اور انسان نام رکھ کر اس ہنگامہ زار ارضی میں بھیج دیا۔وہ کبھی امید کی روشنی سے شگفتہ ہوتا ہے' کبھی ناامیدی کی تاریکی سے گھبرا جاتا ہے۔ کبھی ولولوں کی بہار میں زمزمہ ساز نغمہ انبساط ہوتا ہے اور کبھی حسرت وافسوس کی خزاں میں امیدوں کے پژمردہ پتوں کو گنتا ہے' کبھی ہنستا ہے اور کبھی ڈرتا ہے۔ کبھی رقص نشاط اور کبھی سینہ ماتم ایک ہاتھ سے جمع کرتا ہے اور دوسرے سے کھوتا ہے۔

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

پس اے ساکنانِ غفلت آبادِ ہستی! وائے رہروانِ سفر مدہوشی وفراموشی! مجھے بتلاؤ کہ تمہاری ہستی کی حقیقت اگر یہ نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے؟ اور اے نیرنگ آرائی تماشہ گاہ عالم کیا یہ ہنگامہ حیات، یہ شورش زندگی، یہ رستخیز کشاکش ہستی تو نے صرف اتنے ہی کے لئے بنائی ہے۔

کمند کوتہ و بازوئے ست و بام بلند
ہمن حوالہ و نومیدیم گنہ گیر ند

ربنا ما خلقت هذا باطلا.

☆

موسم بہار زندگی و شگفتگی کا موسم ہوتا ہے اور انسان کے اندر رگوں میں دوڑنے والے خون سے لے کر درختوں کی شاخوں اور ٹہنیوں تک ہر چیز میں جوش حیات اور ولولہ انبساط پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی حال ان قوموں کا ہوتا ہے وہ جب اپنے دور امید سے گزرتی ہیں، تمام دنیا ان کے لئے ایک بہشت امید بن جاتی ہے اور اس کی ہر آواز ان کے کانوں کے لئے ایک ترانہ امید کا کام دیتی ہے۔ وہ اپنے اندر دیکھتے ہیں تو دل کا ہر کونہ امیدوں اور ولولوں کا آشیانہ نظر آتا ہے اور باہر نظر ڈالتے ہیں تو دنیا کا کوئی حصہ عروس امید کی مسکراہٹ سے خالی نہیں ہوتا۔ اس طلسم زار ہست و نیست میں انسان سے باہر نہ غم کا وجود ہے اور نہ خوشی کا۔ زندگی کی تمام کامیابیاں اور مسرتیں دراصل دل کی عشرت کامیوں سے ہیں۔ جب تک آپ کے دل کے طاقِ مخفی میں امید کا چراغ روشن ہے، اس وقت تک دنیا بھی عیش و مسرت کی روشنی سے خالی نہیں۔ لیکن اگر بادِ صرصرو نامرادی کا کوئی جھونکا وہاں تک پہنچ گیا تو پھر خواہ آفتاب نصف النہار پر درخشاں کیوں نہ ہو مگر یقین کیجئے کہ دنیا کا یہ تمام نظام منور آپ کے لیے ظلمت سرائے تاریک ہے۔

یہ وہ خوش نصیب قومیں ہیں کہ ان کے دل کے اندر امید کا چراغ روشن ہوتا ہے۔ یہ جہاں جاتے ہیں، اقبال و کامرانی کی روشنی استقبال کرتی ہے چونکہ ان کے دل کے اندر سلطان امید فتح یاب ہوتا ہے اس لیے زمین کے اوپر بھی نامرادی و ناکامی کی صفوں پر فتح یاب ہوتے ہیں۔ جس ہاتھ میں امید کا علم ہو تو پھر دنیا کی کوئی قوت اس ہاتھ کو زیر نہیں کر سکتی۔ ان کی امید، حسرت و آرزو نہیں ہوتی جو محض ناکامی و نامرادی کے ماتم کے لئے ہے۔ بلکہ کامیابیوں کا ایک پیغام دعوت ہے جو دل میں امید بن کر اور دل کے باہر عیش و مراد کی کامرانی و فیروزمندی کی نوید بن کر جلوہ آرا ہوتی ہے۔ لیکن اس سطح

ارضی کے اوپر جو امید کی کام بخشیوں سے خوش نصیب قوموں کے لیے عیش مراد کا ایک چمن زار نشاط ہے' وہ بدنصیب قومیں بستی ہیں جن کے دامن حیات میں امید و یاس کی بخشش کے وقت امید کے پھولوں کی جگہ صرف نا امیدی کے کانٹے ہی آتے ہیں جو خزاں کے افسردہ کن موسم کی طرح دنیا میں صرف اس لیے زندہ رہتے ہیں کہ بہار گزشتہ پر ماتم کریں اور خزاں کے جھونکوں سے اپنے درخت امید کی پت جھڑ دیکھ دیکھ کر آنسو بہائیں' وہ دنیا جو اوروں کے لیے اپنی ہر صدا میں پیغام امید رکھتی ہو' ان کے لیے یکسر ماتم کدہ یاس بن جاتی ہے۔ دل جب مایوس ہو تو دنیا کی ہر چیز میں مایوسی ہے۔ ان کے دلوں میں امید کا چراغ بجھ جاتا ہے تو دل کے باہر بھی کہیں روشنی نظر نہیں آتی۔ دنیا کے وہ وسیع صحرا جن پر قدرت نے طرح طرح کی نباتاتی نعمتوں کا دستر خوان چن دیا ہے' وہ خوش نما اور عظیم الشان آبادیاں جن کو انسانی اجتماع اور مدنی نعمتوں نے زمین کے عیش و نشاط کا بہشت بنا دیا ہے' وہ عظیم الشان اور بے کنار سمندر جن پر حکمرانی کی طاقت حاصل کرنے کے بعد پھر خشکی کے ٹکڑوں پر حکمرانی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ غرضیکہ اس زمین اور زمین پر نظر آنے والی تمام چیزیں ان سے اس طرح منہ پھیر لیتی ہیں گویا وہ اس زمین کے فرزند ہی نہیں ہیں بلکہ بڑی بڑی آبادیاں قوموں اور جماعتوں کی فاتحانہ امنگوں کا جولانگاہ ہوتی ہے تو ان بدنصیبوں کے لیے صحراؤں کے بھٹ اور پہاڑوں کے غاروں میں بھی کوئی گوشہ عافیت نہیں ہوتا۔

صحراؤں کی فضائیت' ہوا کی سنسناہٹ اور دریاؤں کی صدائے روانی اوروں کے لیے پیام امید ہوتی ہے۔ مگر ان کے کانوں میں ان سب سے نامرادی وفنا کی صدائیں اٹھ اٹھ کر طعنہ زن ہوتی رہتی ہیں۔ دنیا میں اگر بہار و خزاں' امید یاس' شادی و غم' نغمہ و نوحہ' خندہ و گریہ اور فنا و بقا دو ہی چیزیں ہیں جن کی زمین کے بسنے والوں کو بخشش ہوئی ہے۔ تو مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ پہلی قوموں کو بہار و امید اور شادی و نشاط کا حصہ ملا ہے۔ اور دوسروں کو یکسر یاس و حزن نوحہ و ماتم اور گریہ و فغاں کا۔

......☆......

حیات امید و موت قنوط

منجملہ اس حالت کے سب سے زیادہ خطرناک گمراہی انسان کی وہ مایوسی ہے جو مصائب و آلام کا ہجوم دیکھ کر اپنے دل میں پیدا کر لیتا ہے اور اس طرح خود اپنے ہاتھوں اپنے مستقبل کے لیے

نامرادی وناکامی کی بنیاد رکھ دیتا ہے۔

مایوسی سے بڑھ کر کوئی شے انسانیت کے لیے قاتل ومہلک نہیں اور دنیا کی تمام کامرانیاں صرف امید کے قیام پر موقوف ہیں۔ یہ امید ہی ہے جس نے زمینوں پر قبضہ کیا' پہاڑوں کے اندر سے راستہ پیدا کیا' سمندر کی قہاری کو مغلوب کیا ہے اور جب چاہا ہے اس میں اپنی سواری کے مرکب چلائے ہیں اور جب چاہا اس کے کناروں کو میلوں اور فرسخوں تک خشک کر دیا ہے۔ پھر امید ہی ہے جس نے مردہ قلوب کو زندہ کیا ہے بستر مرگ سے بیماروں کو اٹھایا ہے ڈوبتوں کو کناروں تک پہنچایا ہے۔ بچوں کو جوانی کی سی تیزی سے دوڑایا ہے اور بوڑھوں کو جوانوں سے زیادہ قوی وطاقتور بنا دیا ہے ۔ جب کہ قومیں جواب دے دیتی ہیں' جب کہ زمانہ منہ پھیر لیتا ہے' جب کہ زمین کے کسی گوشہ سے صدائے ہمت نہیں آتی اور جب کہ تمام اعضائے عمل جواب دے دیتے ہیں تو امید ہی فرشتہ ہوتا ہے جو مسکراتا ہوا آتا ہے' اپنے پروں کو کھولتا ہے اور اس کے سایہ میں لے کر قوت وطاقت' ہمت و مستعدی وچستی وچالاکی کی ایک روح تازہ دلوں میں پیدا کر دیتا ہے۔

دنیا کی کامیابی اعمال کا نتیجہ ہے اور اعمال کے لیے پہلی چیز امید ہے۔ جب تک انسان کے اندر امید قائم ہے' مصیبتوں اور ہلاکتوں کے عفریت بھی سامنے آ کھڑے ہوں تو بھی اس کو شکست نہیں دے سکتے۔

دنیا ایک میدانِ کارزار ہے اور جس چیز کو تم عمل کہتے ہو۔ دراصل یہ ایک حریفانہ کش مکش اور مقابلہ ہے۔ پس جس طرح جنگ میں رہنے والے سپاہیوں کو فتح وشکست سے چارہ نہیں وہ کبھی زخمی کرتے ہیں اور کبھی خود زخمی ہوتے ہیں۔ اسی طرح دنیا میں بھی جو مخلوق بستی ہے اسے کامیابی اور ناکامی اور فیروزمندی ونامرادی سے چارہ نہیں۔ کیا ضرور ہے کہ ہمیشہ ہماری تلوار اور دشمن کی گردن ہو کیوں نہ ہم اپنے سروسینے میں بھی زخم کے نشان پائیں۔ بستر پر آرام کرنے والوں کو رونا چاہئے کہ پاؤں میں کانٹا چبھ گیا۔ لیکن سپاہی کو زخموں پر زخم کھا کر بھی اف نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس کی جگہ تو بستر نہیں' بلکہ میدانِ جنگ ہے۔ شکست وزخم کا خوف ہے تو میدانِ جنگ میں قدم ہی نہ رکھو اور تلواروں سے بچنا چاہتے ہو تو تمہارے لیے بہترین جگہ پھولوں کی سیج ہے۔ چلو گے ٹھوکر کھاؤ گے اور لڑو گے تو زخم سے چارہ نہیں۔ پس اگر ٹھوکر لگی ہے تو آنکھیں کھولو اور بیٹھ کر رونے کی جگہ تیزی سے

چلو کیوں کہ جتنی دیر بیٹھ کر تم نے اپنا گھٹنا سہلایا' اتنی دیر میں قافلہ اور دور نکل گیا۔

پھر اگر دشمن کی کاٹ نے زخمی کیا ہے تو بھاگتے کیوں ہو۔ مایوسی خودکشی ہے اور امید زندگی' زیادہ چابک دستی سے پیکارِ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ کیونکہ جب تک دوسروں کو زخمی کرتے تھے زیادہ ہمت مطلوب نہ تھی لیکن زخم کھا کر تم نے معلوم کر لیا کہ دشمن توقع سے زیادہ قوی ہے اور اب پہلے سے زیادہ ہمت اور مستعدی مطلوب ہے۔

......☆......

''تذکرہ'' سے چند اقتباسات

ہمیشہ داعیانِ حق کا سب سے بڑا جرم شاہانِ ظلم و جور اور علمائے دجل و فساد کی نظروں میں یہی رہا ہے کہ دنیا ان کی طرف کیوں کھنچتی ہے؟ مگر افسوس کہ اس جرم سے وہ کسی طرح اپنے تئیں بری نہیں دکھلا سکتے۔ جس طرح بینائی رکھنے والا دیکھنے پر مجبور ہے کہ خود اپنی آنکھیں پھوڑ نہیں سکتا' اُسی طرح علمائے حق اعلان و تذکیرِ حق میں ناچار ہیں کہ خدا کی دی ہوئی زبان کو کاٹ کر پھینک نہیں دے سکتے' اور بیانِ حق کا قدرتی خاصہ یہ ہے کہ دلوں میں گھر کر لے اور ہر طرف سے انسانوں کو اپنی جانب کھینچ لے۔ ایک داعیِ حق اور واصل باللہ اگر دنیا سے کہہ بھی دے کہ میرے پیچھے نہ آؤ' جب بھی وہ اسی کے پیچھے دوڑے گی کہ جذب و انجذاب کا قانونِ الٰہی باطل نہیں ہو سکتا۔ پھر اگر لوہا مقناطیس کی جانب کھنچتا ہے' تو اس میں مقناطیس کا کیا قصور؟ یہ جرم ہے تو خدا نہ کرے اس پاک جرم کے مجرموں سے کبھی اس کی زمین خالی ہو۔

نظامِ شمسی کی طرح نظامِ انسانی کے بھی مرکز و محور ہیں' مگر تم کو اُن کا حال نہیں معلوم! تم کو اجرامِ سماویہ کا مرکز معلوم کرنے میں جب ہزاروں برس لگ گئے' تو نہیں معلوم' عالمِ انسانیت کے نظام و مراکز کے کشف کے لیے کتنا زمانہ درکار ہو گا! تاہم یہ معلوم رہے کہ ہر عہد و دور میں خدا کے چند بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا وجود ستاروں کے مرکزِ شمسی کی طرح تمام انسانوں کا مرکزِ محبت اور کعبۂ انجذاب ہوتا ہے اور جس طرح نظامِ شمسی کا ہر متحرک ستارہ صرف اسی لیے ہے کہ کعبۂ شمس کا طواف کرے' اسی طرح انسانوں کے گروہ اور آبادیوں کے ہجوم بھی صرف اسی لیے ہوتے ہیں کہ اس مرکزِ انسانیت اور کعبۂ ہدایت کا طواف کریں۔ زمین والوں ہی پر موقوف نہیں' آسمانوں میں بھی

صرف انہی کے ناموں کی پکار ہوتی ہے۔ بخاری کی اس حدیث کو نہیں معلوم تم نے کیا سمجھا' حالانکہ وہ تو صرف اسی حقیقت کی طرف ایک اشارہ ہے کہ **اذا احب الله العبد قال لجبریل انی احب فلانا فاحبه ' فیحبه جبریل** '(الخ) (تذکرہ)

.......☆.......

بدایونی لکھتے ہیں کہ اگر چہ ملا عبدالنبی صدر اور مخدوم الملک دونوں ایک ہی تنور کے سوختہ تھے اور صلحائے امت واہل اللہ کی اذیت ومخالفت میں ہم رنگ وآہنگ' لیکن چونکہ دنیا کے عشق نے دونوں میں رقابت کا رشتہ قائم کر دیا تھا' اس لیے خود بھی ہمیشہ لڑتے جھگڑتے رہتے اور آپس کی ٹکریں برابر چلتی رہتیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان آپس کی ٹکروں ہی سے دونوں پاش پاش ہو گئے۔ **اذا تعارضاتسا قطا** کسی دوسرے ہاتھ کی ضرورت ہی نہ ہوئی۔ **یخربون بیوتھم بایدیھم** کا منظر نظروں میں پھر گیا۔ اور یہ اس گروہ کا اولین اور لاینفک خاصہ ہے۔ سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جائیں گے' لیکن علمائے دنیا پرست کبھی ایک جا اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ کتوں کا مجمع ویسے تو خاموش رہتا ہے لیکن ادھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور ادھر اُن کے پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہو گئے۔ یہی حال ان سگانِ دنیا کا ہے۔ ساری باتوں میں متفق ہو جا سکتے ہیں لیکن دنیا کی ہڈی جہاں سڑ رہی ہو' وہاں پہنچ کر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ انکا سرمایۂ نازعلمِ حق نہیں ہے جو تفرقہ مٹاتا اور اتباعِ سبلِ متفرقہ کی جگہ ایک ہی صراطِ مستقیم پر چلاتا ہے۔ بلکہ یکسر علم جدل وخلاف ہے۔ نفس پرستی اُس کی کثافت کو خمیر دیتی' اور دنیا طلبی کی آگ اُس کی ناپاکی کے بخارات کو اور زیادہ تیز کرتی رہتی ہے۔ فساق وفجار خرابات میں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کی تندرستی کا جامِ صحت پیتے ہیں' اور چور اور ڈاکو مِل جُل کر رہزنی کرتے ہیں' مگر یہ گروہ خدا کی مسجد اور زہد وعبادت کے صومعہ وخانقاہ میں بیٹھ کر بھی متحد و یک دل نہیں ہو سکتا اور ہمیشہ ایک دوسرے کو درندوں کی طرح چیرتا پھاڑتا اور پنجہ مارتا رہتا ہے۔ میکدوں میں محبت کے ترانے اور پیار اور الفت کی باتیں سننے میں آ جاتی ہیں' مگر عین محرابِ مسجد کے نیچے پیشوائی وامامت کے لیے ان میں سے ہر ہاتھ دوسرے کی گردن پر بڑھتا اور خونخواری کی ہر آنکھ دوسرے بھائی کے خون پر لگی ہوتی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے احبارِ یہود سے فرمایا تھا ''تم نے داؤد کے گھر کو ڈاکوؤں کا بھٹ بنا دیا ہے'' ڈاکوؤں کے بھٹ کا حال تو نہیں

معلوم لیکن ہم نے مسجدوں کے صحن میں بھیڑیوں کو ایک دوسرے پر غرّاتے اور خون آشام دانت مارتے دیکھا ہے۔ بدایونی لکھتے ہیں کہ مخدوم الملک نے جب ملّا عبدالنبی کو برسرِ عروج وصدارت دیکھا، تو ان کے رد میں ایک پوری کتاب لکھ ماری۔ اور ثابت کیا کہ ان کے پیچھے نماز ہی درست نہیں، تا بصدارت وشیخ الاسلامی چہ رسد؟ باپ نے عاق کر دیا ہے، اور مزید برآں یہ کہ بواسیر خونی کا عارضہ ہے! خیر، پہلی دلیل تو جیسی کچھ ہے ظاہر ہے لیکن دوسری دلیل بڑی ہی دلچسپ اور پر لطف رہی۔ یارانِ ظرافت پیشہ اس کو لے اڑے اور خوب خوب ستم ظریفیاں کی گئیں۔ اسی طرح یہ دونوں ایک دوسرے پر حملہ کرتے رہتے، اور اسی میں دونوں کی چوریاں کھلتیں اور پردے فاش ہوتے گئے۔ (تذکرہ)

......☆......

امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی تمام عمر میں اگر پاک سے پاک اور سچی سے سچی نماز پڑھی تھی، تو یقیناً وہ وہی ظہر کی نماز تھی۔ ان کی تمام عمر کی وہ نمازیں ایک طرف جو دجلہ کے پانی سے پاک کی گئیں تھیں، اور وہ چند گھڑیوں کی عبادت ایک طرف جس کو راہِ ثباتِ حق میں بہنے والے خون نے مقدس و مطہر کر دیا تھا! سبحان اللہ! جس کے عشق میں چار چار بوجھل بیڑیاں پاؤں میں پہن لی تھیں، جسؐ کی خاطر سارا جسم زخموں سے چور اور خون سے رنگین ہو رہا تھا، اسی کے آگے جبینِ نیاز جھکی ہوئی! اسی کے ذکر میں قلب ولسان لذت یابِ تسبیح وتحمید! اسی کے جلوۂ جمال میں چشمِ شوق وقفِ نظارہ ودید! اور اُسی کی یاد میں روحِ مضطر محو وسرشارِ عشق وخود فراموشی!

یوں عبادت ہو تو زاہد ہیں عبادت کے مزے

اور یہ جو امامِ موصوف نے افطار سے انکار کر دیا اور نماز کا وقت آیا تو بہ اول وقت و بجماعت ادا کرنے سے باز نہ آئے، حالانکہ جسم زخموں سے چُور اور پیٹھ کا خون پاؤں تک بہہ رہا تھا، تو اب بتلاؤ کہ وہ تمہارا رخصت والا معاملہ کیا ہوا؟ کیا ایسی حالت میں رخصت نہ تھی۔ کہ روزہ کھول دیتے اور نماز کے لئے اس قدر توقف کر جاتے کہ زخموں پر مرہم تو لگا دیا جاتا؟ اور اگر تم اس عالم میں ہو کہ امن وفراغت اور طاقت وفرصت کی حالت میں بھی مصائب وخطرات سے بچنے کیلئے دعوت الی الحق کو ترک وملتوی اور عزم وثباتِ حق سے انحراف کیا جا سکتا ہے، اور تمہارے نزدیک مصلحت و

رخصت اسی میں ہے کہ بطلان وضلالت کے آگے سر جھکا دیا جائے' تو خدارا بتلاؤ کہ یہ عالم کونسا تھا! کبھی اِس عالم کی بھی کوئی خبر تم تک پہنچی ہے؟

یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہِ کیست؟

افسوس! حیلہ جوئی و بہانہ سازی کا نام تمہاری بولی میں رخصت ہے' اور ہمت کی موت اور ایمان کی جان کنی کو تمہاری بستی میں مصلحت بینی اور دانشمندی کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ تم کو اِس عالم کی کیا خبر؟ اقلیمِ عزائم اور ہمت آبادِ عشق کے معاملات تمہارے وہم وگمان سے بھی بالاتر ہیں۔ تمہارے لیے یہی بہت ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنے ایمان کی بچی بچائی اور بچی کھچی پونجی بچا لے جاؤ اگرچہ اس کی بھی امید نہیں۔

تو اے گردِ توہم! شوکتِ دریا چہ میدانی؟
اسیرِ عذرِ لنگی' وسعتِ صحرا چہ میدانی؟

(تذکرہ)

☆

بڑوں بڑوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سروسامان واسباب کار فراہم نہیں۔ لیکن وقت کا عازم وفاتح اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وقت ساتھ نہیں دیتا' تو میں اس کو ساتھ لوں گا' اگر سروسامان نہیں تو اپنے ہاتھوں سے تیار کرلوں گا۔ اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اترنا چاہیے۔ اگر آدمی نہیں ملتے' تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیے۔ اگر انسانوں کی زبانیں گونگی ہوگئی ہیں' تو پتھروں کو چیخنا چاہیے۔ اگر ساتھ چلنے والے نہیں' تو کیا مضائقہ! درختوں کو دوڑنا چاہیے۔ اگر دشمن بیشمار ہیں' تو آسمان کی بجلیوں کی بھی کوئی گنتی نہیں۔ اگر رکاوٹیں اور مشکلیں بہت ہیں' تو پہاڑوں اور طوفانوں کو کیا ہوگیا کہ راہ صاف نہیں کرتے؟ وہ زمانہ کا مخلوق نہیں ہوتا کہ زمانہ اس سے اپنی چاکرائی کرائے۔ وہ وقت کا خالق اور عہد کا پالنے والا ہوتا ہے' اور زمانے کے حکموں پر نہیں چلتا' بلکہ زمانہ آتا ہے' تا اُس کی جنبشِ لب کا انتظار کرے۔ وہ دنیا پر اس لیے نظر نہیں ڈالتا کہ کیا کیا ہے' جس سے دامن بھرلوں! وہ یہ دیکھنے کے لیے آتا ہے کہ کیا کیا نہیں ہے' جس کو پورا کردوں۔ اُس کا ملیۂ خمیر بخشش ونوال ہے' طلب وسوال نہیں۔ اُس کی نظریں طاق کی بلندی نہیں ناپتیں' ہمیشہ اپنے ہاتھ کی

رسائی اور قد کی بلندی دیکھتی رہتی ہیں۔ اُس کا فغانِ عجز و نا امیدی یہ نہیں ہوتا:

کمند کوتہ و بازوئے سست و بامِ بلند

بمن حوالہ و نو میدیم گنہ گیرند

ستاروں سے تمام فضائے سمائی بھری پڑی ہے' لیکن دُمدار ستارے ہمیشہ طلوع نہیں ہوتے' یہی حال اصحابِ عزائم کا بھی ہے۔ وہ کائناتِ ہستی کا ایک بالکل الگ گوشہ ہے اور وہاں کے احکام و قوانین کو دنیا کے اعمالِ عادیہ پر قیاس کرنا غلطی ہے۔ اُن کی قوتیں الٰہی' اُن کے وسائل غیر مختم' ان کی ترقیاں لازوال' اور اُن کے تمام طریقے غیر مختم ہوتے ہیں۔ اللہ کی حکمت و ربوبیت اُن کو تمام خلق اللہ میں چُن لیتی اور بحکمِ واللہ یختص برحمته من یشاء اپنی رحمتوں اور ربوبیتوں کے عجائب و خوارق اُن کے لئے مخصوص کر دیتی ہے۔ پھر اُن کے معاملات میں نہ تو کسی دوسرے کا ساجھا ہوتا ہے' نہ کسی مدّعی کی وہاں تک رسائی۔

اولئک قوم لما دعوا اجیبوا' ولما اجیبوا احبوا' ولما احبوا اخلصوا' ولما اخلصوا استخلصوا' صدقت منهم الضمائر' فصفت منهم السرائر' وصاروا صفوة الله فی ارضه' ففاضت علیهم انواره' وامتلاءت قلوبهم من اسراره.

(''تذکرہ'' سے ماخوذ)

......☆......

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا مقام و مرتبہ

بلا تکلف مگر خیر خواہانہ عرض کرتا ہوں کہ روافض کی چیرہ دستیوں کے ردّ عمل کے طور پر ہمارے بہت سے نوجوان حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے نقائص و عیوب تلاش کرنے لگے ہیں' اور چونکہ علمی اشکالات تو ہر جگہ پیش آتے ہیں' اس لئے جس طرح روافض حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے بارے میں کچھ نہ کچھ تلاش کرتے رہتے ہیں' اسی طرح ہمارا یہ نوجوان طبقہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ ڈھونڈتا رہتا ہے' اور چونکہ دل میں کدورت و نفرت کی گرہ بیٹھ گئی ہے' اس لئے انہیں ان اشکالات کے علمی جوابات سے بھی شفا نہیں ہوتی...... حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ باتفاقِ اہلسنت خلیفۂ راشد ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کے بے شمار

فضائل بیان فرمائے ہیں۔ علاوہ ازیں خود حضرات شیخین رضی اللہ عنہما نے مدۃ العمر ان سے محبت و اکرام کا برتاؤ کیا ہے۔ گویا ہمارے جوشیلے نوجوان رفض کے ردِّ عمل کے طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جو نقائص چن چن کر جمع کرتے ہیں وہ نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک لائق توجہ تھے، نہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی نظر میں، اور نہ اکابر اہلسنت کی نظر میں۔ اب ان اشکالات کے حل کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان مزعومہ نقائص کا ایک ایک کر کے جواب دیا جائے۔ یہ طریقہ طویل بھی ہے اور شفا بخش بھی نہیں۔ کیونکہ فطری بات ہے کہ جس شخص سے نفرت وعداوت کی گرہ بیٹھ جائے اس کی طرف سے خواہ کتنی ہی صفائی پیش کی جائے، تکدر نہیں جاتا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرات شیخین رضی اللہ عنہما اور اکابر اہلسنت رحمہم اللہ پر اعتماد کر کے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنا محبوب ومطاع سمجھا جائے، اور ان کے بارے میں جو اشکالات پیش آئیں انہیں اپنی فہم کا قصور سمجھا جائے، بلکہ ان اشکالات پر حتی الوسع توجہ ہی نہ کی جائے۔ اس ناکارہ کے نزدیک یہی آخر الذکر طریق پسندیدہ اور اسلم ہے۔ ان دونوں صورتوں کی مثال ایسی ہے کہ گھر کے صحن میں خس وخاشاک پڑے ہوں اور آدمی ان سے گھر کی صفائی کرنا چاہتا ہو تو ایک صورت تو یہ ہے کہ ایک ایک تنکے کو اٹھا کر باہر پھینکے۔ ظاہر ہے اس میں وقت بھی زیادہ صرف ہوگا مگر پوری صفائی پھر بھی نہیں ہوگی۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ جھاڑو لے کر تمام صحن کو صاف کر دے۔ اس میں وقت بھی زیادہ نہیں لگے گا اور صفائی بھی دیدہ زیب ہو جائے گی۔ پس میرے نزدیک مؤخر الذکر طریق ہی ایسی جھاڑو ہے جس سے شکوک وشبہات کے تمام خس وخاشاک سے سینۂ مومن کو پاک وصاف کیا جا سکتا ہے۔ یہ روایات جن کی بنیاد پر اشکالات کئے جا رہے ہیں ہمارے اکابر اہلسنت کی نظروں سے اوجھل نہیں تھیں۔ لیکن ان کے سینۂ بے کینہ میں حضرت علی یا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کی جانب سے کبھی میل نہیں آیا، اور نہ کسی نے ان بزرگوں پر زبان طعن کھولی، جی چاہتا ہے کہ ہم آپ بھی بس یہی طریق اپنائیں۔

اسی ضمن میں ایک اور ضروری گذارش کرنے کو بھی جی چاہتا ہے۔ وہ یہ کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کو جو زمانہ ملا وہ احادیث طیبہ کی اصطلاح میں ''فتنہ کا دور'' کہلاتا ہے۔ اور ''فتنہ'' کی تعریف ہی یہ ہے کہ اس میں صورت حال مشتبہ ہو جاتی ہے اور کسی ایک جانب فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہی اشکال پیش آیا۔ کچھ حضرات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے' کچھ ان کے مقابل' کچھ غیر جانبدار' اپنے فہم و اجتہاد کے مطابق جس فریق نے جس پہلو کو راجح اور اقرب الی الصواب سمجھا اسے اختیار فرمایا اور ہر فریق عنداللہ ماجور ٹھہرا' کیونکہ ان میں سے ہر شخص عنداللہ اپنے اجتہاد پر عمل کرنے کا مکلّف تھا اور ہر ایک رضائے الٰہی میں کوشاں تھا۔ جب فتنہ کا یہ غبار بیٹھ گیا تو اکابر اہلسنت نے اس فتنہ کی تفصیلات میں غور و فکر اور کرید کرنے کو پسند نہیں فرمایا' بلکہ ایک مختصر سا فیصلہ محفوظ کر دیا کہ اس دور میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ خلیفۂ راشد تھے اور وہ حق پر تھے۔ باقی حضرات اپنے اپنے اجتہاد کی بناء پر معذور و ماجور ہیں...... اب ہمارے نوجوان نئے سرے سے اس دور کی تفصیلات کو کھنگال کر ان اکابر کے بارے میں "بے لاگ فیصلے" فرمانے بیٹھے ہیں۔ خود ہی انصاف کیجئے کہ جن اکابر کے سر سے یہ سارے واقعات گزرے جب وہی اس میں چکرا گئے تھے' اور ان کو صورتحال کا تجزیہ کر کے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا تو آج چودہ صدیوں کے بعد میں اور آپ' کتابیں پڑھ پڑھ کر فیصلے کرنے بیٹھ جائیں تو کیا کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

(اختلاف امت اور صراط مستقیم۔ مولانا یوسف لدھیانوی شہیدؒ)

مولانا عبدالشکور دین پوریؒ کے چند تقریری اقتباسات

شانِ محبوبِ خدا

میرا اور میرے علماء کا عقیدہ ہے کہ خدا ایک ترازو بنائے' ایک پلڑے میں میرے دلبر کو بٹھائے' ایک پلڑے میں سجاد' عُباد' زُھاد' اقطاب' اخیار' ابدال' علماء' صلحا' اتقیاء' اصفیاء' اولیاء' جن و ملک' حور و فلک' چودہ طبق' عرش و کرسی' لوح و قلم' جنت' کعبہ رکھ دے۔ ایک طرف محمد ﷺ کو بٹھا دے' ترازو کو اٹھا دے' دین پور کے علماء کا عقیدہ ہے کہ ساری کائنات کی شان کم ہے اور محمد ﷺ کی شان بلند ہے۔

آپ میرے پاس آئیں گے یا میں آؤں؟

ہمارا نبی گنبدِ خضریٰ میں ہے۔ میں نے آقا سے پوچھا آپ یہاں لاہور میں آ جائیں گے

فرمایا:

"اَلْمَدِیْنَةُ مُهَاجِرِیْ وَفِیْهَا مَضْجَعِیْ وَمِنْهَا مَبْعَثِیْ"

میں نے مدینے میں ہجرت کی اور قیامت تک مدینے میں رہوں گا

میں نے کہا حضرت میں آؤں یا آپ آئیں گے؟ فرمایا......

"مَنْ حَجَّ الْبَیْتَ وَلَمْ یَزُرْ ...... الخ"

جو حج پر آئے اور میرے در پر نہ آئے بڑا ظالم ہے۔

میں نے پوچھا حضرت آپ آئیں گے یا میں آؤں گا؟ فرمایا......

"مَنْ زَارَ قَبْرِیْ وَجَبَتْ لَهٗ شَفَاعَتِیْ"

جو میرے مزار کو آ کر دیکھے گا میں اسے جنت کی ٹکٹ دے دوں گا۔

حضرت! آپ ہماری مسجد میں نماز پڑھانے آئیں گے یا ہم آئیں؟ فرمایا......

"صَلٰوةٌ فِیْ مَسْجِدِیْ هٰذَا خَیْرٌ مِّنْ خَمْسِیْنَ اَلْفِ صَلٰوةٍ وَفِیْمَا سِوَاهُ"

میں نے پوچھا حضرت ﷺ! آپ آئیں گے یا میں آؤں گا؟ فرمایا......

"مَنْ دُفِنَ فِیْ مَدِیْنَتِیْ فَهُوَ مِنْ جَوَارِیْ"

"جو شخص میرے مدینہ میں آ کر دفن ہو جائے وہ قیامت تک میرا پڑوسی ہے۔"

دودھ خراب ہو گیا تو کتے پئیں گے

عطاء اللہ شاہ بخاریؒ فرماتے ہیں' میں نے ایک شخص سے کہا' تیری بیٹی اتنی بڑی ہے شادی کر۔ کہنے لگا ابھی دودھ کی بو آتی ہے۔ بخاری مرحوم نے کہا اگر دودھ خراب ہو گیا تو بندے نہیں پئیں گے' پھر کتے پئیں گے۔ سمجھ لینا میں کچھ کہہ گیا ہوں۔ یہ آج کل عام بیماری ہے اس طرف توجہ نہیں ہوتی۔ تمہاری بیٹیاں بتول سے زیادہ پاک دامن ہیں؟ بی بی بتول تقریباً ۱۹ سال کی تھیں۔ بی بی فرماتی ہیں میں آٹا گوندھ رہی تھی کہ ابا آ گئے۔ فرمایا بیٹی آٹے کو چھوڑ دو اور کپڑے بدل کر ہاتھ دھو کر اندر بیٹھ جاؤ۔ ابوبکر کی بیوی آئے گی اور تجھے سنوارے گی۔ آج خدیجہ ہوتی تو تیری شادی کا مزہ کچھ اور ہی ہوتا۔ افسوس کہ میری بیٹی یتیم ہو کر جا رہی ہے۔ آنسو آ گئے خدیجہ یاد آ گئی۔ بی بی نے کہا' حضرت تنور تیار ہے' آٹا مل رہی ہوں' آپ میرے ہاتھ کی روٹی پسند کرتے ہیں' اس کا انتظام میں کر رہی ہوں۔

فرمایا بیٹی آج روٹی کھالوں تو امت سالوں دیر کرے گی۔ محمدؐ روٹی اس وقت کھائے گا جب خدا کا حکم ہو گا۔ جاگ رہے ہو؟ میں اسی نبی کا تذکرہ کر رہا ہوں جس کی اس ماہِ مبارک میں آمد ہوئی۔

''شیما'' دربارِ رسالت میں

وہ دیکھو کہ ایک برقعہ پوش آ رہی ہے۔ حضورؐ پاک کھڑے ہو جاتے ہیں' کسی نے کہا حضرت یہ کون ہے؟ اس کے کپڑے میلے ہیں اور آپ کھڑے ہو گئے ہیں۔ جب وہ قریب آئی تو نبی کریمؐ نے اپنا کندھا دیا' اس نے اپنا ہاتھ رکھا۔ وہ بیٹھنے لگی' تو نبیؐ نے اپنی چادر بچھادی۔ اس کے لبوں تک کان لے گئے۔ اس نے کہا' العطش۔ پیاس۔ ایک صحابی اٹھا۔ فرمایا بیٹھ جا میں (محمدؐ) خود خدمت کروں گا۔ دودھ لائے۔ کہنے لگی حضرت بس ملنا تھا میں جا رہی ہوں۔ دوڑ کر حضور گھر سے کھجوروں کی گٹھڑی لائے۔ خود کندھے پر اٹھائی۔ صحابہ کہنے لگے ہم اٹھائیں گے فرمایا نہیں میں مصطفیٰ خود حق ادا کروں گا۔ سنو مولویو' پیرو' آج دین سنو۔ حضورؐ نے فرمایا یہ میری اماں ہے۔ خدا کی قسم میں آپ کو تڑپانا چاہتا ہوں۔ وقت تھوڑا ہے' میں کیا تقریر کروں۔ صرف ولادت بیان کروں تو کئی گھنٹے چاہئیں۔ رات ڈھائی گھنٹے تو ایک جملے پر کھڑا رہا' اسی پر اڑا رہا' منبر پر چڑھا رہا۔ مجمع بھی سمجھدار تھا' ہوشیار تھا' بے دار تھا' خبردار تھا' آخر کراچی کا بازار تھا۔ تو عزیزانِ من توجہ فرمائیں' میں کچھ دین کی باتیں سنا رہا ہوں۔

حضور کو اطلاع ملی کہ حضرت ہم نے فلاں بستی کا محاصرہ کیا۔ وہاں ایک عورت میلے کپڑوں والی باہر نکل آئی۔ کہنے لگی تم مجھے لونڈی بناؤ گے' گرفتار کرو گے پتہ ہے میں کون ہوں؟ میرا نام شیما ہے۔ میں محمدؐ کی بہن ہوں۔ ایسے کہتی ہے اور کہتی ہے جاؤ میرے بھائی کو کہو کہ تیری بہن آج گرفتار ہو رہی ہے۔ پتہ ہے میں کون ہوں؟ یہ جو مصطفیٰ ہیں میں ان کے نیچے اپنا دوپٹہ بچھا دیتی تھی۔ جب یہ سو جاتے تھے' تو میں پنکھا ہلاتی تھی۔ محمدؐ کو پیاس لگتی تھی تو میں دو دو میل سے پانی بھر کر لاتی تھی۔ میں بچپن میں ان کے ساتھ رہی' آج اس کی جماعت مجھے گرفتار کرتی ہے۔ کہتے ہیں جب حضورؐ کو اطلاع ملی کہ ایک عورت اس طرح کہتی ہے اور آ رہی ہے تو پیغمبر کی چادر گر پڑی۔ کھڑے ہو گئے۔ رو کر فرمایا' دوڑ کر جاؤ میری بہن کو تکلیف نہ پہنچے۔ جو کچھ کہتی ہے صحیح ہے۔ جس کو شیما کہے اس کو بھی رہا کر دو۔ بڑے اعزاز سے لاؤ' اس سے کہو جلدی آؤ' بھائی تیرے انتظار میں ہے۔ رو کر کہا

لوگو یہ تو میرا محسن گھرانہ ہے۔ میں محمدؐ ان کا احسان نہیں اتار سکتا۔ صحابہؓ کہتے ہیں ہم رو رہے تھے، حضورؐ بھی رو رہے تھے۔ فرمایا مجھے وقت یاد ہے جب یہ اپنا دوپٹہ بچھا کر خود جاگتی تھی اور مجھے سلاتی تھی۔ صحابہؓ کہتے ہیں کہ جب وہ قریب آئی تو حضورؐ نے استقبال فرمایا اور فرمایا شیما مجھے وہ تیری مہربانیاں یاد ہیں۔ اپنی چادر بچھا کر فرمایا، جوتی سمیت محمدؐ کی چادر پر بیٹھو۔ یہ ہمیں دین ملا ہے۔ آج کل تو بہن کو جوتے مار رہے ہیں۔ ماں کے بال نوچ جا رہے ہیں۔

......☆......

دوستو! میں اسی پیغمبر کی شان بیان کر رہا ہوں جس کی آمد سے ہمیں یہ نعمت ملی۔ ہم تو درندے تھے کب بندے تھے، گندے تھے، اندھے تھے، مصطفیٰ تجھ پر درود کہ تو نے ہمیں راہِ ہدایت دی۔ کوئی مولوی بن گیا، کوی عالم بن گیا، آج جو بھی ہمیں مل رہا ہے مصطفیٰ کی جوتی کے صدقے مل رہا ہے۔ میں تو آج علماء کے سامنے یوں بھی کہوں گا میں اور آپ بندر اور سوٴر ہو جاتے اگر حضورؐ کی دعا نہ ہوتی۔

جب حضورؐ نے داؤدؑ اور موسیٰ علیہ السلام کی امت کا حال پڑھا تو فوری کہا **اللھم لا تجعل فی امتی مسخا ولا خسفا**۔ میری امت کی شکلیں نہ بدلنا، زمین میں غرق نہ کرنا، ان کے گناہوں کو نہ دیکھنا محمدؐ کی روتی ہوئی دعاؤں کو دیکھنا۔ میں تو علماء کے سامنے یوں کہوں گا کہ قہر تیاری کرتا ہے، نبیؐ کی دعا جا کر پہرہ دیتی ہے۔ کہتی ہے، کہ قہر واپس چلا جا، یہ موسیٰ کی امت نہیں، یہ محمدؐ کی امت ہے۔ ورنہ تمہارے کرتوت...... میری مائیں بیٹھی ہیں ورنہ بتاتا۔ خدا کی قسم میں پاکستان میں ایسی جگہ پہنچا ہوں جہاں باپ بیٹی سے پکڑا گیا، بیٹا سوتیلی ماں سے پکڑا گیا۔

اس زمین پر سانپ اور اژدھے برسنے چاہئیں
برق گرنی چاہئے، پتھر برسنے چاہئیں

ہماری بقا کی وجہ حضورؐ کی دعا ہے۔ آج بھی دعا پہرہ دے رہی ہے۔ **اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون** ۔ کبھی غلاف کو پکڑ کر کھڑے ہیں۔ یا اللہ اگر غصے میں آ کر امت کے لیے بددعا کر بیٹھوں تو دعا کو منظور نہ کرنا۔ میں برباد کرنے نہیں آیا، میں ان کو آباد کرنے آیا ہوں۔

نبیؐ تو ہمیں سب سے اعلیٰ ملا لیکن کوئی اس کی سنت کو کوڑا کرکٹ میں ڈال رہا ہے۔ کوئی

کہتا ہے اس کے یار منافق ہیں۔ کوئی کہتا ہے اس کا قرآن بکری کھا گئی۔ کوئی کہتا ہے احادیث غلط ہیں۔ نبی سے وفاداری اچھی کر رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے مکے مدینے میں دین نہیں رہا۔ کوئی کہتا ہے محمدؐ کے مصلّے والے کافر ہیں۔ شاباش کل نبیؐ کے سامنے سرخرو ہو جاؤ گے؟ دعا کرو اللہ ہم سب کو نبیؐ کی گلیوں کے کتے کے پاؤں کے ذروں سے بھی عقیدت عطا فرمائے۔ (آمین)

......☆......

حضرت بلالؓ کا مقام

مجھے معراج سے یہ موتی ملا محبوب فرماتے ہیں کہ جنت کا منظر مجھے دکھایا گیا وہاں جوتی سمیت مجھے بلال ملایا گیا۔ (سبحان اللہ) میں نے پوچھا یہ کون پھر رہا ہے فرمایا دنیا اس کو کہتی ہے کہ کالا ہے۔ یہ فضلِ حق تعالیٰ ہے یہ تیرا متوالا ہے۔ دیکھو اس کا شان بالا ہے۔ یہ بلال ہے یہ بھی محمدؐ دے نال ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں سرمہ لگائیں' شاندار قسم کا پوڈر لگائیں صبح صبح شیو بنائیں زلفوں کو سجائیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا او بھوریو ابولہب بھورا فی النار ہے۔ بلال کالا ہے' بیڑا پار ہے۔ آج امریکہ کالوں سے نفرت کرتا ہے۔ کالوں کی ٹیکسیوں میں نہیں بیٹھتا۔ کالوں کو قتل کرواتا ہے۔ سیاہ فام' سوڈان' یوگنڈا' افریقہ والوں کا دشمن ہے۔ ان کو ہوٹل میں نہیں ٹھہرنے دیتا۔ میں نے مصطفیٰ کو دیکھا کہ جس صف میں خود کھڑے ہیں کالا بلال ساتھ کھڑا ہے۔ میں نے آقا کو دیکھا۔ معراج سننے والو۔ پہلے دودھ بلال نے پیا اس کا بچا ہوا آمنہ کے لالؐ نے پیا۔ (سبحان اللہ) بلالؓ تیری تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔ میں جرأت سے بات کر رہا ہوں۔ حضور سفر سے آ رہے ہیں بلال نے دیکھا تو دوڑ کر آئے۔ عرض کی محبوب میں آپ کے قدموں میں چلوں گا۔ آقا نے فرمایا بلال! گرمی کا وقت ہے' مدینہ دور ہے' آیئے میرے ساتھ سوار ہو جایئے' ارکب معی میری اونٹنی پر بیٹھ جاؤ۔ بلالؓ نے کہا ادب ملحوظ ہے' عزت محفوظ ہے۔ آپ کی اونٹنی کی دھول میرے لئے نجات بن جائے گی۔ الفاظ سنو! ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں۔ اونٹنی بٹھا دی فرمایا بلال تیری تکلیف میں برداشت نہیں کرتا۔ تو سوار ہوگا تو میں بھی سوار ہو جاؤں گا' تو پیدل چلے گا' تو محمد بھی اپنے غلام کے ساتھ پیدل چلے گا۔ (سبحان اللہ)

......☆......

خصائلِ نبوت

نبی اشارہ کرے' تو چاند دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

نبی اشارہ کرے' بارش شروع ہو جاتی ہے۔

نبی اشارہ کرے تو جلیبیب چمکنے لگتا ہے۔

نبی دعا کرے' تو عمر فاروقؓ کو اسلام مل جاتا ہے' پیغمبر سجدہ کرے تو امت بخشی جاتی ہے۔

نبی سیر کرے' تو معراج بن جاتی ہے۔

نبی گفتگو کرے' تو حدیث بن جاتی ہے۔

جو نبی کے نکاح میں آئے وہ مومنوں کی ماں بن جاتی ہے۔

نبی پیدا ہو تو مکہ مکرمہ بن جاتا ہے۔

نبی ہجرت کرے تو مدینہ منورہ بن جاتا ہے۔

نبیؐ کے جھنڈے کے نیچے آئے' تو غازی بن جاتا ہے...... مسجد میں آئے' تو نمازی بن جاتا ہے...... غلام قرآن پڑھے تو قاری بن جاتا ہے...... میدان میں نکلے تو غازی بن جاتا ہے...... کعبے کا طواف کرے تو حاجی بن جاتا ہے...... کوئی کلمہ پڑھ کر محمدؐ کا چہرہ دیکھے تو قیامت تک محمدؐ کا صحابی بن جاتا ہے۔ (سبحان اللہ)

......☆......

خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے

ایک جملہ کہہ دوں؟ بچہ روئے تو اماں بہلاتی ہے۔ جب محمدؐ کا امتی روئے تو رحمتِ خداوندی بہلاتی ہے۔ (سبحان اللہ) میں نے ایک حدیث پڑھی ہے۔ میرے محبوبؐ فرماتے ہیں کہ جب تنہا بچہ رونے لگے' ادھر اس کی اماں کسی کام میں مصروف ہوتی ہے۔ روٹی پکا رہی ہوتی ہے۔ چکی پیس رہی ہوتی ہے' جھاڑو دے رہی ہوتی ہے' ادھر اندر سویا ہوا بچہ جاگ پڑتا ہے۔ اندر چیخنے لگتا ہے۔ ماں دور ہوتی ہے۔ بچے کی آواز بھی نہیں سن رہی۔ مگر پھر بھی کہتی ہے میری بہن یہ ذرا تم چکی پیسو۔ میری جگہ جھاڑو دو۔ میرا دودھ ابلنے لگا ہے' دودھ بہنے لگا ہے' دودھ میں کچھ اثر پیدا ہو گیا ہے۔ معلوم

ہوتا ہے کہ میرا بچہ جاگ گیا ہے۔ حضور فرماتے ہیں کہ بچہ روئے تو دودھ بے قرار ہوتا ہے' گناہگار رو پڑے تو عرش والے کی رحمت بے قرار ہو جاتی ہے۔

ننھا بچہ رو پڑے تو ماں کا دودھ ابلنے لگتا ہے۔ گناہگار رو پڑے تو اللہ کی رحمت اترنے لگتی ہے۔ (سبحان اللہ)

کبھی اس کے سامنے رو پڑا کرو۔ جو نیکی کر کے بھی خدا کے سامنے روتا ہے وہ ہنستا ہوا جنت میں جائے گا۔

......☆......

قرآن بطور سیرت مصطفیٰ ﷺ

الحمد سے والناس تک پورے قرآن کی سات منزلیں' چودہ سجدے' تیس پارے' ایک سو چودہ سورتیں' پانچ سو اکاون رکوع' چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ آیتیں' ۷۷ مدیں' ۱۲۷۴ شدیں' تین لاکھ اکیس ہزار دو سو پچاس صرف قرآن پاک کے حروف ہی نہیں یہ پیغمبر کی سیرت کے پروف نظر آتے ہیں۔

قرآن میں جہاں اللہ کی ذات وصفات کا تذکرہ ہے وہ آپ ﷺ کے عقائد ہیں۔

قرآن میں جہاں احکام کا تذکرہ ہے وہاں پیغمبر ﷺ کی عملی زندگی ہے۔

قرآن میں جہاں جنت کا تذکرہ ہے وہاں محبوب ﷺ کی رضا ہے۔

قرآن میں جہاں جہنم کا تذکرہ ہے وہ آپ ﷺ کا غصہ ہے۔

قرآن میں جہاں تعلق مع اللہ کا تذکرہ ہے آقا ﷺ کی خلوت کی زندگی ہے۔

قرآن میں جہاں تعلق مع الخلق کا ذکر ہے وہاں محبوب ﷺ کی جلوت کی زندگی ہے۔

یہ قرآن خاموش قرآن ہے' محبوب ﷺ ناطق قرآن ہے۔

ایک علم قرآن' ایک عملِ قرآن' ایک اجمالِ قران' ایک تفصیلِ قرآن' ایک متنِ قرآن' ایک تشریح قرآن' ایک ذکرِ قرآن' ایک مذکر قرآن' ایک تیس پاروں کا قرآن' ایک وہ قرآن جو آج بھی حجرۂ عائشہ میں محو استراحت ہے۔

مرزا بدشکل' بے عقل ہے

ہمارے نبی حسین' مہ جبین' دل نشین' بہترین' بالیقین' نازنین' صادق وامین' میرے رحمۃ اللعالمین' سید الاولین والآخرین' راحت العاشقین' مراد المشتاقین ہیں۔

دوسری طرف مرزا لعین' بے دین' بدترین' جہنم کا شوقین' جس کی موت لیٹرین' مرزا نبی نہیں غبی ہے' ظلی نہیں شیخ چلی ہے۔ بروزی نہیں موذی ہے' یک چشم گل ہے۔ بدشکل ہے بے عقل' نہ اصل ہے نہ نسل ہے۔

......☆......

لوگ کہتے ہیں مرزا قادیانی نبی تھا...... میں کہتا ہوں غبی تھا۔

لوگ کہتے ہیں بروزی تھا...... میں کہتا ہوں موذی تھا۔

لوگ کہتے ہیں رسول تھا...... میں کہتا ہوں فضول تھا۔

لوگ کہتے ہیں ظلی تھا...... میں کہتا ہوں شیخ چلی تھا' انگریز کی بلی تھا......

پاکستان کی زمین بھی عجیب ہے' یہاں بناسپتی گھی بھی مل جاتا ہے' بناسپتی نبی بھی مل جاتا ہے۔

جو حُب دار نہیں اس کا بیڑا پار نہیں

دعا کرو اللہ تعالیٰ ہم سب کو عشق رسول ﷺ عطا فرمائے' ہماری رفتار میں' گفتار میں' کردار میں' افکار میں' لیل ونہار میں' عادات میں' تاثرات میں' جذبات میں' خیالات میں' واقعات میں' دن رات میں' حالات میں' ہر بات میں' افعال میں' اقوال میں' چال میں' خیال میں' ہر حال میں خدا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تابعداری عطا فرمائے۔ میرا عقیدہ ہے کہ جو نبی پاک کا تابعدار ہے وہ گرچہ دعویٰ نہ کرے حُب دار ہے۔ جو حُب دار ہے' اس کا بیڑہ پار ہے۔ جو پیغمبر کا غلام تابعدار نہیں لاکھ دعویٰ کرے وہ حُب دار نہیں' حُب دار نہیں تو بیڑہ پار نہیں' اس جیسا کوئی خوار نہیں۔

صدیقؓ پیغمبر کا رفیق' نبوت اس پہ شفیق

جس کو میرے آقا نے صدیق کہا وہ صدیق ہی رہے گا' وہ صدیق ہے' پیغمبر کا رفیق ہے' نبوت اس پر شفیق ہے' صحابہ میں لئیق ہے' میری تحقیق ہے جو کچھ کہہ رہا ہوں بالکل ٹھیک ہے۔

دارالعلوم دیوبند اور خدمت اسلام

پورے ایشیا میں دارالعلوم دیوبند کی دینی' مذہبی' تالیفی' تصنیفی' تعلیمی' قومی' ملکی' ملی' اصلاحی اور فنی خدمات ہر شہر' ہر قصبہ' ہر دیہات میں دن رات مسلّم ہے۔

جب ہندوستان میں کفر کا طوفان تھا۔ شرک براجمان تھا۔ بدعات' رسومات' رواجات میں مبتلا انسان تھا۔ خرافات' ہزلیات' اغلوطات کا شکار مسلمان تھا۔ اسلام برائے نام تھا۔ مذہب بدنام تھا۔ ہر غلط کام تھا' عقیدہ خام تھا۔ جہالت کا اندھیرا تھا' ظلم کا بسیرا تھا' گمراہی کا ڈیرہ تھا' انگریز کی حکمرانی تھی' حکومت شیطانی تھی۔ ہر طرف حیرانی پریشانی تھی' ہر سو ویرانی تھی۔

جب علماء کو پھانسی پر لٹکایا گیا' دار و رسن پر چڑھایا گیا' دریائے شور عبور کرایا گیا' حق گو لوگوں کا سر اڑایا گیا الکفر ملة واحدة کا سماں تھا' نقشہ الحفیظ والاماں تھا۔ بڑے بڑے جاگیردار سرمایہ دار اور زمیندار حکومت کے وفادار تھے۔ ملک کے غدار تھے' مذہب سے بیزار تھے' اعلیٰ عہدوں کے طلب گار تھے' اکثر عیار' مکار اور بے کار تھے' مناصب کے نشے میں سرشار تھے' مسلمان ذلیل و خوار تھے۔ قرآن کے نسخے جلائے گئے' اسلام کے نقشے مٹائے گئے۔ مجاہدوں پر مقدمے چلائے گئے درختوں پر لٹکائے گئے' کالجوں کی تعلیم تھی' مسلمانوں میں نہ تنظیم تھی' نہ اسلامی تعلیم تھی۔

حق پرستوں کا گروہ برسرِ پیکار تھا' ہندوستان میدان کارزار تھا' سب سے بڑا دشمن انگریز تھا' جو بڑا شر انگیز' چالاک تھا' تیز تھا' پھر بھی مقابلہ مقاتلہ کا معاملہ کیا گیا' مسلمانوں کی دینی تنزلی دیکھ کر غیور جاگ اٹھے۔ بالآخر انگریز اس ملک سے بھاگ اٹھے۔

دارالعلوم دیوبند نے ہزاروں مفسر' محدث' مفتی' متکلم' محقق' مدقق' مناظر' معلم' مبلغ' مؤرخ' مدبر' مفکر' سیاستدان' صحافی' شاعر' ماہر تیار کئے اور ہزاروں فقہاء' علماء' فضلاء' فصحاء' بلغا' ادباء' اتقیاء' اذکیاء' اصفیاء' اکابر' شیوخ پیدا کیے۔

......☆......

خطیب پاکستان قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ کی وفات پر تعزیتی بیان

''احسانؒ پر اللہ کا احسان تھا' کیا عجیب انسان تھا۔ بہادر تھا' مردِ میدان تھا' خادمِ قرآن

تھا' ذی فہم وذیشان تھا۔علماء کا قدر دان تھا۔عاشقِ نبی آخر الزمانؐ تھا۔قاضیؒ پر فضلِ یزدان تھا۔یوں سمجھ رب مہربان تھا آہ! قاضی مہمان تھا۔مرحوم کئی صفات کا حامل علماء کے زمرہ میں شامل تھا۔ دشمنوں کا حبیب تھا۔خوش بخت' خوش نصیب تھا' فصیح تھا ادیب تھا' پاکستان کا خطیب تھا۔قاضیؒ غازی تھا' نمازی تھا اللہ اس سے راضی تھا۔قاضیؒ کے دست میں سخا تھی۔چشم میں حیاء تھی' طبیعت باوفا تھی' پیاری ادا تھی۔قاضیؒ مہمان نواز تھا۔کامیاب تھا' سرفراز تھا' طمع سے بے نیاز تھا۔اسلام کا شہباز تھا۔پابند صوم وصلوٰۃ تھا...... جلسے ہو رہے ہیں واعظ نہیں' ممبر ہے زینتِ ممبر نہیں' مسجد ہے خطیب نہیں' بچیاں ہیں ابا نہیں رہا' بیوی ہے سہاگ اجڑ گیا' چمن ہے مالی نہیں خزانہ ہے محافظ نہیں' مکان ہے مکیں نہیں' اب بھی موت پر یقین نہیں...... یا اللہ قاضی مرحوم کو محروم نہ کرنا "الا تخافوا ولا تحزنوا" کا مژدہ سنانا۔ایک مسافر غریب کفن بردوش' خاموش پر رحم کی نگاہ ہو۔

؎ آسماں تیری لحد پر شبنم آفشانی کرے

......☆......

اگر اللہ ہندوستان میں دو شخصوں کو پیدا نہ کرتا

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں اللہ تعالیٰ ۲ دو شخصوں کو پیدا نہ کرتا اور ان سے اپنے دین کی دستگیری نہ فرماتا تو یوں اللہ تعالے اپنے دین کا نگہبان ہے،اس کی حفاظت دین کے طریقے ہزار ہیں،لیکن بظاہر تیرہویں صدی تک یا تو اسلام ہندوستان سے بالکل فنا ہو جاتا یا اتنا بگڑ جاتا، جتنا ہندو مذہب، یہ دو بزرگ ہندوستان کے مسلمانوں کے جلیل القدر محسن اور اسلام کے عظیم الشان پیشوا حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔احیائے اسلام اور خدمت شرع کے تذکرے میں ان نائبان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور درویشوں کے ساتھ ایک "دنیادار" بادشاہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر مرحوم کا نام بھی زبان پر آتا ہے۔

"ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشآء" (۶۲:۴)

تیرہویں صدی میں ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مذہبی، اخلاقی اور سیاسی حالت تھی ،اس کے تصور کے لئے موجودہ حالت ذہن میں لانا چاہئے، یہ خیال رہے کہ یہ حالت بڑی

جدو جہد اور صلاح وتجدید کا نتیجہ ہے، پھر بھی شاید بہ یک وقت سب گوشے نظر نہ آسکیں، اس لیے ہم اس کا ایک ناقص اور دھندلا سا خاکہ کھینچتے ہیں۔

اگر ''شرک جلی'' دنیا میں کوئی چیز ہے، اور لغت اور عرف وشرع میں اس کے کچھ معنی ہیں تو وہ صاف صاف مسلمانوں میں کثرت سے موجود تھی، قبروں اور مُردوں کے متعلق ایک مستقل شریعت بن گئی تھی، جس کے واجبات اور مستحبات میں انہیں سجدہ کرنا، ان سے دعا مانگنا، بوسہ دینا، نذریں اور چادریں چڑھانا، منتیں ماننا، قربانیاں کرنا، طواف کرنا، گانا بجانا، میلہ لگانا، تہوار منانا، چراغاں کرنا، عورتوں کا جمع ہونا اور مختصر اور صحیح الفاظ میں ان کو قبلہ وکعبہ اور ملجاو ماوی سمجھنا تھا، اولیاء اللہ اور بزرگان دین کے متعلق وہ سب عقائد وخیالات موجود تھے، جن کی وجہ سے نصرانی، یہودی اور مشرکین عرب بدنام ہیں، ہندوؤں اور شیعوں کی بکثرت رسوم مسلمانوں کی معاشرت کا جز بن گئی تھیں، اور ان سے مشکل سے کوئی گھر خالی تھا، ان کی پابندی قرآن وحدیث واسلامی فرائض سے زیادہ کی جاتی تھی، شرک وبدعت اور اسراف وجہالت ان کے اجزائے ترکیبی تھے۔

سنت وشریعت بے معنی الفاظ تھے، جو صرف کتابوں میں رہ گئے تھے، بدعت کی تعریف ہی کسی فعل پر صادق نہیں آتی تھی، اور ہر بدعت بدعت حسنہ تھی، بہت سے حرام حلال ہو گئے تھے، اور بہت سے حلال حرام، اسلامی شعائر اٹھ رہے تھے، اور ان کی جگہ ہندوانہ شعائر لے رہے تھے، اور لے چکے تھے، قرآن وحدیث کے بہت سے احکام منسوخ ہو گئے تھے، مثلاً بیوہ کا نکاح اور تقسیم میراث شرفائے اسلام کی نئی شریعت میں مستحب وفرض سے حرام ومتروک ہو گئے تھے ، ہر مسلمان کو شریعت میں ترمیم اور مستقل تشریع (قانون سازی) کا حق تھا اور جس کو عام مسلمان اچھا سمجھ لیں، وہ تو مستند شریعت تھی۔

قرآن ایک معما تھا، جسے کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا، اور نہ اس میں غور کرنے کی ضرورت تھی، اس لیے اس پر عمل کرنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا، اور اس کا بہت سا حصہ منسوخ ہو کر بے کار ہو چکا تھا، اور وہ خود وقت ضرورت کے لئے ادب واحتیاط کے ساتھ محفوظ رہتا تھا وہ مردوں کے لئے تھا، زندوں کے لئے نہیں، وہ عوم کی سمجھ سے باہر تھا، اور اس کو پڑھ کر ان کی گمراہی کا اندیشہ تھا، رہے علماء، ان کو شرعی وضروری علوم سے اس کی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ قرآن پر غور وتدبر کریں، فرائض وعبادت سے

غفلت تھی، اس لئے کہ زندگی میں مقررہ مجلسیں اور بزرگوں کے کھانے، مرنے کے بعد قرآن خوانی، فاتحہ قل، سوم تیجا، چالیسواں اور سب سے بڑھ کر پیر کا وسیلہ نجات کے لئے کافی تھا، پھر اس کے علاوہ مشقت حماقت تھی، شعائر و آداب اسلام کے زوال وانحطاط کا حال اس سے معلوم ہوگا کہ معتبر لوگوں کی شہادت ہے کہ سلام مسنون کی رسم ہی اٹھ گئی تھی، حتیٰ کہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے شریعت کدے میں بھی ''اداب'' و''تسلیمات عرض'' کا رواج تھا، اس سنت سے اتنا بعد ہوگیا تھا کہ عالمگیر جیسا متشرع اور فقیہ بادشاہ بھی اس کا متحمل نہیں تھا۔ (تاریخ دعوت وعزیمت۔ از علی میاں ندویؒ)

امام کا کام

اس وقت ایک ایسے شخص اور جماعت کی ضرورت تھی، جو دین وعلم اور صلاحیتوں کے اس بچے کھچے سرمائے سے وقت پر کام لے لے اور اس کو ٹھکانے لگائے۔

جو خانقاہوں کا حال اور درس گاہوں کا قال، وہاں کی حرارت اور یہاں کی روشنی سارے ملک میں عام کردے، جس کے جلو میں چلتی پھرتی خانقاہیں ہوں، اور دوڑتے بھاگتے مدرسے، گھوڑوں کی پیٹھ پر عالم ہوں اور محرابوں میں مجاہد۔

جو دلوں کی بجھتی ہوئی انگیٹھیاں دوبارہ دہکادے، افسروں کو ایک بار پھر گرمادے اور ملک میں اس سرے سے اس سرے تک طلب اور دین کی تڑپ کی آگ لگادے، جو مسلمانوں کی خداداد قابلیتوں اور فطری صلاحیتوں کو ٹھکانے لگائے، جس کی سعی سے شجاعت ودلیری کا رخ میدان جہاد اور حقیقی دشمن کی طرف پھر جائے، جذبہ وفاداری خداوند حقیقی کی بندگی میں لگ جائے، وضعداری، پختگی، واستقامت فرائض وعبادت کی پابندی اور میدان جہاد کی ثابت قدمی میں، عالی ہمتی دین کی خدمت اور رضائے الٰہی کے اعلیٰ مراتب کے حصول میں، غیرت وحمیت دین کی مظلومی اور مسلمانوں کی زبوں حالی کے احساس میں، فیاضی وفراخ حوصلگی مجاہدین کی امداد، مہاجرین کی نصرت اور جہاد وغزا کی اعانت اور دینی بھائیوں کی خدمت میں، جفاکشی ومستعدی سفر جہاد کی صعوبتوں کے تحمل، میدان جہاد کے مصائب اور دینی فرائض کی سربراہی میں، جوہر شناسی اہل لیاقت کی قدردانی، دین کے خادموں اور سپاہیوں کی شناخت اور تربیت میں کام آئے، ذہانت وطباعی دعوت واصلاح کی حکمت، امور جماعت میں معاملہ فہمی وفراست، میدان جنگ کی تدبیر اور حکومت اسلامی

کی دینی سیاست میں اپنے جوہر دکھائے، جس کی دور رس اور جس کی ذات مسیحانفس کسی بیکار چیز کو بھی بیکار نہ سمجھے اور کسی بے جان کو بھی مردہ نہ کہے اور جوامت کے ذخیرے کے دہرانے اور اس کے خیابان کے ہر تنکے سے پورا پورا کام لے لے، جس کے متعلق ساری دنیا کا فیصلہ ہو کہ یہ کسی مصرف کا نہیں، اس کی نگاہ کا فیصلہ ہو کہ یہی سب سے بڑھ کر کارآمد ہے، جس پتھر کو ہر معمار رد کر چکا ہو، وہ کہے کہ یہی کونے کا پتھر ہے، جو ساری عمارت کا بوجھ اٹھا سکتا ہے، وہ سنگریزوں سے دیکھتے دیکھتے ایسا کحل الجواہر تیار کر دے، جو ہزاروں آدمیوں کی آنکھیں کھول دے، اور عالم کو روشن کر دے، جو منتشر افراد سے منظم جماعت، پراگندہ اوراق سے مکمل کتاب، کچے، بلکہ گلے ہوئے مال سے بہترین مصنوعات تیار کر دے، متضاد عناصر مختلف مزاجوں اور مقابل طبائع کو آپس میں جوڑ کر ان کے اختلاف وتنوع سے نئی قوت حاصل کرے، اور ان کو شیر وشکر کر دے، ہر قابلیت اور ہر ہنر سے دین کا کام لے، شعرا کی شاعری کو حق کے دفاع میں، علماء کی قوت استدلال کو حق کے اثبات اور دماغوں کی سلوٹ دور کرنے میں، اہل باطن کی قلبی قوت کو دین کے سپاہیوں اور کارگزاروں کی تربیت وتزکیہء نفس اور دلوں کی گرہ کھولنے میں، اہل قلم کی تصنیفی قابلیت وقوت تحریر کو توحید وسنت کی اشاعت اور جہاد کی ترغیب وتحریض میں، مقرروں کی گویائی وخطابت کو دین کی دعوت اور نفیر عام میں، دولت مندوں کی دولت کو مجاہدین کا سامان درست کرنے میں صرف کرے، غرض ہر پرزے کو دین کی مشین میں لگائے اور اپنی اصلی جگہ پر جمائے، پھر ہٹی ہوئی چول کو اپنی جگہ پر لا کر ساری مشین کو اس طرح حرکت دے کہ زندگی کا پورا محور گھوم جائے۔ جو شخص ان اوصاف کا جامع ہو، اس کو اسلام کی بلیغ ومعجز اصطلاح میں ''امام'' کہتے ہیں، اور اس کی جگہ تیرہویں صدی کے تمام اہل کمال اور مشاہیر رجال کی موجودگی میں خالی تھی۔ (تاریخ دعوت وعزیمت۔ از علی میاں ندویؒ)

✿✿✿✿✿

ادبیاتِ برق

(ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی تحریروں سے اقتباسات)

نادانی و کوتاہ نگاہی کا کوئی علاج نہیں

مسرت عجیب عجیب رنگ بدلتی ہے۔ کبھی اچھل کود اور قہقہوں کے لباس میں جلوہ دکھاتی ہے۔ کبھی آنسو کا روپ دھار لیتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک بچھڑا ہوا بیٹا طویل مدت کے بعد ماں سے ملتا ہے۔ ماں کے دل میں مسرت کا ایک طوفان اٹھ کر آنسوؤں کی شکل اختیار کر لے گا۔ ہم بعض اوقات کوئی گانا سن رہے ہوتے ہیں۔ کوئی ایسا شعر آ جاتا ہے کہ دل جھوم اٹھتا ہے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی برسنے لگتی ہے۔ بعض لوگوں کو کم خوری، کم خوابی، جسمانی مشقت، حیات سے بھاگنے میں مسرت ملتی ہے۔ یونان کا فلسفی پیغمبر، سقراط چار چار دن کے باسی ٹکڑے کھاتا۔ بکری کے بالوں کا لباس پہنتا اور ایک ٹوٹے ہوئے بڑے مٹکے میں رہتا تھا۔ یہی حال ہمارے حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کا تھا۔

ایران و روم کی دولت کے انبار ان کے سامنے تھے۔ لیکن یہ لوگ کھجور اور ستو پر گزارا کرتے۔ کھردرے کپڑے پہنتے اور پچیس لاکھ مربع میل پر حکومت کرنے کے باوجود مزدوری کر کے بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔ مسرت کے پہلو اور بھی ہیں ایک چور دوسرے کی دولت سمیٹ کر خوش ہوتا ہے لیکن ایک کریم الطبع دوسروں کو کچھ دے کر لذت اٹھاتا ہے۔ بزدل میدان جنگ سے بھاگنے میں خیریت سمجھتا ہے لیکن ایک محب وطن سر دے کر شہادت کے مزے لوٹتا ہے۔ تم لاکھ کہو کہ دل و جگر پہ تیر کھانے اور گلہ کٹوانے میں کون سی لذت ہے۔ اس سوال کا جواب اپنے قائد محمد علیہ الصلوٰۃ سے پوچھو جو عموماً یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

”میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ میں اللہ کی راہ میں شہادت حاصل کروں، پھر زندگی ملے، پھر [illegible]“

حضرت امام حسین سے پوچھو کہ جسم پر ۹۶ زخم کھائے ۔ تیر حلقوم سے پار ہو گیا ۔ بچے پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر گئے ۔ لیکن آپ شہادت کے منصب عظیم کو حاصل کر کے ہی ہٹے ۔ زندگی کی وہ کون سی بلندی ہے جس کی راہ سنگلاخ زمینوں اور خارزاروں سے ہو کر نہیں گزرتی ۔ علم کے لئے برسوں محنت کرنا پڑتی ہے ۔ عزت کے لئے خواہشات کو روندنا پڑتا ہے ۔ راتیں بیداری میں کاٹنا پڑتی ہیں ۔ جب منزل حسین و جمیل ہو تو راہ کی دشواریوں کو خاطر میں کون لاتا ہے بلکہ سفر کی تلخیوں میں بھی ایک گونہ راحت ملتی ہے ۔ اگر آپ کو یقین ہو کہ کراچی پہنچ کر آپ گورنر جنرل کے سیکرٹری بن جائیں گے ۔ تو آپ کو اس طویل سفر میں بھی لذت ملے گی ۔ کعبہ کی راہ بڑی کٹھن ہے ۔ لیکن دیارِ حبیب میں وہ لذت ہے کہ طویل راہ گاتے اور جھومتے کٹ جاتی ہے ۔ ڈاکٹر کے نشتر میں خلش ضرور ہے ۔ لیکن شفا و صحت کی راحتوں کے سامنے اس خلش کی حقیقت کیا؟ سر دینے میں چند لمحات کی تکلیف یقینی ہے ۔ لیکن ذرا نتائج کا اندازہ لگائیے کہ ایک طرف وطن کے لاکھوں افراد دشمن کی تلوار سے بچ جاتے ہیں ۔ اور دوسری طرف شہید ان منور و متبسم فضاؤں میں جا پہنچتا ہے ۔ جہاں ایک طرف جنت اپنی لاکھوں رعنائیوں کے ساتھ دعوت نظارہ دے رہی ہے ۔ دوسری طرف خیام قدس سے جمال ایزدی کی شعاعیں چھن چھن کر نکل رہی ہیں ۔ جب منزل اتنی جمیل و جلیل ہو تو راہ کی تمام دشواریاں عین راحت بن جاتی ہیں ۔ اگر تم ان دشواریوں کو دکھ سمجھتے ہو ۔ اگر تم ڈاکٹر کے نشتر کو زحمت قرار دیتے ہو ۔ اگر تم شوق وصل کو اضطراب کہتے ہو ۔ اگر تم ان راہوں کو جو دیار حبیب تک پہنچاتی ہیں تکلیف دہ خیال کرتے ہو تو تمہاری اس نادانی و کوتہ نگاہی کا کوئی علاج نہیں ۔ تم نے شمشیر شمر سے خون حسینؓ کے ٹپکتے ہوئے قطرے تو دیکھ لئے ۔ لیکن وصال حبیب کے لئے وہ اضطراب اور وہ طوفان مسرت نہ دیکھ سکے جو دل حسینؓ میں موجزن تھا ۔ تم نے مسیح علیہ السلام کو سپرد صلیب ہوتے تو دیکھ لیا ۔ لیکن اس لذت بیکراں کا اندازہ نہ لگا سکے ۔ جسے یہ مرد کامل سر دے کر خرید رہا تھا ۔ حقیقتاً تمہارا معیار لذت والم سخت ناقص و سطحی ہے اور اس لئے تم انبیاء و اولیاء کی راحتوں کو مصائب سمجھتے ہو ۔ تم کرگس اور وہ شاہین ۔ تم شاہین کے احوال و مقامات کو کیا جانو ۔ ع

کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

(اللہ کی عادت)

روشنی اور بجلی کے انجن

روشنی کو حرارت سے جدا کرنا ناممکن ہے لیکن جگنو کی دم میں قدرت نے ایسی روشنی پیدا کر دی جس میں حرارت موجود نہیں آج علمائے فطرت اس قسم کی روشنی پیدا کرنے کے لئے مختلف قسم کے آلات بنا رہے ہیں۔ جگنو کا تجزیہ کر کے دیکھا جا رہا ہے جگنو خود بولتا نہیں اور علماء اس راز کو سمجھنے سے عاجز آگئے ہیں۔ اول تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جگنو کو روشنی دینے کی ضرورت کیا تھی۔ دوم اس روشنی کو حرارت سے کیوں جدا کر دیا گیا۔

انسانوں نے بجلی حال ہی میں دریافت کی ہے لیکن کائنات میں بجلی کے مختلف انجن آغاز آفرینش سے موجود ہیں مثلاً سمندر میں ایک مچھلی ایل ملتی ہے جو بجلی سے شکار کھیلتی ہے۔ یہ اپنے بعض پٹھوں کو سکیڑ کر اس قدر بجلی پیدا کر سکتی ہے جس کے صدمے سے شکار ہلاک ہو جائے۔ اسی طرح ایک اور مچھلی عجیب طرح سے شکار کھیلتی ہے۔ جب وہ دیکھتی ہے کہ اس کا شکار کہیں قریب آگیا ہے تو فوراً ایک قمقمہ (جو اس کے سر پر ہوتا ہے) جلا لیتی ہے۔ جس کی روشنی میں شکار کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور وہ لقمہ اجل بن جاتا ہے۔ (دو قرآن)

بدن کی مشین

کائنات کا ہر ذرہ ایک ایسا رباب ہے جس سے الٰہی دانش و صناعی کے ترانے نکل رہے ہیں۔ انسانی بدن کی مشین پر غور فرمایئے کہ بقول سر آرتھر کائتھ جب ہم چلتے ہیں تو صرف ایک قدم اٹھاتے وقت پورے سو پٹھے مل کر کام کرتے ہیں۔ اگر ان میں ایک پٹھا بھی بگڑ جائے تو ہم قدم نہ اٹھا سکیں اندازہ لگایئے کہ باقی اعمال میں کس قدر عضلات و اعصاب کس کس رنگ میں سکڑتے ہڑتے، پھیلتے اور لچکتے ہوں گے۔ ہر مشین کے لئے ایک ڈرائیور، کلینر (صاف کرنے والا) تیل دینے والے اور انجینئر کی ضرورت ہوتی ہے ظاہر ہے کہ انسان نہ تو اپنی مشین کا ڈرائیور ہے اور نہ مرمت کنندہ۔ یہ غریب تو اس ہولناک مشین کے سمجھنے تک سے قاصر ہے۔ قدرتاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی ہستی ہے جو حیوانات کی ارب در ارب مشینوں کو چلا رہی ہے، مرمت کر رہی ہے، تیل دے رہی ہے، صاف کر رہی ہے اور پھر یہ سب کچھ ہمارے علم کے بغیر ہو رہا ہے۔

قل الله يبدؤ الخلق ثم يعيده فانى توفكون (یونس ۳۴)

کہہ دو کہ یہ اللہ ہی ہے' جو پہلے پیدا کرتا ہے پھر عمل تخلیق کو دہراتا ہے۔ تم کہاں بھٹک رہے ہو

درخت

درخت اللہ کی بہت بڑی نعمت ہیں اور یہ زندگی میں ہمارے شریک ہیں یہ ہماری طرح کھاتے ہیں' سانس لیتے ہیں۔ بڑھتے اور بچے پیدا کرتے ہیں۔ ان کی مشینری انسانی بدن کی مشین سے کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ ہماری طرح یہ کشمکش حیات میں الجھے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف حیرت انگیز نظام سے جنگ کرتے ہیں۔ بڑے درخت کے سائے میں چھوٹا پودا نہیں بڑھ سکتا۔ دو درخت قریب قریب لگا دو تو وہ ایک دوسرے سے لڑ لڑ کر کمزور و نحیف ہو جائیں گے۔ یہ حقائق صاف صاف اعلان ہیں اس امر کا کہ دنیا میں حقِ بقا صرف طاقتور کو حاصل ہے اور کمزور (کاہل' بداخلاق' منافق' جھوٹے' بدعہد' بدقول' مکار و عیار وغیرہ وغیرہ کو) یقیناً میٹ دیا جائے گا۔

☆

اہمیت نباتات

دنیا کا تمام تر حسن نباتات سے ہے۔ یہ سبزہ گاہیں' یہ چراگاہیں یہ گلگشتیں' یہ روشیں اور یہ چمن سونے پڑ جاتے اگر نباتات کا حسن دنیا کو اپنی طرف نہ کھینچتا۔ نباتات ہی کے دم سے انسانی و حیوانی زندگی کی بہار قائم ہے۔ گندم' جو' چاول' پھل' کوکو' کافی' بیر' شربت اور شراب نباتات سے حاصل ہوتے ہیں۔ دودھ' شکر' گھی اور شہد نباتات کی بدولت ہیں تمہارے کپڑے نباتات کا کرشمہ ہیں۔ ربڑ (جو ہماری معاشرت کو ضروری جزو بن چکا ہے) درختوں سے حاصل ہوتا ہے۔ پٹرول کوئلے کا پسینہ اور کوئلہ مدفون جنگلوں کا دوسرا نام..... کوئلہ ایک زہر ہے۔ اگر کسی کمرے میں صرف پاؤ بھر کوئلہ جلا کر دروازے بند کر دیئے جائیں تو نصف گھنٹے میں اندر کے تمام کے تمام آدمی دوسری دنیا کو سدھار جائیں۔ غور فرمایئے کہ اس سیاہ موت (کوئلہ) کے استعمال سے قومیں آج کس قدر طاقور بنی ہوئی ہیں۔ انسان کی سطوت و ہیبت کی دھاک بندھی ہوئی ہے اور دوسری طرف وہ قومیں کس قدر ذلیل و ضعیف ہیں جو کوئلے کے استعمال سے ناواقف ہیں۔

نباتات ہمارے لئے نہ صرف مدار حیات ہیں بلکہ وہ ہماری معاشرت اور تمدن کا جزو بن چکے ہیں۔ بعض مواقع پر پودے یوں بھیس بدل کر سامنے آتے ہیں کہ پہچانے نہیں جاتے غسل خانے میں تم بدن کو صابن سے صاف کر رہے ہو جانتے ہو یہ صابن کہاں سے آیا؟ نباتاتی تیلوں سے تیار ہوا۔ بہ دیگر الفاظ تم صابن استعمال نہیں کر رہے ہو بلکہ جسم پر ایک درخت رگڑ رہے ہو۔ ہماری یہ سلک کی قمیض یہ ململ کی پگڑی اور یہ لٹھے کا پاجامہ دراصل ایک چھوٹا سا جنگل ہے' یہ الماری میں سجی ہوئی کتابیں ایک پیشہ ہیں' یہ اخبارات' رسائل' لفافے' ٹکٹ اور اشتہارات وہ درخت ہیں جنہیں مزدور کاٹ کر کارخانوں میں کاغذ بنانے کے لئے گئے تھے۔ امریکہ میں روزانہ اخبارات کی تعداد اشاعت ۲۰۰۰۰۰۰'۱۱ ہے۔ جانتے ہو اس قدر کاغذ پر کس قدر درخت صرف ہوئے ہونگے؟ پندرہ ایکڑ جنگل۔ جب تم کوئی اخبار خریدو تو واقعات عالم پڑھنے کے علاوہ اُس چھوٹے سے درخت کی خاموش کہانی بھی سن لیا کرو جو کاغذ کے پردے میں اپنی داستان سنا رہا ہوتا ہے۔ اس قلب ماہیت پر ایک شعر یاد آ گیا۔ شاعر کسی انگورستان سے گزرتا ہے۔ بیلوں کے ساتھ عنابی گچھے لگے ہوئے ہیں ایک طرف ایک درخت کے نیچے شراب کا ایک مٹکا پڑا ہوا ہے۔ شاعر کا تخیل ماضی کی سہانی فضاؤں کو چیرتا ہوا فرہاد و شیریں کے عہد تک جا پہنچتا ہے۔ یہ پرستارانِ محبت جب مر گئے تھے تو رفتہ رفتہ ان کے اجسام خاک بن گئے تھے یہ خاک کہیں کھاد بن کر شاخ انگور کی غذا بنی اور کہیں اس سے اینٹیں اور مٹکے تیار کئے گئے۔

خون دل شیریں است سیں مے کہ زر زنوشی

خاک تن فرہاد است ایں خم کہ نہد دہقاں

(خاقانی)

میزان عدل

سردی میں جنگل سے لکڑہارے کی کلہاڑی کی صدا سنائی دیتی ہے۔ کتنی بے رحمی سے درختوں کو کاٹتا ہے۔ اگلے سال بہار میں جا کر دیکھو تو وہی مقام پھول دار پودوں سے پٹا پڑا ہو گا۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ ہوائیں اور پرندے ادھر ادھر سے بیج لے آیا کرتے تھے۔ لیکن پہلے روشنی کم ہونے کی وجہ سے اگ نہ سکتے تھے۔ اب جوں ہی میدان صاف ہوا' یہ جگہ سبزہ زار بن گئی فطرت کا

دستور ہے کہ وہ ہر ایک چیز کے بدلے دوسری عطا کر دیتی ہے اندھا آنکھیں کھو کر زبردست قوت سمع سے بہرہ ور ہو جاتا ہے۔ مرغابیوں کی دم چھوٹی لیکن گردن لمبی ہوتی ہے۔ جاہل کا دماغ غیر تربیت یافتہ، لیکن وہ جسمانی طاقت میں بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ عالم کا دماغ اعلیٰ لیکن جسم نحیف وضعیف ہوتا ہے۔ دولت والے علم سے اور علم والے دولت سے محروم رہتے ہیں۔ اگر شہر میں کوئی قوم (آج کے مسلمانوں کی طرح) سہل انگاری وتغافل شعاری کی وجہ سے صلاحیت حیات کھو بیٹھے تو قدرت اسے میٹ کر کسی اور قوم کو وارث زمیں بنا دیتی ہے۔

......☆......

جذبہ افزائش نسل

جب کوئی پودا قد وقامت میں مکمل ہو چکتا ہے تو اس میں ایک حسین تغیر آ جاتا ہے وہی نباتیے، جواب تک شاخ وبرگ بن رہے تھے غنچوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، غنچے پھول بن جاتے ہیں اور پھول، بیج، پودے افزائش نسل کا جذبہ حیوانات ونباتات ہر دو میں نہایت شدومد کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

بیج نباتات کے انڈے ہیں، اس لئے حفاظت کی خاطر انہیں غلافوں، حجابوں اور سخت کیسوں میں چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ ان میں جو بیج انسانی غذا تھے مثلاً مٹر لوبیا چلغوزہ وغیرہ ان کی بہت زیادہ حفاظت نہ کی گئی۔ بلکہ انہیں معمولی چھلکوں میں رکھا تاکہ ''لاڈلے'' انسان کو نکالنے میں تکلیف نہ ہو۔ بعض مفید درختوں مثلاً سیب، سنگترہ..... تعداد میں کم تھے، اس لئے انہیں تلخ وترش بنا دیا، تاکہ انسان انہیں کھا نہ جائے اور نسل کا خاتمہ نہ ہو جائے بعض بیج ہماری یومیہ غذا تھے مثلاً گندم، مکی باجرہ وغیرہ تو قدرت نے ان کو بہ افراط پیدا کیا تاکہ انسانی استعمال کے بعد بھی کچھ نہ کچھ بچ رہیں۔

گندم، جو اور اس قسم کی چند دیگر فصلیں صرف چھ ماہ میں تیار ہو جاتی ہیں حالانکہ آم کا درخت سات آٹھ سال کے بعد پھل دیتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ فطرت ان پودوں کے کان میں چپکے سے یہ بات ڈال دیتی ہے۔ وہ دیکھو دہقان درانتی لئے آ رہا ہے جلدی کرو، بڑھو، پھولو اور انڈے زمین پر بکھیرنے کے بعد چلتے بنو۔

ایک ہوشیار مالی جب دیکھتا ہے کہ شہتوت کا درخت آٹھ سال کے طویل انتظار کے بعد پھل دینا شروع کرے گا تو وہ اس کی شاخوں کو کاٹنا شروع کر دیتا ہے ۔ درخت ڈر جاتا ہے کہ کہیں مٹ ہی نہ جائے۔ اس لئے وہ جلدی جلدی بڑھنا شروع کر دیتا ہے تا کہ مرنے سے پہلے نسل کی بنیاد ڈال جائے۔

نباتات کے اس منظر میں ہمارے لئے یہ سبق پنہاں ہے کہ سست اقوام کی رفتار کو تیز کرنے انہیں مفید خلائق بنانے اور ان کے ضعف کو قوت سے بدلنے کے لئے تلوار کا استعمال ازبس ضروری ہے مسلمان تمام عالم کے نظم ونسق اور اقوام وملل کی بہتری و برتری کا ذمہ دار بن کر آیا ہے:

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس (آل عمران ۱۱۰)

تم ایک بہترین امت ہو جسے اقوام عالم کی بہبود پر مقرر کیا گیا ہے۔

اس لئے اس کا فرض ہے کہ وہ دل کھول کر تلوار کا استعمال کرے۔ ظلم وعدوان اور جور و عصیاں کو مٹا کر رکھ دے تا کہ دنیا امن و آشتی کی لذت سے آشناء ہو جائے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا۔ میں کہتا ہوں اگر ایسا ہوا ہے تو بہت اچھا ہوا ہے۔ آج کروڑوں بندگان خدا کو تجارتی منڈیوں اور نو آبادیوں کے لئے تباہ کیا جا رہا ہے۔ گزشتہ جنگ عظیم بھی کچھ ایسے ہی ذلیل مقاصد کے لئے لڑی گئی تھی۔ اگر آج تجارت دولت' دنیوی برتری' نو آبادیوں اور تیل کے چشموں کی خاطر تلوار کا استعمال کیا جا رہا ہے اور اس میں آپ کو کوئی برائی نظر نہیں آتی تو اسلامی تلوار کے استعمال پر آپ کیوں نعل در آتش ہوں کہ جس کا مقصد تیل کے چشمے اور ربڑ کے جنگل نہ تھے بلکہ نیکی کی ترویج اور بدی کا استیصال تھا' ارباب ظلم کی ہلاکت اور عدل وانصاف کا احیاء تھا' فتنہ شر کا خاتمہ اور امن و آشتی کا قیام تھا۔ مبارک ہے وہ تلوار جو اس قدر بلند مقصد کے لئے اٹھائی جائے۔ رسول اللہ ﷺ کے اس اعلان کو کبھی نہ بھولئے گا:

بعثت بالسیف بین یدی الساعۃ (حدیث)

ترجمہ:۔ میں قیامت سے ذرا پہلے تلوار دے کر بھیجا گیا ہوں۔

پھولوں کی حفاظت

پھولوں کو جنگلی جانوروں اور پرندوں سے محفوظ رکھنے کے لئے قدرت نے کئی تدابیر

اختیار کیں۔ مثلاً بعض (بادام اور اخروٹ) کے چھلکے سخت بنا دیئے اور بعض پر کڑوے غلاف چڑھا دیئے۔ سنگترے اور انار کا چھلکا اس قدر کڑوا ہوتا ہے کہ کسی جانور کو منہ ڈالنے کی ہمت تک نہیں پڑتی۔ قدرت کا کمال صناعی دیکھئے کہ زمین وہی ہے' درخت وہی ہے اور رس پہنچانے والی شاخیں وہی ہیں' لیکن انار کا چھلکا سخت کڑوا ہے اور دانے میٹھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ چھلکوں اور دانوں کے لئے دو علیحدہ علیحدہ کارخانے کام کر رہے ہیں۔ ایک مٹھاس تیار کر رہا ہے اور دوسرا کڑواہٹ۔ یہ دونوں رس پاس پاس ہیں لیکن ایک دوسرے خلط ملط نہیں ہو سکتے۔

مرج البحرين يلتقيان بينهما برزخ لايبغيان (رحمن ۱۹. ۲۰)

اخروٹ اور بادام اونچے پہاڑوں پر پیدا ہوتے ہیں جہاں برف وغیرہ کی وجہ سے میدانی جانور نہیں پہنچ سکتے۔ یہاں صرف گلہری چوہوں کا خطرہ ہوتا ہے اس لئے ان کے چھلکے سخت بنا دیئے تا کہ چوہے نقصان نہ پہنچا سکیں۔

......☆......

کھجور

صحرائے عرب سینکڑوں میل تک پھیلا ہوا ہے جسے طے کرنے کے لئے اب بھی اونٹ سے کام لیا جاتا ہے۔ امکان تھا کہ مسافر راہ میں بے توشہ نہ ہو جائیں۔ اس لئے اس ریگستان میں ہر طرف کھجوروں کے درخت اگا دیئے اور انہیں بلند قامت بنا دیا تا کہ یہ قیمتی پھل جانوروں کی رسائی سے باہر ہو جائے۔ نیز قرب زمین کی گرمی سے نسبتاً محفوظ رہے۔ کھجوروں کے تنے اس لئے ریشہ دار اور کھوکھلے بنائے تا کہ تھرموس بوتل کی طرح اندر کی ہوا بیرونی حرارت سے متاثر نہ ہو اور پھل خشک نہ ہو جائے۔ انسانی بدن کی مشین کو دو چیزوں کی سخت ضرورت رہتی ہے شکر و نشاستہ' یہ ہر دو اجزاء کھجور میں بہ درجہ کمال موجود ہیں۔ جنگل میں حفاظت اثمار کے مسالے کہاں مل سکتے تھے۔ کیلا صرف ایک ہفتے میں گل سڑ جاتا ہے۔ سیب پلپلا ہو جاتا ہے۔ امرود میں کیڑے چلنے لگتے ہیں شہتوت اور لوکاٹ چند گھنٹوں میں خراب ہو جاتے ہیں لیکن کھجور کو اللہ نے کسی خاص مسالے سے

یوں محفوظ کر دیا ہے کہ مہینوں خراب نہ ہو۔

کھجور کی جڑیں زمین سے دو قسم کا رس چوستی ہیں' کثیف اور لطیف۔ کثیف رس سے تن آور شاخیں بنتی ہیں اور لطیف سے پھل۔ پھل کے ہر دانے کے ساتھ ایک مصفی لگا ہوتا ہے جو رس کو مزید صاف کرتا ہے۔ گٹھلی کڑوی ہوتی ہے اور چھلکا میٹھا۔ ان ہر دو کے درمیان ایک پردہ لگا دیا ہے۔ تا کہ تلخی و شرینی خلط ملط نہ ہو جائیں۔

نشانات منزل

درخت عموماً راہوں پر اگتے ہیں۔ اس لئے کہ مسافر پھل کھا کر گٹھلیاں پھینک دیتے ہیں اور وہاں درخت اگ آتے ہیں جہاں درخت نظر آتے ہیں اور وہاں راہ موجود نہیں تو سمجھ لو کہ یہاں سے کبھی قافلہ گزرا تھا۔ اہل عرب پہلے سندھ پر حملہ آور ہوئے تھے' ان کے پاس کھجوریں تھیں۔ جہاں کہیں اترے' گٹھلیاں پھینکتے گئے' نتیجہ یہ کہ آج سندھ میں عربی نسل کی کھجوریں میلوں تک دکھائی دیتی ہیں:

خبر دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی

ناریل

ایک مسافر سخت گرمی میں ایک ایسے جھونپڑے میں جا پہنچا جس پر ناریل کے درختوں کا سایہ تھا۔ صاحب خانہ نے مسافر کو شراب' دودھ اور حلوا نہایت عمدہ برتنوں میں پیش کیا۔ مسافر نے پوچھا کہ جنگل میں یہ غذائیں کہاں سے آگئیں۔ کہا یہ سب کچھ ناریل کی بدولت ہے۔ میں کچے ناریل سے پانی' پختہ ناریل سے دودھ' پتوں سے حلوا' شگوفوں سے شراب پھولوں سے شکر' چھال سے برتن' لکڑی سے ایندھن' بنے ہوئے پتوں سے چھت' ریشوں سے رسیاں اور تیل سے روشنی حاصل کیا کرتا ہوں۔ جب مسافر چلنے لگا تو میزبان نے ایک شاخ کو جھاڑا جس سے غبار سا گرا۔ اس غبار سے سیاہی کا کام لیکر ایک پتے پر کسی دوست کی طرف چھٹی لکھ دی

نکتہ یوم و ماہ

ڈاکٹر شابلی کا خیال ہے کہ فضا میں ایک مرکوز نور ہے جس کے گرد تمام شموس چکر کاٹ

رہے ہیں اوران کاایک چکرتیس کروڑ سال میں ختم ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ہمارے تیس کروڑ سال ان شموس کے ایک سال کے برابر ہوتے ہیں اوران کاایک دن ہمارے تیس کروڑ دنوں یعنی آٹھ لاکھ بائیس سال کے برابر۔

چونکہ آسمان میں نظام ہائے شمسی کی کوئی انتہانہیں اور ہر سورج کی حرکت اپنے مرکز کے گرد دوسرے سے مختلف ہے اسی لئے ہر نظام کے لحاظ سے یوم وماہ کی مدت بھی مختلف ہے۔ ہمارے ہاں ایک دن رات زمین کی محوری گردش (۲۴ ساعت) کا نام ہے اور سال زمین کی آفتابی گردش (۳۶۵ دن) کا نام لیکن دوسرے نظاموں کے سال وماہ ہم سے مختلف ہیں ۔عطارد کا سال صرف ۸۸ دن کا ہوتا ہے' زہرہ کا سال ۲۲۵ یوم کا' لیکن مشتری کا سال ہمارے ۱۲ سال' زحل کا ہمارے ۲۹ سال اور نیپٹون کا سال ہمارے ۱۲۵ سال کے برابر ہوتا ہے۔اسی طرح کہیں کوئی ستارہ ہزار سال میں اور کہیں پچاس ہزار سال میں اپنے مرکز کے گرد چکر کاٹ رہا ہے۔

......☆......

غور فرمایئے کہ آسمانوں میں کس قدر مہیب دنیائیں کس توازن سے چکر کاٹ رہی ہیں کتنے بڑے بڑے کرے لاکھوں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے محو پرواز ہیں جب ہم ان دنیاؤں پر ایک چھچھلتی سی نگاہ ڈالتے ہیں تو اپنی بے مقدار ہستی کا زبردست احساس پیدا ہوتا ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ اس خالق ارض وسما کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ انسانی ہدایت کے لئے اس قدر پیمبر اس قدر رہنما ور ہبر بھیجتا رہا۔ادھر انسان کو دیکھو کہ ان دنیاؤں کے مقابلہمیں اس کی ہستی ایک حقیر کیڑے سے زیادہ نہیں نافرمانی اور بدعملی میں چوٹی تک ڈوبا ہوا ہے اور پھر خدا کا پیارا لاڈلا ہونے کا گھمنڈ ہے۔در بدر مانگتا پھرتا ہے لیکن جنت کے ٹھیکیدار ہونے کا پندار ہے۔چیتھڑے اور جوئیں سنبھال نہیں سکتا لیکن امت رسول ہونے کا غرور ہے۔مسکنت وذلت کا مجسمہ بن چکا ہے لیکن تقدس وپاک بازی کا دعویٰ کرتا ہے اس برخود غلط انسان کو کیا معلوم کہ اس صاحب جبروت رب کے ہاں جس قدر فضاؤں میں زمین جیسی ارب کھرب دنیائیں نہایت شکوہ وعظمت سے گھوم رہی ہیں' انسان کو کوئی وقعت حاصل نہیں۔ بھلا اس ہیچ میرز کیڑے کی ان لرزہ انگیز کروں کے سامنے ہستی ہی کیا ہے؟ تو پھر یہ نشہ کیوں؟ یہ غرور ودپندار کیسا؟ اور یہ انا و لا غیری کا دعویٰ کس لئے؟

مقابلہ

ہماری زمین فضا میں ایک حقیر سا کرہ ہے۔ کروڑوں کرّے ہماری زمین سے لاکھوں بڑی فضا میں چکر کاٹ رہے ہیں۔ یہ فرض کرنا کہ ان کروں میں زندگی نہیں غلط ہے یہ زمین ان کروں کے مقابلہ میں ایک کھلونا ہے۔ صرف مشتری ہماری زمین سے ۱۲ گنا بڑا ہے تو کیا یہ تمام دنیائیں صرف زینت کے لئے بنائی گئیں محض کھیل کے لئے پیدا کی گئیں؟ کوئی اور مقصد نہ تھا؟ ضرور ہے لیکن ابھی ہمارا علم بہت ناقص ہے' ان دنیاؤں کے راز دریافت کرنے کے لئے ابھی کئی ہزار صدیاں اور صرف ہوں گی اور تب کہیں معلوم ہوگا کہ:

وماخلقنا السموات والارض ومابینهما لعبین (دخان ۳۸)

ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے محض تماشے کی خاطر پیدا نہیں کیا۔

علم

اس وقت صرف اہل زمین کے تمدن' حکومت' طبائع' جغرافیہ' تاریخ اخلاق وغیرہ پر آٹھ کروڑ سے زیادہ کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اگر ہمیں دوسرے کروں کا علم بھی زمین ہی کی طرح حاصل ہوتا تو ہم ان کے متعلق بھی کتابیں لکھتے۔ چونکہ آسمانی کروں کی تعداد کم از کم دس کروڑ ہے اس لئے علم میں دس کروڑ گنا اضافہ ہو جاتا۔

اگر اس تمام ذخیرہ کتب کو ایک لائبریری میں رکھنا چاہتے اور لائبریری کے ہر کمرے میں ۱۰ دس ہزار کتب سما سکتیں تو ہمیں ۸۰۰۰۰۰۰۰۰۰ کمروں کی ضرورت ہوتی اگر لاہور میں ۳ لاکھ مکانات تسلیم کئے جائیں تو ہماری یہ لائبریری لاہور جیسے ۲'۶۶'۶۶۷ شہروں میں سماتی۔ اگر ایک آدمی روزانہ ایک کتاب پڑھ ڈالتا تو اسے تمام کتب ختم کرنے کے لئے دو کھرب بیس ارب سال درکار ہوتے۔

خدا کے بندو! کیا ان تفصیلات کے بعد الٰہی جلال وعظمت سے تمہارے دماغ متاثر ہوئے؟ کیا تمہارے دلوں میں خشیۃ اللہ کی وہ کیفیت پیدا ہوئی جو ان تفاصیل کا مقصد ہے؟

عالم حیوانات

ایک چوہے کو ہاتھ میں پکڑو تو کاٹتا ہے۔ بھڑ کے قریب جاؤ تو ڈنگ لگاتی ہے۔ ہرن میل بھر سے دوڑ جاتا ہے' بھیڑیئے یا پلنگ پر سواری ناممکن ہے حالانکہ یہ گھوڑے سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر اونٹ کسی وقت باغی ہو جائے تو مالک کو گھٹنوں کے نیچے پیس ڈالتا ہے' کینۂ شتر مشہور ہے۔ اگر بیل یا بھینسا سرکش ہو جائے تو تمام گھر کو آناً فاناً مسمار کر دے۔ اللہ کی یہ کتنی بڑی نوازش ہے کہ اونٹ' گھوڑے' بیل' بھینس' اور ہاتھی جیسے شہ زور حیوان ہمارے اشارۂ نگاہ کے مطابق کام کر رہے ہیں' ہمارے بوجھ اٹھا رہے ہیں' ریگستانوں میں سے اٹھا کر پار لے جا رہے ہیں اور کان تک نہیں ہلاتے۔

وذللنٰها لهم فمنها ركوبهم ومنها ياكلون.

پھر ہر گائے اور بھینس ایک مشین ہے جو ہمارے لئے اکمل الاغذیہ یعنی دودھ مہیا کرتی ہے اگر دودھ کا رنگ سرخ' سبز یا سیاہ ہوتا تو ہمیں نفرت سی آتی۔ چاندی کی شفاف نہریں تھنوں سے بہہ رہی ہیں کیا ہمارے علم اور کاریگری کے بغیر چل رہی ہیں بسا اوقات بچے تک کے لئے دودھ نہیں بچتا۔ گوالن تمام دودھ دوہلیتی ہے لیکن گائے خاموش کھڑی رہتی ہے یہ اس لئے کہ گائے ہماری پرورش کو بچے کی پرورش پر ترجیح دیتی ہے۔ افلا یشکرون.

ہندوؤں نے گائے کی اس قربانی سے متاثر ہو کر اس کی پرستش شروع کر دی حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں اس قدر دلکش مناظر ہر سو بکھرے ہوئے ہیں کہ:

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں است

صائبین نے سورج کو خدا تسلیم کیا۔ زرتشت اور موسیٰ علیہ السلام نے آگ میں الٰہی تجلیاں دیکھیں۔ صوفیائے کرام کو ہر گل میں گلستان کا مرکز دکھائی دیا۔ شیدایان دیانت نے ہر ذرہ میں صحرا کا تماشہ دیکھا۔ الغرض اس حسین دنیا میں ہر سو نور و تجلی کے وہ حیرت انگیز مناظر موجود ہیں کہ ہر چیز پر مظہر خدا ہونے کا دھوکا لگتا ہے۔

ایک بچہ باپ کے ساتھ بازار میں جاتا ہے' جس مٹھائی کو پہلے دیکھتا ہے اس کے خریدنے کی تمنا کرتا ہے لیکن والد ساتھ ہے' وہ بہترین چیز خرید لیتا ہے اگر ہماری انگلی رسول ﷺ کے

ہاتھ میں نہ ہوتی۔ تو ہم اس نادان بچے کی طرح ہر چیز کی پرستش پر اتر آتے۔ ہر رسول نے بہ بانگ دہل اعلان کیا تھا کہ دیکھو ان مناظر میں کہیں الجھ کر نہ رہ جانا۔ تمہارا مسجود وہ قادر و برتر رب ہے جو ان کھلونوں کا خالق ہے اور یہ مناظر تمہارے غلام و مطیع ہیں نہ کہ معبود و مسجود۔

......☆......

پھولوں اور سبزیوں پر بعض چھوٹی چھوٹی مکھیاں اس قدر باریک ہوتی ہیں کہ اگر پکڑ کر دیکھنا چاہو تو انڈے کی طرح پھٹ جاتی ہیں لیکن کمال یہ ہے کہ ان میں باقاعدہ گردے' ہڈیاں' پھیپھڑے' معدہ' انتڑیاں' دماغ' آنکھیں' پر' ٹانگیں سب کچھ موجود ہے اور اس چھوٹے سے انجن میں پٹرول بھی بھرا ہوا ہے کہ باقاعدہ اڑ رہا ہے اللہ کا کمال دیکھنا ہو تو کوہ ہمالیہ کو مت دیکھو بلکہ یہ چھوٹے چھوٹے اڑتے ہوئے انجن دیکھو ان کے رنگ پر غور کرو منہ' پاؤں' آنکھیں اور سر دکھائی نہیں دیتے لیکن پھر بھی یہ مکمل جسم ہیں۔ ہر جسم میں چھوٹی چھوٹی رگیں ہیں جن میں خون دوڑ رہا ہے' ایک چھوٹا سا پیٹ ہے جس میں غذا جا رہی ہے۔ اللہ اکبر! یہ جسم اللہ نے کس طرح تیار کیا ہوگا۔ شاعر فطرت کا کتنا باریک نازک اور ادق تخیل ہے کہ انسانی عقل تھرتھرا اٹھتی ہے۔

خود اعتمادی

جنگلی جانور اپنی حفاظت خود کرتے ہیں اس لئے چست' چالاک تیز' تندرست دراک اور حیلہ باز ہوتے ہیں لیکن گائے' بھینس گدھے وغیرہ کی حفاظت کا ذمہ انسان نے لے رکھا ہے اسی لئے یہ کاہل' بھدے اور سست ہوتے ہیں' جو قوم اپنے اقواء کو استعمال نہیں کرتی اللہ سے قوائے عمل چھین لیتا ہے مسلمانوں کو تقلید نے آج اندھا بہرا بنا رکھا ہے اس قوم نے قوائے مفکرہ کا استعمال چھوڑ دیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس سے یہ طاقتیں ہی چھین لیں۔

حرکات حیوانات

حرکت تلاش غذا کے لئے ہے' چونکہ درختوں کو غذا ہوا زمین سے مل جاتی ہے اس لئے انہیں چلنے کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔ اگر بالفرض درخت بھی تلاش غذا کے لئے چلتے پھرتے تو دنیا میں بڑی بدنظمی پھیل جاتی۔ ہر روز ہزاروں درخت سڑکوں کے درمیان آ جاتے۔ آمد و رفت

بند ہو جاتی۔ زید کے کھیت سے درخت چل کر عمر کے کھیت میں چلے جاتے اور باغوں سے بھاگ کر پہاڑوں پر چڑھ جاتے۔

چونکہ حیوان کی خوراک دنیا میں ہر سو پھیلی ہوئی ہے اس لئے وہ چلتا پھرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو وہی خصوصیت عطا کیں جن کی اسے ضرورت تھی مثلاً سپلنج ایک ایسا جانور ہے جو اپنے مقام کو نہیں چھوڑتا اس لئے اس کی غذا وہیں موجود ہوتی۔ سی سکرٹ (SEASQUIRT) غذا کے لئے صرف اتنی ہی تکلیف کرتا ہے کہ اپنے خول سے سر باہر نکالتا ہے اور بس۔

حالات کے مطابق مختلف جانوروں کی حرکات مختلف ہیں۔ بعض دن کو سوتے ہیں اور رات کو نکلتے ہیں۔ وبالعکس بعض جانور سخت گرمی اور سردی میں مکانوں کی چھتوں اور سوراخوں میں مہینوں نہاں رہتے ہیں اور مرتے نہیں، جوہڑ خشک ہونے کے بعد مینڈک زمین کی ایک تہہ سے چپک جاتا ہے اور برسات میں باہر نکل آتا ہے۔ مہینوں اور بسا اوقات برسوں غذا کے بغیر زندہ رہنا تخلیق کا بہت بڑا معجزہ ہے۔ جن جانوروں کی غذا سہل الحصول اور زیادہ ہوتی ہے وہ موٹے اور بھدے بن جاتے ہیں مثلاً ہاتھی، بھینسا، مینڈک وغیرہ۔ وجہ یہ ہے کہ انہیں تلاش غذا کے لئے دوڑ دھوپ کم کرنا پڑتی ہے اور ان کے دشمن بھی کم ہوتے ہیں۔ ہرن کی خوراک ہر جگہ بہ افراط ہے لیکن اس کے دشمن اس قدر زیادہ ہیں کہ ذرا سی آہٹ پر اسے میلوں بھاگنا پڑتا ہے۔

دنیائے طیور

ومامن دابة فی الارض ولا طآئر یطیر بجناحیه الا امم امثالکم

(انعام ۳۸)

یہ چوپائے اور اڑنے والے جانور تمہاری طرح امتیں ہیں۔

ان امتوں کو بیماریاں لاحق نہیں ہوتیں۔ ان پر آثار پیری بہت کم مرتب ہوتے ہیں یہ آخر عمر تک چست، چالاک اور پھرتیلے رہتے ہیں، انہیں زکام اور ملیریا نہیں ہوتا، انہیں کھانسی اور نمونیا کی شکایت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ یہ امتیں ایک خاص نظام حیات کی پابند ہیں، مناسب غذا کھاتی ہیں، مناسب ورزش کرتی ہیں، اور لذت اندوزی کی جائز حدود سے آگے نہیں بڑھتیں۔ شیر اپنی بیوی کی سال میں ایک دفعہ خبر لیتا ہے لیکن انسان.....؟

پرندے ماحول کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں لیکن انسان عموماً نہیں بدلتا' مذہب وضع اور رسوم کی آڑ لے کر ایک مقام پر ڈٹا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ زمانے کا ساتھ دینے والی اقوام ان اقوام پر چھا جاتی ہیں جو سطح زمین پر خیالات اور اطوار و اخلاق میں ''گل محمد'' بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان طیور میں ہمارے لئے ہزاروں اسباق موجود ہیں۔ یہ ہم جیسی ہی امتیں ہیں جو آئین قوت کو نبا ہنے اور نظام صلاحیت پر عمل پیرا ہونے کے بعد زندگی سے چہک رہی ہیں۔

بدقسمت ہیں وہ پرندے اور چوپائے جو انسانی قرب و جوار میں آ بستے ہیں مثلاً گائے' بھینس' گدھا' گھوڑا' مرغا' کبوتر وغیرہ۔ انسان کافی غلیظ واقع ہوا ہے' ادھر تھوکتا ہے ادھر قے کرتا ہے اور ہر طرف کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگائے رہتا ہے۔ اس غلیظ ماحول میں یہ چوپائے اور پرندے کمزور ہو جاتے ہیں۔ ورنہ جنگلی جانوروں کو دیکھو۔ ان کے گھونسلوں اور نشیمنوں میں کس قدر صفائی پائی جاتی ہے بلی زمین میں ایک گڑھا کھودتی ہے اور اپنا فضلہ اس میں چھپا دیتی ہے' بہ الفاظ دیگر انسان کو ہر روز بلی سبق دیتی ہے۔

والرجز فاهجر. (مدثر ۵) اے انسان میل کچیل اور غلاظت سے دور رہ۔

لیکن یہ سرکش انسان جو پیمبر کی بات نہیں سنتا اور الٰہی حکم تک کی پروا نہیں کرتا وہ بلی سے کیوں سبق سیکھنے لگا؟ اشرف المخلوقات جو ٹھہرا!

زندہ اقوام میں جہاں دیگر فضائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہیں صفائی' نفاست اور پاکیزگی ان کی نس نس میں دھنس جاتی ہے۔ وہ بہت اجلے نہایت لطیف المذاق اور بے حد صفائی پسند ہوتے ہیں۔

......☆......

فبعث الله غرابا يبحث في الارض ليريه كيف يوارى سواة اخيه

(مائدة ۳۱)

تو ہم نے اس کی طرف کوا بھیجا تا کہ اس کو نعش دفن کرنے کا طریقہ سکھائے۔

یہ قصہ دراصل ایک طرح کی ہدایت ہے کہ تمام غلیظ اور بدبودار اشیاء کو زمین میں گاڑ دیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مسلم کو ہر قسم کی جسمانی' دماغی اور روحانی اخلاقی نجاست سے نجات دلانے کے لئے ہوئی تھی آج ہمارا ملا جسمانی صفائی پر کچھ کہنا اپنے علم کی ہتک سمجھتا ہے۔

وہ ایسی تمام آیات میں غلاظت سے مراد روحانی اور اخلاقی غلاظت لیتا ہے۔ اچھا ایسا ہی سہی۔ لیکن انصاف فرمایئے کیا ایسے آدمی کے اخلاق میں ذرا سی بھی نفاست ہوسکتی ہے۔ جس کے منہ کپڑوں اور جسم سے سنڈاس کی سی بو آرہی ہو۔ جس کی شلوار میں سیر بھر جوئیں پھر رہی ہوں۔ جس کی چار پائی کے نیچے تھوکوں کا ڈھیر لگا ہوا ہو۔ گندے چیتھڑے، پھٹے پرانے کاغذات صدیوں کے ٹوٹے ہوئے بادیئے اور میل سے اٹی ہوئی کنگھیاں ہر طرف بکھری پڑی ہوں دیواروں پر ناک جھاڑ جھاڑ کر پلستر کیا ہوا ہو۔ ہر طرف ہولناک غلاظت، تعفن، ویرانی، تاریکی اور ظلمت ہو اگر اخلاقی دنیا میں بدکاری ظلمت ہے تو مادی دنیا میں غلاظت اور کثافت کیوں ظلمت نہیں؟ یاد رکھو! معلم کائنات حضرت محمد عربی فداہ ابی وامی مسلم کو تمام جسمانی وروحانی غلاظتوں سے نجات دلانے کے لئے آئے تھے۔

قدرت کی پاکیزہ اشیاء کو انسان کھاتا ہے۔ انسان کی خارج کردہ غلاظت مکھیوں کی غذا بنتی ہے۔ مکھیوں کو دوسرے حشرات وطیور کھا جاتے ہیں۔ بہ دیگر الفاظ نباتات حیوانات کی غذا ہیں۔ حیوانات ہماری غذا، اور ہم مرنے کے بعد چھوٹے چھوٹے کیڑوں کی غذا بن جائیں گے۔ اس اندوہ ناک انجام سے بچنے کا راستہ صرف ایک ہی ہے کہ ہم حدود زمان ومکان کو توڑ کر جاوداں بن جائیں۔

عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

(اقبالؒ)

قرآن سے کس کو کیا ملا؟

شعرائے عرب جب کسی موضوع پر نظم لکھتے تھے، تو محبوبہ کی تعریف سے شروع کیا کرتے تھے۔ بعض اوقات اس موضوع پر چند اشعار ہوتے تھے اور محبوبہ کی تعریف میں تین چوتھائی سے زیادہ۔ جب کعب ابن زبیر رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ عالیہ میں ۵۵۔ اشعار کا قصیدہ مدحیہ پیش کرتا ہے تو محبوبہ کی شان میں ۴۰۔ اشعار کہہ جاتا ہے۔

طرفہ اپنی ناقہ کی تعریف میں ۲۹، اور لبید بن ربیعہ ۳۱۔ اشعار لکھ جاتا ہے۔ یہی حال امرأ لقیس، عمر بن کلثوم اور دیگر شعرائے عرب کا تھا۔ اگر آپ ان شعراء کی اس بے ربطی کو برداشت فرماتے رہے۔ اگر آپ کشاف، معالم التنزیل، بیضاوی اور جلالین کی صرفی ونحوی موشگافیوں، علامہ

فخر الدین رازی کی منطقیانہ نکتہ سنجیوں اور بعض دیگر مفسرین کی فقہی مطلب طرازیوں کو گوارا کرتے رہے تو مجھے امید ہے کہ الٰہی صنائع پر میری ان بے ربط تفاصیل کو بھی برداشت فرمائیں گے۔

ایک ہرے بھرے کھیت میں ایک زمیندار اپنے بیل کے ساتھ داخل ہوتا ہے وہاں ایک ماہرِ اقتصادیات اور ایک عالمِ نباتات پہلے سے موجود ہیں۔اب یہ تمام اس کھیت کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔بیل صرف آزادی کا منتظر ہے کہ مالک ٹلے اور وہ اس لہلہاتی ہوئی کھیتی سے پیٹ بھرے۔زمیندار اندازہ لگا رہا ہے کہ اس دفعہ کتنا قرضہ بے باق ہو جائے گا۔ماہر اقتصادیات یہ سوچ رہا ہے کہ اس سال اس ملک کی خوشحالی پر اچھی فصلوں کا کیا اثر پڑے گا اور عالمِ نباتات ان پودوں کے عناصر ترکیبی اختلاف الوان' زمینی بکٹیریا اور پتوں کی حیرت انگیز مشین پر غور کر رہا ہے۔

قرآنِ حکیم کھیتی کی طرح ہے' کسی نے اس کو متصوفانہ نگاہ سے دیکھا۔کسی نے اس کی سحر بیانی کی تعریف کی۔واعظ نے اس میں سے دلچسپ کہانیاں انتخاب کیں۔مُلّا ذکرِ حور و شرابِ طہور پر مست ہو گیا۔مفتیوں نے اسے مسائل فقہی کا ایک ضابطہ سمجھا۔گدی نشینوں نے سجدۂ تعظیمی کے جواز پر آیات ڈھونڈیں۔راہب نے ترکِ دنیا کے دلائل پیش کئے اور بعض نے اسے منتروں' جنتروں اور ٹوٹکوں کی کتاب بنا ڈالا۔لیکن مجھے اس کتاب میں انسان کی سیاسی' اقتصادی و اخلاقی سطوت کے لئے بے بہا گُر ملے۔میں نے نگارستان گیتی کی اس میں تفصیل دیکھی اور مجھے حتماً معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے قول و فعل میں مکمل مشابہت ہے۔کائنات کیا ہے؟ قرآن کی تفصیل اور قرآن کیا ہے۔کائنات کا متن......

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ (زمر: ۲۴)

"اللہ نے کتاب کائنات کی بہترین تفصیل (احسن الحدیث) نازل فرمائی۔یہ کتاب کائنات سے ہر رنگ میں مشابہ بلکہ اس کا مثنیٰ (شافی) ہے۔اس کے مطالعہ سے اُن (طلبۂ کائنات) کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جن کے دلوں میں کیفیتِ خشیہ موجود ہے۔"

محفلِ گیتی میں شاہدِ ہستی مستور ہے اور مسلم کا فرض اسے بے نقاب کرنا ہے۔(دو قرآن)

ادب جدید' جدت کہ بدعت؟

نیا ادب جدت نہیں، بدعت ہے۔ اس میں زیادہ تر کھلنڈرا پن ہے۔ ہر عہد کے بیان کا ایک اسلوب ہوتا ہے۔ ہمارے نئے لکھاری اسلوب بدل ڈالتے تو عیب نہ تھا۔ عصری روح کا اقتضاء ہوتا لیکن انہوں نے مطالب بھی بدل ڈالے اوران کی جگہ جو نئے مطالب لائے وہ محض تقلید، اخذ اور توارد ہیں اور تقلید بھی یورپ کے اس ہیجانی ادب کی جو مغرب میں معاشرہ واخلاق اور دین و مذہب سے بغاوت کے نام پر جنا گیا ہے۔ اس قسم کا ادب کبھی مستقل نہیں ہوتا۔ یہ محض نعرہ بازی ہے جو ایک قوم، ایک عہد چھوڑتے وقت دوسرے عہد کی راہوں میں اختیار کرتی ہے۔ یہ انقلاب نہیں' نراج ہے...... غم وغصہ کی یادگار ہمارے شاعر وادیب نہیں جانتے کہ تقلید ارتقاء کی دشمن ہے۔ اس سے جمود پیدا ہوتا اور انقلاب ٹھہر جاتا ہے۔ ان لوگوں نے ادب کی پرانی قدروں سے بغاوت کے شوق میں ادب کے مسلمات بھی ترک کر دیئے ہیں۔ ہر قوم کی ایک زبان ہوتی، اس کا مزاج اور اس مزاج کے رنگ ڈھنگ ہوتے ہیں۔ ہمارے ان ادیبوں اور شاعروں نے ان پر بھی ہتھوڑا چلایا ہے۔ یہ چیز عمدہ ہے کہ نئے ادب سے زنجیروں کے ٹوٹنے کی آواز آتی ہے لیکن حیرت ہے کہ ان ادیبوں کے ہاں ابلاغ کی روح نہیں۔ جو ادب عوام کے لیے نہ ہو، وہ ادب نہیں پہیلی ہے۔ تعجب ہے کہ ادب میں عوام کی زبان کے استعمال پر زور دینے والے عوام کی زبان سے نابلد ہیں۔ وہ جانتے ہی نہیں کہ جس قوم سے مخاطب ہیں اسے کس لہجہ سے پکارنا چاہیئے اور اظہار کا وہ کون سا پیرایہ ہے جو ان کی زبان کا لازمہ ہے اور جس سے عوام حرکت میں آتے ہیں۔ نیا ادب عوام سے مغائرت کی بنیاد پر ہے۔ اس کے پروڈیوسر مارکیٹ میں نہ تو اس کی ضرورت کا احساس کرا سکے ہیں اور نہ اس کی مانگ پائی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے ایک خاص مزاج کے چندسو لوگ ادب میں عریانی کی تحریک لے کر لکد کوبی کر رہے ہیں۔ جدید ادب...... بالفاظ دیگر اردو میں ہپی ازم ہے۔ یہ لوگ بازار کے حسن کے تاجر ہیں۔ ان کے ہاں آگ اور لہو کی سفارت نہیں تجارت ہوتی ہے۔ یہ سرور نہیں نشہ بیچتے ہیں...... گھٹیا نشہ جس سے نئی پود ادب کی آڑ میں گناہ کا جواز لاتی ہے۔

شاہ جیؒ نے اس ادب کے نوادرات کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا۔ مثلاً یہی نظم ہے:

چھن...... چھن...... چھن

چھنا چھن، چھنا چھن...... چھنن

چھن...... چھن...... چھن

چھنا چھن، چھنا چھن...... چھنن

فرمایا میں نے اس کے ناظم سے پوچھا...... اس شہ پارہ کا مطلب کیا ہے؟ کہنے لگے:

یہ صوتی تصویر ہے۔ ایک محبوبہ آشنا سے ملنے کے لئے گھر سے نکلتی ہے تو اس کی رفتار چوری چھپے کی ہوتی ہے۔ چھن...... چھن...... چھن۔ پھر دائیں بائیں کے خطرات سے اپنے تئیں محفوظ پا کر آشنا کے مکان میں جھٹ سے داخل ہو جاتی ہے...... چھن۔ لوٹتے وقت اسی طرح چوری چھپے نکلتی اور اپنے گھر میں چھنن سے داخل ہو جاتی ہے...... چھن چھنن اس کے پازیب کی آواز ہے۔

فرمایا، اوّل تو یہ صوتی تصویر شاعری نہیں، کچھ اور ہے...... خیال کی بدکرداری ہے اور اگر شاعری یہی ہے تو میں بوڑھا ہو کر بھی دن بھر میں کئی دیوان مرتب کر سکتا ہوں۔ جہاں تک اختصار کا تعلق ہے، اس سے بھی مختصر یعنی دو حصوں میں پوری کہانی کہی جا سکتی ہے۔ مثلاً

وصل کی شب اور ان کا کہنا

جاؤ بھئی ہم نہیں منتے

عوام سمجھ لیتے اور بات ادھوری نہیں رہتی۔ دو مصرعوں میں پوری کہانی لپٹی ہوئی ہے۔

(امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ۔ نقیب ختم نبوت، جنوری ۲۰۰۳ء۔ ص ۳۵)

......☆......

عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (خاکہ)

عمر بن الخطاب...... رنگ ایسا کہ سفید و سُرخ گُلاب...... (خلافت کی ذمہ داریوں اَور فاقہ کشی نے چھین لی جس کی آب و تاب)...... آنکھیں بڑی اُن میں ڈورِ عُناب...... سر کے بال کم، بہت کمیاب، ناک سیدھا، گال بھرے بھرے، قد لمبا، طوالت کے لیے عزت مآب...... ہاتھ پاؤں بڑے بڑے مگر ناموزونیت سے اجتناب...... ہر دَم سنجیدہ، لہجہ کھرا، طبیعت میں غُصہ، چال تیز بس آہوئے بے تاب...... چہرے پر چاندنی، مثالِ ماہتاب...... دُعائے نبی کا جواب، جوابِ لا جواب...... آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔

اُس کا قبولِ اسلام، کفر پر بجلیوں کا عتاب...... اُس کو خدا کی لگن، اسی دُھن میں وہ مگن، اسی کی آرزو میں وہ ماہی بے آب...... اُس کے سامنے کوئی رُستم نہ کوئی سہراب...... کرگسانِ باطل کے لیے وہ ایک عقاب...... خطیبِ مایہ ناز، بارگاہِ حق میں اُس کے الفاظ باریاب...... اِس پر گواہ خدا کی آخری کتاب۔

صدیقؓ کا جانشین، وہ امیر المؤمنین، بیت المال کا امین، اُس کے پاس ہر وقت پائی پائی کا حساب...... آپ اپنا محتسب، اُس کی عمال پر نظر، اپنے اعمال پر نظر، ہر لحظہ زیرِ احتساب۔

اُس کی سپاہ بے پناہ، چھا گئی مثالِ آب...... اُس کی سلطنت بے پایاں، بے حساب...... اُس نے ختم کر دیا قیصر و کسریٰ کا رُعب داب...... اُس کے گدا کیقباد و افراسیاب...... اُس کا عہد، عہدِ اسلام کا شباب...... اُس کی حکومت، استحکامِ انقلاب!

پیوند لگے کپڑے عزیز، مُسترد اطلس و کمخواب...... اُس کی غذا سُوکھی روٹی اور پیالۂ آب...... عُسرتوں میں وہ شاداب...... اُس کی نگاہ میں ہیچ عشرتوں کے سُراب...... اس کی اِک نِگاہ سے دِل کی کھیتیاں سیراب...... اُس کا ذکر کارِ ثواب...... اُس کی راہ، راہِ صواب...... اُس کی سیرت، اہلِ حق کا نصاب۔

اُس کا ہر شرف، بس شرفِ انتخاب...... اُس کی عظمتیں کہاں ہر کسی کو دستیاب...... اُس کے نام سے پہلے نامِ صدیقؓ ہی کا باب...... اُس کے مشیر شیرِ خدا، بُوترابؓ...... اُس کی عزت، عزتِ رسالت مآبﷺ...... وہ نبی کا رفیق، انہی کے پاس محوِ خواب...... کافی ہے اس کے لیے، یہ قولِ آنجنابﷺ:

''میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتے''

(مجیب الرحمٰن شامی، اردو ڈائجسٹ)

عثمان ابنِ عفان رضی اللہ عنہ (خاکہ)

عثمان ابنِ عفانؓ...... پیکرِ شرم و حیا، بندۂ تسلیم و رضا، صاحبِ جُود و سخا، ایک اوّلیں مسلمان...... اُس کی بھیڑیں بے شمار، اُس کے اونٹ قطار اندر قطار، وُہ سب سے بڑا سرمایہ دار، اُس کا سرمایہ، اسلام کا سائبان...... اُس کی تجارت عاقبت کا سامان۔ اُس کی دولت، اہلِ فقر پر مہربان، اُن کی ہر مشکل آسان۔

کوتاہ قامت نہ طویل القامت، قد پر موزونیت قربان..... بھورے اور گھنے بال، نازک خدو خال، داڑھی گھنی اور لمبی، رنگ گندمی، پیشانی چوڑی، شانے کُشادہ، سینہ چوڑا، گوشت سے بھرا، چہرہ روشن مثالِ کہکشاں۔ جیسے ابراہیمؑ بلند مرتبت، عالی شان..... حُسن اُس پر نازاں، چاند اُس پر قربان۔

اُس کی عزّت، دُخترانِ نبیؐ، اُس کا گھر ساتواں آسمان..... کسی اور کی کہاں یہ شان، اصحابِ نبیؐ کے درمیان.....اس کی صُورت، صُورتِ ایمان، اس کی سیرت، ایمان کی ترجمان۔

وہ سفیرِ آقائے دو جہاں.....اس کی جان، رسولِ خداؐ کو عزیز از جان..... اس کا ہاتھ نبیؐ کا ہاتھ، وہ باعثِ بیعتِ رضوان..... اُس کی بخشش پر گواہ خود رسُولِ آخرالزمانؐ ..... اُس کا چناؤ، جمہوریت کا نشان.....اُس کی خلافت، جمہور کی ترجمان.....اس کا نام، سب کے نوکِ زبان..... اُس کے حامی کاروان در کاروان..... اُس کی حکومت مادرِ مہربان..... اُس کے لشکر مرگِ دُشمنان.....اس کا پرچم شام تا خراسان.....اس کا عہد، کثرتوں، عشرتوں کا سامان.....اس پر عفو و درگزر حیران.....اس کے مقابل اشخاصِ بدگمان ـــــ

وہ اُٹھا کہ اُٹھا اتّحاد کا نشان.....اُس کے بعد، منتشر مسلمان..... اس کی شہادت، مظلومیت کا عنوان، فتنہ ہائے نو کا سامان.....اُس کے خُون سے رنگین حرم کی داستان.....دورانِ تلاوت لی اُس کی جان۔ یہ قہر الحفیظ، والامان۔

وہ جامع القرآن ـــــ قاری نظر آتا تھا، حقیقت میں تھا قرآن.....آیۂ سورۂ رحمٰن ـــــ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ! (مجیب الرحمٰن شامی، اردو ڈائجسٹ)

......☆......

ادبیاتِ افضل حق

قیامت پر یقین

چھٹی جماعت میں پہنچ کر قدرے اطمینان کا سانس نصیب ہوا۔ مار پیٹ کا قاعدہ تو یہاں بھی جاری تھا۔ لیکن ایک دن کے قصور پر مہینہ بھر سزا نہ ملتی تھی۔۔ اسی سن میں صبح کے وقت کانگڑہ کا قیامت خیز زلزلہ آیا۔ جس نے پنجاب بھر کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا۔ کچھ عرصہ تو سب نے

سمجھا کہ قیامت آ گئی۔ مائیں بچوں کو گھروں میں چھوڑ کر جان بچانے کھلی جگہ کی طرف بھاگیں۔ تا کہ عمارتوں میں دب کر نہ رہ جائیں۔ نفسانفسی کا وہ عالم تھا کہ بجز اپنی ذات کے کسی کو کسی کا خیال نہ رہا۔ مجھے گھبراہٹ میں والدہ کی آواز سنائی دی۔ کہ چوک میں چلے جاؤ میں اور میرا بڑا بھائی فضل حق مرحوم دونوں سر پر پاؤں رکھ کر گلی کے چوک کی طرف بھاگے۔ ہمارے پہنچتے پہنچتے وہاں اچھا خاصا ہجوم ہو چکا تھا۔ سب کے چہروں کی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سب خدا کا رحم مانگتے تھے۔ ناگاہ محلہ کی مسجد کا ملا بھاگا بھاگا آیا۔ اس نے آتے ہی اذان کہنا شروع کر دی۔ پھر کیا تھا خورد اور بزرگ کانوں میں انگلیاں دے کر اذانیں دیتے تھے۔ اور خوف سے ادھر ادھر دوڑتے تھے کسی کو زندگی کا یقین نہ تھا۔ ان میں ایک مادرزاد برہنہ حسین عورت باحال پریشان کانوں میں انگلیاں دے کر "لوکو" اللہ اکبر وے "لوکو" اللہ اکبر کہتی سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر بھاگتی پھرتی تھی۔ برہنگی کی طرف میں تو اب اشارہ کر رہا ہوں۔ اس پریشانی میں کسی کو کچھ ہوش نہ تھا۔ ننگے اور لباس والے برابر تھے۔ چند منٹ کے بعد لوگوں نے محسوس کیا کہ جھٹکے بند ہو گئے۔ تب جان میں جان اور دماغ میں عقل آئی۔ مردوں نے تعجب سے برہنہ بی بی کو دیکھا عورت کو اچانک اپنی برہنگی کا احساس ہوا۔ وہ ہائے ہائے کہتی پس و پیش ہاتھ رکھ کر بھاگی۔ شریروں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ لیکن خدا کا غضب قریب سمجھ کر نظریں جھکا لیں۔ ایک دو دن گزرے وہ نوجوان اور حسین عورت اہل محلہ کا مذاق بن گئی۔ عورتیں اس کے پاس سے گزرتیں تو چڑانے کے لئے کان میں انگلیاں دے کر دے "لوکو" اللہ اکبر وے "لوکو" اللہ اکبر کہنا شروع کر دیتیں۔

اس واقعہ کے بعد قیامت اور اس کی تفصیلات پر مجھے کبھی شبہ نہیں ہوا۔ (میرا افسانہ)

تفتیش جرائم

دیوتائے عشق کی کارفرمائی کے باعث میرے پڑوس میں زہر خورانی کا ایک کیس ہو گیا۔ ایک عاشق قلاش محبوب کی فرمائش کو پورا کرنے کے لئے دردر مارا پھرا کہ کہیں کچھ قرض مل جائے۔ کسی نے عشق کا راستہ آسان کرنے میں اس کی مدد نہ کی۔ لاچار نوجوان نے اپنی بوڑھی پھوپھی کو دھتورہ سے بے ہوش کیا۔ نقدی اور زیورات اڑا کر دیوی کے بھینٹ کیے۔ معاملہ بہت صاف تھا۔ عاشق حزیں کو جلد ہی محبت کا روایتی زیور یعنی زنجیر پہنا کر اس منزل محبوب یعنی جیل میں پہنچا دیا گیا۔

اس مقدمہ سے فارغ ہوا ہی تھا۔ آدھی رات مخبری ہوئی کہ بردہ فروشوں کا ایک گروہ ایک خالی بنگلہ میں شب باش ہے۔ اس کے ہمراہ اغوا شدہ عورتیں ہیں۔ اسی وقت پولیس کی جمعیت کو ساتھ لیا اور بندوق سنبھال کر چل دیا۔ تلاش کرنے پر دیکھا کہ ایک حسینہ جس کا جسم چاندنی سے میلا ہوتا تھا۔ فرش خاک پر سو رہی ہے اور دو مشٹنڈے پہلو میں پڑے ہیں۔ تحکمانہ لہجہ میں انہیں جگایا وہ ڈراؤنے خواب کی طرح چونک اٹھے۔ نکیرین کو سامنے دیکھ کر گھبرائے۔ میں نے کہا چلو یوم حساب آ گیا۔ وہ اٹھے، ہم انہیں ہمراہ لے کر تھانہ میں آ گئے۔ تینوں بھائی بہن کا رشتہ بتاتے تھے۔

میں نے کہا عورت کو ان سے الگ کر کے بٹھاؤ تاکہ ان کا جادو اترے تو میں اپنا سحر پھونکوں۔ مردوں کو حوالات بند کر دیا گیا۔ عورت کو پہرہ دار کی نگرانی میں بٹھا کر میں سو گیا۔ صبح اٹھا تو معلوم ہوا کہ عورت پر پہرہ دار سپاہی نے ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے تھے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ عصمت دری کی نوبت نہ پہنچی ورنہ سپاہی کے گناہ پر افسر بھی غفلت کے الزام میں دھر لیا جاتا۔ ہیڈ کانسٹیبل تفتیش نے کہا کہ عورت کو کبھی ایک کانسٹیبل کی نگرانی میں نہ چھوڑنا چاہئے۔ مرد اور عورت کی تنہائی یوں بھی فتنہ خیز ہوتی ہے پھر آوارہ عورتوں کو ادنیٰ ملازمین کے سپرد کر کے ان کی سلامتی کی کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

ہیڈ کانسٹیبل اور سپاہی صبح سے لے کر شام تک عورت سے سر کھپاتے رہے۔ مگر اس نے کوئی بات مان کر نہ دی۔ مردوں کو بھائی بتاتی رہی۔ اگرچہ میں تفتیشِ جرائم میں نو آموز تھا۔ لیکن واقعات شاہد عادل تھے کہ عورت مغویہ ہے۔ ورنہ اجڑی کوٹھی میں شب باشی کے کوئی معنی نہ تھے۔ تھانہ کا عملہ تجربہ کار ضرور تھا لیکن وہ اپنے تجربے کے باہر نہ جا سکتا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبل اس بات کے قائل ہو چکے تھے کہ اغوا کا معاملہ نہیں۔ غریب راہ گیروں نے کہیں ٹھکانہ نہ پا کر خالی کوٹھی کو رہن بسیرا بنا لیا ہوگا۔

میں نے بڑے یقین سے تفتیش سارجنٹ کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ کی ابتدائی نصیحتوں کو میں نے دل میں جگہ دی ہے۔ لیکن میں کچھ کالا علم بھی جانتا ہوں۔ کان میں وہ افسوں پھونکوں گا کہ عورت مینا کی طرح بولے گی۔ اس نے کہا حضور اگر کام منتر جنتر سے چل جائے تو دردسری کیوں کی جائے۔ میں اٹھا عورت کے کان میں اتنی بات کی کہ کنوارا ہوں۔ تمہارا ان سے پیچھا چھوٹ

جائے تو میرے گھر کی رانی بن کر رہو۔ سب نے دیکھا کہ جادو چل گیا۔ عورت کے چہرے پر رونق اور آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس نے ذرا اونچی آواز سے کہا کہ یہ تو مجھے بھگا کر لائے ہیں۔ اب معاملہ صاف ہو گیا۔ سب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ نے عورت سے کیا کہا۔ میں نے کہا اصل کہانی یوں معلوم ہوتی ہے کہ حسین عورت غریب کی جورو بن گئی ہے۔ محلات کا خواب دیکھنے والی عورت جب جھونپڑی میں رہنے پر مجبور ہو جائے تو وہ اسے قید بلا سمجھ کر آزادی حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اغوا کرنے والے ان ہی موقعوں اور گھرانوں کے متلاشی رہتے ہیں۔ وہ موقعہ مناسب دیکھ کر اس کے حسن کی تعریف کرتے ہیں۔ اور گھر کی غربت پر آنسو بہاتے ہیں۔ اور باتوں باتوں میں کہہ دیتے ہیں کہ اگر تمہارا حسن کوئی جوہری دیکھ پائے تو تمہیں نور محل بنائے۔ چنانچہ وہ جھونپڑی میں رہ کر محلات کے خواب دیکھنا شروع کر دیتی ہے اور ان خوشگوار خوابوں کی حسین تعبیر کے لئے گھر سے نکل کھڑی ہوتی ہے۔ میں نے شادی کا چکمہ دے کر دیرینہ آرزوؤں کی تکمیل کر دی۔ اب وہ چھم چھم کرتی تھانے میں ادھر ادھر آزادی سے پھرنے لگی۔ حسن کے ساتھ تمکنت آ گئی۔ وہ چھوٹے درجہ کے آدمیوں سے بڑے درجہ کی عورتوں کی طرح متانت سے گفتگو کرنے لگی تھی۔

اگلے روز عدالت میں چالان پیش کرنا تھا۔ اس نے کپڑے بدلے۔ کاجل آنکھوں میں ڈالا۔ بازار میں نور برساتی چلی اور اس شان سے کمرہ عدالت میں پہنچی کہ مجسٹریٹ نے قلم ہاتھ سے رکھ کر اور عینک کو آنکھوں سے ہٹا کر بے ساختہ منہ سے کہا "ارے!"

وہ چراغ رخ زیبا لے کر دنیا کی بے انصافیوں سے پناہ نہ پا کر عدالت کے اندھیرے میں انصاف ڈھونڈنے آئی تھی۔ حسن کی خاموش تصویر کی طرح زبان بے زبانی سے داستان درد بیان کر رہی تھی۔ کہ میں گوہر شب چراغ تھی۔ مزدور کے گھر میں رہ کر خاک میں مل گئی۔ غربت نے خاوند کے لئے دنیا اندھیر کر رکھی تھی۔ اسے میری طرف روزمرہ کی بدحالی کے باعث نظر اٹھا کر دیکھنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ میں نظر التفات سے محروم گھر سے نکل آئی۔ اب بازار کی جنس ہوں اور سرمایہ کے ہاتھ کی میل پر بک سکتی ہوں۔

ہر شہر کے بازار حسن میں بیسوائیں یہی دردناک داستان بیان کر رہی ہیں کہ کس طرح سونے چاندی کی جھلک پر مزدوروں کے گھروں سے حسن سرمست ہو کر نکلتا ہے۔ پھر عمر بھر رسوائے

بازار رہتا ہے۔ اس روز عدالت نے تاریخ دے دی۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ ملزم سابقہ سزا یافتہ ہیں یا نہیں۔ مجھے ایک اور سرکاری کام کے لئے باہر جانا پڑا۔ میری غیر حاضری میں ملزم سزا پا گئے۔ مجھے امید تھی کہ عورت وارثوں کو واپس کر دی گئی ہوگی۔ مگر معلوم ہوا کہ تھانے کا عملہ بالعموم بردہ فروشی کا کام سرانجام دے لیتا ہے۔ عورت ان ہی کی وساطت سے گاؤ خورد ہوگئی۔

عشق کا بھوت

انہی دنوں میں نماز صبح سے فارغ ہو کر بیٹھا ہوا تھا کہ علی الصبح ایک مقامی گورنمنٹ سکول سے بوڑھا ٹیچر آیا۔ ان صاحب کو میں اکثر کورٹ انسپکٹر کے پاس دیکھتا۔ ہمارے کورٹ انسپکٹر زندہ دل بوڑھے بزرگ تھے۔ ماسٹر مذکور آتے ہی میرے پاؤں پڑ گیا۔ اور زار و قطار رونے لگا۔ قبل اس کے کہ میں کچھ پوچھوں اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ میں حیران تھا یہ کیا ماجرا ہے؟ تردد سے پوچھا کہ صاحب ماجرا کیا ہے۔ کہا کہ تمہارے بچانے سے بچ سکتا ہوں۔ میں سمجھا کہ شاید کوئی قتل کر آیا ہے۔ داستانِ غم عشق کا ماجرا نکلا۔ معلوم ہوا کہ کسی شعلہ رُو آوارہ مزاج عورت سے راہ چلتے ماسٹر جی کا دل مل گیا اور راستے گلی میں ہی رضامند ہو گئے۔ ماسٹر جی جوالا مکھی کو گھر لے آئے' گھر کی زمین جاگ اٹھی۔ صحن پرنور چھا گیا۔ اس بدوضع اور بخیل کے گھر میں پری آ گئی۔ اسے شیشے میں اتارنے کے لئے وہ ہن برسانے لگا۔ حسن لباس اور زیورات سے نکھرتا ہے۔ قیمتی ساڑھیاں اور عمدہ زیورات مہیا کیے۔ سات روز میں ڈھائی ہزار خرچ اٹھا۔ وہ گھر والی بن کر بیٹھ گئی۔ یہ خوشی خوشی لڑکے پڑھانے مدرسہ چلے گئے۔ پیچھے وہ تین ہزار روپیہ نقد لے کر دروازے چوپٹ چھوڑ کر چلی گئی۔ ماسٹر جی آئے تو مسٹریس ندارد۔ بھاگے لپکے' ادھر ادھر گئے' آخر عورت کا سراغ پا لیا۔ اس کے متعلق معلوم ہوا کہ اسی طرح وہ کئی ایک کو بدھو بنا چکی تھی' ماسٹر جی اس کا آخری شکار تھے۔

میں نے کہا اچھا پرچہ دلاتا ہوں۔ وہ پھر پاؤں پڑ گیا کہ عورت دلاؤ۔ کچھ کرامات کر دکھاؤ میں ہنس پڑا اور کہا کہ میں کراماتی نہیں۔ وہ پھر پاؤں پکڑ کر زار زار رونے لگا اور کہنے لگا خدا کے لئے مجھے وہ تعویذ دو۔ میں نے تعجب سے پوچھا کہ وہ کون سا تعویذ۔ اس نے کہا جو کورٹ انسپکٹر کو بتلایا تھا۔ میں نے حافظہ پر زور دیا تو یاد آیا کہ میاں بیوی کی لڑائی میں کچھ اناپ شناپ تحریر بہ طور تعویذ ایک شخص نے کسی کو دی تھی اور اتفاق سے وہ معاملہ بھی سلجھ گیا تھا۔ یہ واقعہ میں نے کورٹ انسپکٹر صاحب سے

بھی ذکر کیا تھا۔

میں نے ہزار کہا کہ میں تعویذ کا قائل ہوں نہ دیتا ہوں۔ مگر وہ نہ مانا۔ بلکہ اس سے زیادہ اصرار کرنے لگا۔ میں نے مجبور ہو کر ایک تعویذ لکھ دیا۔ وہ دعائیں دیتا چلا گیا۔ اس تعویذ کے بھروسے پر سیدھا اس عورت کے گاؤں میں گیا۔ اتفاق کی بات کہ وہ گھر میں تنہا تھی۔ عاشق نے ایک آبدار خنجر اس کے حضور میں پیش کر کے کہا یا مجھے قتل کر یا جینے کی امید دلا۔ ماسٹر جی اس تعویذ کے بل بوتے پر یہ شاعری کر چکا تو عورت نے بلائیں لیں۔ خنجر لے کر صندوق میں رکھ لیا اور اچانک پلٹ کر ماسٹر کے گلے میں اسی کی پگڑی ڈال لی۔ چور چور کے شور سے محلہ سر پر اٹھا لیا۔

پگڑی گلے ڈالنے پر تو ماسٹر محبوب کا غمزہ سمجھا۔ جب عورت نے قیامت اٹھالی تو ماسٹر کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ جو آیا اس نے داڑھی کھینچی اور لٹھ برسایا۔ ماسٹر کو ایسا کوٹا پیٹا کہ محبت کا سبق بھول گیا۔ توبہ توبہ کرنے لگا۔ عشق کی راہ میں چوٹیں اتنی کھائیں کہ زمین پر لوٹنی کھا کر گر گیا۔ لوگ گڈے پر ڈال کر ماسٹر جی کو تھانے لے آئے۔ جب انہیں ہوش آیا تو اپنے آپ کو سب انسپکٹر تھانہ ساہیوال کے سامنے پایا۔ سب انسپکٹر بھی اتفاق سے اسے کورٹ انسپکٹر کے ہاں دیکھ چکا تھا۔ کیفیت پوچھی تو اس نے تنہائی میں بات کہی کہ چوہدری افضل حق کا تعویذ لے کر آیا تھا۔ شاید تعویذ ذرا تیز ہو گیا بات بنتے بگڑ گئی۔

جاہل پیر ایسے ہی گدھوں کی کمائی پر بسر اوقات کرتے ہیں۔ کم بخت اتنا پٹ کر بھی اسے تعویذ کی تیزی سمجھتا ہے۔ سارا معاملہ خراب ہونے پر بھی بات بنتے بنتے بگڑ گئی کہتا ہے۔

اس زمانہ میں سب انسپکٹر خدا کا مظہر سمجھا جاتا تھا۔ اس نے تیور بدلے اور ماسٹر کو پکڑ لانے والوں کے لیے حکم دیا کہ ان کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دو۔ یہ بدمعاش عورتوں کے رکھوالے ہیں۔ وہ اپنے خیال میں کار سرکار کر کے آئے تھے۔ نمازوں کی بخشش کے عوض روزے ان کے گلے پڑے۔ عاجزی کرنے لگے۔ (میرا افسانہ)

استعفیٰ کے بعد

اگرچہ میں نالائق افسر نہ تھا تاہم انگریزی ملازمت کی ایک ایک ساعت میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ استعفا دیا تو بوجھ ہلکا ہوا۔ میں ان دنوں لدھیانہ تھانہ صدر میں تعینات تھا۔ اسی

جگہ میرا کامیاب لیکچر ہوا۔ جب ہاتھ لٹکا تا گھر پہنچا تو گاؤں کے لوگوں نے میری حرکت پر تعجب کیا۔ کچھ لوگوں نے میرے اچانک استعفا کو میری بے وقوفی پر محمول کیا۔ اس آگ کا علم نہ تھا جو مدت سے میرے سینے میں سلگتی تھی۔ میں ان کی سرگوشیوں سے بے پرواہ تھا۔ گاؤں کے لوگ مجھ سے ڈرتے تھے۔ مبادا وہ بھی کہیں میرے ساتھ ہی سرکار کے غصہ کا شکار نہ ہو جائیں۔ میں نے بدکے ہوئے جانور کی طرح انہیں آہستہ آہستہ رام کرنا شروع کیا۔ گڑھ شنکر میں پہلے حکام اور اہل دیہہ میں شدید بلوہ ہو چکا تھا۔ جس میں جانبین کو اندیشہ تھا کہ میری سرگرمیاں ایک دن پھر خون کی ہولی کا باعث ہو جائیں گی۔ مجھے کام کی مشکلات صاف نظر آتی تھیں۔ گورنمنٹ کے خلاف ایجی ٹیشن مسلمان پبلک کے لئے اچنبھا بات تھی۔ میں مشکلات کو آسان کرنے کا حل سوچ رہا تھا کہ ہوشیار پور سے لیکچر کی دعوت وصول ہوئی۔ مجھے خود ضرورت تھی کہ ہوشیار پور کے آزاد خیال لوگوں سے تعارف حاصل کروں اس دعوت کو غنیمت سمجھ کر ہوشیار پور چلا گیا۔ ایک بیرسٹر کی صدارت میں تقریر کی' چھتوں اور مکانوں پر بھی آدمی بیٹھے تھے۔ ایک شکستہ مکان کی چھوٹی اینٹیں نیچے گر گئیں۔ ایک آدمی کے لگیں اس نے واویلا مچایا۔ حادثہ جلیانوالہ کے ڈرے ہوئے لوگوں نے سمجھا کہ شاید گولی آ لگی۔ ہر طرف سے شور اٹھا کہ مشین گن چل گئی۔ کوئی نہیں سوچتا کہ مشین گن آئی کہاں سے' عام بھاگڑ پڑ گئی۔ بھاگ دوڑ میں قیامت کا نقشہ سامنے آ گیا۔ صدر صاحب کو بھی یقین ہو گیا کہ فی الواقع ان کے گرد و پیش گولوں کی بارش ہو رہی ہے۔ گرمی کے دن تھے وہ ململ کا کرتہ پہن کر آئے ہوئے تھے۔ مشین گن کی مدافعت میں اکتاری ململ کا کرتہ سامنے کر دیا۔ تاکہ سینہ چھلنی ہونے سے بچا رہے۔ یہ بیرسٹر کی دماغی کیفیت کا حال تھا عوام کا کیا کہنا۔ دو آدمیوں نے گولیوں سے بچاؤ کے لئے اندھے کنوئیں میں کود کر بزعم خود جان بچائی۔ کئی ایک روندے گئے اور سخت زخمی ہوئے۔ ایک صاحب زمین پر پڑے ہوئے خدا رسول کا واسطہ دے کر فرماتے تھے جانے والو میرا منہ کعبے کی طرف کرتے جاؤ۔ ایک اور بیرسٹر صاحب ہلکی سی دھوتی پہن کر آئے ہوئے تھے۔ بھاگ دوڑ میں کسی کا پاؤں دھوتی سے الجھ گیا۔ دھوتی وہیں رہ گئی۔ آپ عالم سراسیمگی میں پس و پیش سے برہنہ اپنے خیال میں جان بچائے بھاگے جا رہے تھے۔ کہیں وسط بازار میں احساس برہنگی ہوا۔ آگے پیچھے ہاتھ رکھ کر گھبرائے ہوئے ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتے گھر میں داخل ہوئے۔ سینکڑوں بوٹ' جوتے'

پگڑیاں، دھوتیاں، وہیں رہ گئیں۔ حکام ضلع اور پولیس کو بڑی خوشی ہوئی۔ عوام الناس ندامت سے مرے جاتے تھے۔

اس واقعہ کے بعد میں نے پورے جوش سے دیہات میں کام کرنا شروع کر دیا۔ میرے کام میں کوئی ہاتھ بٹانے والا نہ تھا۔ جلسہ عام کرنے کا خیال ہوا۔ مگر منادی کون کرے۔ ناچار خود ہی کنستر لے کر اپنی صدارت میں اپنی تقریر کا اعلان کرنا پڑا۔ میں خود ہی دریاں سر پر اٹھا کر لاتا اور خود ہی میز کرسی لگاتا۔ اب لوگوں کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اول تو بہت کم لوگ یہ تماشا دیکھنے آئے اور جو آئے وہ دری پر بیٹھنے کے بجائے آس پاس کی حویلیوں میں گھس کر پابند پردہ بیبیوں کی طرح دروازے کے دراڑوں میں سے دیکھنے لگے کہ کیا ہوتا ہے۔ سامعین میں سے کوئی نہ ہونے کے باوجود میں نے گورنمنٹ کے خلاف اناپ شناپ کہنا شروع کر دیا۔ جب کوئی داد دینے والا نہ ہو کوئی کب تک گلا پھاڑتا رہے۔ جلدی ہی میں اس سعی مشکور سے باز آیا اور دریاں سر پر اٹھا کر گھر لے گیا۔ میں اپنی ناکامی سے بڑا اجز بز ہوا۔ آخر میرے ایک دوست نے جواب حکومت کا ذمہ دار عہدہ دار ہے۔ مذاق میں سمجھایا کہ راجپوت تو تیرا ''رعب'' مانیں گے نہیں۔ بہتر ہے کہ پھر جلسہ کا اعلان کرو اور گاؤں کے جولاہوں پر رعب جما کر زبردستی جلسے کی رونق بڑھاؤ۔ لوگ ایک دفعہ لیکچر سن گئے تو جھجک خوف جاتا رہے گا۔ میں نے فوراً اس کارگر تدبیر پر عمل کیا۔ اور کچھ کامیابی ہوئی۔ اب میں دس پانچ جولاہوں کو پکڑ کر دری پر بٹھاتا تھا اور ان کو لیکچر سناتا تھا۔ ایک دن گاؤں کا ایک سکھ لیکچر سن گیا اور مجھے اپنے گاؤں آنے کی دعوت دے گیا۔ دوسرے دن ان کے گاؤں گیا سکھوں میں عجیب زندگی دیکھی۔ ہر طرف لوگ دوڑے بھاگے پھرنے لگے کہ جس نے تھانے داری چھوڑی تھی وہ آ گیا ہے۔ آدھ گھنٹہ کے اندر اندر تمام سکھ مرد و زن جمع ہو گئے۔ گاؤں کے مسلمان ہاتھوں میں حقے لیے اردگرد کی مردانہ حویلیوں کی آدم قد چار دیواری سے اونٹ کی طرح گردن اٹھا کر دیکھنے لگے۔ میں نے تقریر شروع کی۔ مجھے یوں معلوم ہوا کہ سامعین کے جسم میں جوش کی لہر دوڑ رہی ہے۔ تقریر ختم کی تو سب نے واہ جی واہ کہی اور دور تک چھوڑنے آئے۔ اس روز سے کوئی دن ایسا نہ تھا جب سکھوں کے گاؤں سے لیکچر کا بلاوا نہ آتا تھا۔ مجھے سکھوں کی سیاسی استعداد پر تعجب ہوا۔ اور مسلمانوں کی بے حسی کو دیکھ کر طبیعت نہایت پریشان ہوئی۔ ایسی بے حس اکثریت ملک کے فوری

مقاصد کے لئے تباہ کن ہے اس لئے میں نے ساری توجہ مسلمانوں کی طرف دی۔ اس کے بعد گڑھ شنکر سے آبادی میں دوسرے درجہ پر ایک گاؤں ہے وہاں تقریر کرنے کے لئے چل دیا۔ وہاں بھی میں گورنمنٹ کا باغی قرار دیا گیا بڑا مایوس لوٹا۔ پھر خدا نے ایک ساتھی ملا دیا۔ یہ شخص اپنی انتہائی سادگی کے باعث ایک زن بازاری پر اپنی متاع قربان کر چکا تھا اور تنگ دستی کے باعث عشق سے مستعفی ہو گیا تھا۔ دو دیوانوں کی خوب گزرنے لگی۔ بعض متدین لوگوں نے اس کی ہمراہی پر اعتراض کیا۔ میں نے کہا نیک لوگ نیکی کے کام میں شرکت نہ کریں تو ایسے لوگوں کی شمولیت کیوں غنیمت نہ سمجھوں۔ جیسا نکما میں گورو ہوں ویسا مجھے چیلا مل گیا۔ جب آپ جیسے نیک لوگ خدمت خلق کے عزم سے اٹھیں گے تو ہم جیسے لوگ اصلاح کر لیں گے یا میدان چھوڑ جائیں گے۔

گڑھ شنکر سے ۱۰ میل کے فاصلہ پر ایک اور مسلمانوں کے گاؤں میں گئے۔ میرے نام کی شہرت وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ جو ملا اس نے عزت کی اور سب نے مشورہ دیا کہ مسجد خدا کا گھر ہے وہاں آپ چل کر نماز ادا کریں۔ ہم کھانا بھی وہیں پہنچاتے ہیں اور لوگوں کو بھی جمع کر کے لاتے ہیں۔ میں اور میرا یہ ہمراہی دونوں نے مسجد میں ڈیرا لگایا۔ یہ مسجد شہر سے باہر تھی۔ ہم متعجب ہوئے کہ شہر کے باہر اس اجڑی مسجد میں جلسہ کا انتظام لوگوں نے کیوں پسند کیا۔ نماز عشاء پڑھ کر گاؤں کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ مشرق کے روایتی عاشق کی طرح لوگوں کے انتظار میں گھڑیاں قیامت کر کے کاٹنے لگے۔ بھوک نے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد دلانا شروع کی مگر نہ کوئی کھانا لایا اور نہ خود ہی آیا۔ رات بارہ بجے عقل نے عقدہ کشائی کی کہ لوگوں نے اپنے مکان پر ٹھہرانے کی ذمہ داری سے بچنے کے لئے ناگہانی آفت کو خدا کے گھر کی راہنمائی کی تھی۔ اب ہم صبر کا گھونٹ پی کر اٹھے اور گھر کا راستہ لیا۔ ساری راہ ساتھی اصرار کرتا رہا کہ مجھے بھی تقریر کا موقع دو میں نے کہا اس میں تکلف کیا ہے۔ صبح محرم کی دسویں ہے کربلا میں صف بچھا کر بیٹھ جائیں گے۔ جو دو چار راہ گیر ہنستے چڑھ جائیں انہیں لیکچر سنا دینا۔ چنانچہ ہم بھی دوسرے روز تعزیہ داروں کے پاس ہی اڈا جما کر بیٹھ گئے۔ خالی صف دیکھ کر دس بیس تھکے ہوئے آدمی آ بیٹھے۔ میں نے اشارہ کیا کہ اس موقعہ کو غنیمت جانو۔ بس اٹھ کر تقریر شروع کر دو۔ وہ جھٹ کھڑا ہو گیا۔ اور پکار کر کہا۔ بھائیو! سنو! کچھ اور لوگ متوجہ ہو گئے۔ پھر بولا۔ بھائیو! سنو! اور دیہاتی بھی کھڑے ہو گئے کہ شاید مداری ہے تماشا کرے گا۔ پھر اس

نے کہا۔ بھائیو! سنو! میں نے جھنجھلا کر کہا کچھ آگے بھی بکو۔ اس نے پھر کہا۔ بھائیو! سنو! میں نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا وہ اس مختصر سے مجمع کے رعب سے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ کچھ سوچتا تھا مگر کہہ نہ سکتا تھا۔ اب معاملہ سمجھ کر میں نے دل بڑھایا کہ شاباش شروع کر و اس نے تھوڑی دیر حواس درست کر کے کہا:

بھائیو! ''امام حسینؓ کربلا کے میدان میں لیٹے ہوئے تھے'' وہ یہ کہہ کر پھر خاموش ہو گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے مجھے مخاطب کیا اور کہا۔ ''افضلا! پھر اودھی چھاتی تے کون چڑھیا ہو یا سی اوئے'' (اب اس کی چھاتی پر کون چڑھا ہوا تھا)

میرے منہ سے نکلا شمر۔

اس نے کہا ''ہاں ہاں شمر۔ ایسا کر کے بھائیو۔ اس کی چھاتی پر سوار تھا۔

مقرر کا رنگ زرد تھا۔ اپنی طرف سے دریا بہانے کی سعی کرتا تھا۔ لیکن ''ایسا کر کے بھائیو'' سے زیادہ جو اس کا تکیہ کلام تھا کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ آخر اس نے پلٹ کر کہا۔

''اے بھئی افضلا! میرا زور لگ چکا۔ اب تو اٹھ''

مجمع نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ جس کو سن کر لوگوں کا اور ہجوم ارد گرد جمع ہو گیا۔ ساتھی تو زور آزمائی کر کے شرمندہ سا ہو کر بیٹھ گیا۔ میری موقعہ شناس عقل نے کہا کہ ایسا مجمع کہاں سے لائے گا۔ میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ سب کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ لوگ غالباً اس امید پر بیٹھ گئے کہ میں پہلے مقرر سے بہتر دل لگی کا سامان بہم پہنچاؤں گا سب انسپکٹر پولیس اور تحصیلدار جو میلہ میں پھرتے تھے۔ زیادہ مجمع دیکھ کر ادھر آ گئے میں نے تقریر شروع کر دی واقعات کو درد انگیز لفظوں میں دہرایا۔ یہ واقعہ جذبات کی دنیا میں تلاطم پیدا کر دیتا ہے۔ لوگ ڈھاڑیں مار کر رونے لگے۔ تحصیلدار اور تھانیدار کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

طبیعت نے کہا کہ لوگوں کے دل سے حکام کا خوف دور کرنے کا یہ بہترین موقعہ ہے۔ اس لئے میں نے تقریر کا پہلو بدل کر کہا کہ جس طرح ظالموں نے امام مظلوم کو شہید کیا۔ اس طرح حکومت کے موجودہ وزراء نیکی کو ذبح کر رہے ہیں۔ اس مختصر کلام کو میں نے بہت طول دیا۔ طبیعت روانی پر تھی۔ لفظ دماغ سے چھن چھن کر آتے تھے' مجمع مسحور تھا۔

لوگوں کو ڈر تھا کہ میں ابھی باندھ لیا جاؤں گا۔ میں نے جلسہ برخاست کرا دیا۔ حوالدار تحصیلدار کھسیانے ہو کر چلے گئے۔ اور لوگوں نے میری جرأت کی داد دی۔ جرأت کی داد سے انسان خود ہی جری ہو جاتا ہے۔ مجھے امید ہوگئی کہ اب میری بات سنی جایا کرے گی۔ اس تقریر نے نہ صرف لوگوں پر جادو کیا۔ بلکہ میری حوصلہ مندی کی دھاک بٹھادی۔ بہادری وہ جوہر ہے جس کا اقرار دشمن کو بھی کرنا پڑتا ہے۔ ہر کہ ومہ کی زبان پر یہ فقرہ جاری ہو گیا کہ ''آدمی نڈر ہے''۔ غلام ملک میں یہ خصوصیت پیدا کرنا ہی آزادی حاصل کرنا ہے۔ ڈرپوک لوگ ہی غلام رہ سکتے ہیں۔ خوف وہراس کا علاج بھی جرأت کا کارنامہ اور رجز خوانی ہے۔ ایک جرأت دلانے اور ابھارنے والا فقرہ کام کر جاتا ہے۔ فوج کے اکھڑے ہوئے قدم جم جاتے ہیں۔ قوموں کی قسمت پلٹ جاتی ہے اور ملکوں کی تاریخ تبدیل ہو جاتی ہے۔ (میرا افسانہ)

......☆......

اس زمانہ میں مسلمانوں پر سب سے زیادہ صوفیاء کا اثر تھا۔ میں اپنے علاقہ کے گدی نشینوں کی خدمت میں حاضر ہوا کہ اسلام مظلوم ہو گیا ہے۔ مظلوم کی دم قدم سے مدد آپ پر لازمی ہے۔ اول تو میری حاضری سے انگریز کے خوف کے باعث کسی پر سکرات کا عالم اور کسی پر حبس دم کی کیفیت طاری ہوگئی۔ کسی کی زبان جاری ہوئی قلب کی حرکت بند ہوگئی۔ میں نے ہزار عرض کیا کہ دعا کے ساتھ دوا بھی فرمائیں کہ مریض اچھا ہو۔ بعض نے بڑی رازداری سے یقین دلایا کہ انگریز کی تباہی کے مسودہ پر سب ولیوں' نبیوں کے دستخط ہو چکے۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستخط باقی ہیں۔ تم جان کو تکلیف میں نہ ڈالو۔ صبح یا شام یہ کام ہوا ہی چاہتا ہے۔ میں نے ہر چند سرکارِ مدینہ کی تمام زندگی کے روشن ورق پیش کیے کہ میدان میں اترے بغیر کامرانی کا تاج پہنایا نہ جائے گا۔ جواب ملا میاں تم شریعت کی باتیں کرتے ہو طریقت کے نور کو نہیں سمجھتے۔ (میرا افسانہ)

دو اور دوستوں کا حال معلوم ہوا کہ گھر میں خدا کا دیا بہت کچھ تھا۔ مگر چشم دنیا دار گھر میں شاہانہ ٹھاٹھ دیکھنے کی متمنی تھی۔ کسی صاحب ضرورت نے انہیں تسخیر حیات کا چکمہ دے کر ان سے مالی امداد حاصل کی۔ اور ایسے سبز باغ دکھائے کہ باوجود اہل حدیث ہونے کے دونوں الگ الگ قبرستان میں ۴۰ رات چلہ کاٹنے پر آمادہ ہو گئے۔ رات کے آدھے بجے بستر سے اٹھ کر قبرستان کی

سنسان اور ویران جگہ پر جانا جنون سے کم نہیں۔ لیکن ضرورت مند دیوانہ ہو جاتا ہے۔ نامناسب موسم کے باعث کئی راتیں بارش میں کاٹیں اور مینہ سے بھیگے ہوئے پرندے کی طرح سکڑ سمٹ کر وقت کاٹا۔ مصیبت کے پہاڑ اٹھا کر ۴۰ راتیں پوری کیں۔ اب ان کے خیال میں صبح امید طلوع ہونے والی تھی انہیں بتایا گیا تھا کہ چالیسویں رات کے بعد وظیفہ ختم کر کے منہ اندھیرے قبرستان سے نکلنا اور جو پہلا شخص تمہیں ملے گا وہ تمہارا موکل جن ہوگا وہ تمہارے تابع فرمان تمہاری حسب منشا بادشاہوں کے محلات میں داخل ہو کر خوبصورت شہزادیوں کو اٹھا لایا کرے گا۔ وہ رات بھر میں تمہارے لئے عالیشان قصر تیار کر دے گا۔ دنیا کے سارے خزانے سمیٹ لائے گا۔

ان میں سے ایک وظیفہ کو ختم کر کے خوشی خوشی قبرستان سے نکلا۔ دیکھا کہ ایک دھوبی کپڑوں کی گٹھڑی لے کر نہر پر جا رہا ہے معاً خیال آیا کہ یہی میرا جن ہے جو دھوبی کے بھیس میں ہے لپک کر اس کے پیچھے ہولیا۔ بے وقت قبرستان سے برآمد ہونے پر اس سے دھوبی ڈرا اور گٹھڑی جوتا وہیں چھوڑ کر بھاگا۔ ٹھہرنا ٹھہرنا کہتے یہ پیچھے پیچھے...... بچانا بچانا پکارتا دھوبی آگے آگے۔ دونوں کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ دھوبی بیچارا قبرستان کے اس جن سے پناہ پانے کے لئے پاس کے گاؤں میں پہنچا۔ جہاں اس کی بہن بیاہی ہوئی تھی۔ وہ گاؤں میں داخل ہوتے ہی پکارا بہن جنت دروازہ جلدی کھولو۔ لوگو! مجھے بچاؤ۔ تمام گھروں کے مرد لینا لینا کر کے گھروں سے نکل آئے۔ عورتوں نے ڈر کے مارے بچوں کو چھاتی سے لگا لیا کہ جانے کیا آفت آئی ہے۔

لوگوں نے دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ اس دھوبی کو جن بتاتا تھا اور دھوبی اسے قبرستان کا بھوت کہتا تھا۔ بڑا معرکہ آن پڑا تھا۔ دھوبی کو سب جانتے تھے۔ اس کی بہن جنت اپنے بھائی سے لپٹ کر میرا بھائی، میرا بھائی کہہ کر دھوبی کی کہانی کی تصدیق کرتی تھی۔ ادھر یہ شکل اور لباس سے بڑے معزز تھے۔ ان کو جھٹلانا بھی آسان کام نہ تھا۔ گاؤں کے داناؤں نے آخر فیصلہ دیا کہ دونوں ڈر گئے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے متعلق انہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہمارے عزیز دوست نے جلدی سے وہاں سے رخصت لی مبادا کوئی پوچھ بیٹھے کہ تمہاری کہانی کیا ہے۔

اب دوسرے دوست کی سرگزشت سنئے۔ وہ قبرستان سے نکلے تو ان کو ایک آوارہ مزاج نوجوان سے مڈبھیڑ ہوئی۔ یہ صبح سویرے انہیں اپنا جن سمجھ کر آواز دینے لگے کہ ٹھہر جا۔ وہ سمجھا کہ

پولیس افسر مجھے للکار رہا ہے۔ وہ گھر سے ناراض ہو کر نکلا تھا۔ پولیس کے ہتھے چڑھ جانے کے خوف سے وہ بھاگا۔ جن کے متلاشی نے کہا۔ میں نے تیرے لئے اتنی تکلیف اٹھائی ہے تو بھاگ رہا ہے۔ نوجوان رکا اور پلٹ کر کہنے لگا۔ تھانیدار صاحب میں نے کوئی چوری تو نہیں کی۔ میں ماں باپ سے ضرور ناراض ہو کر نکلا ہوں۔ لیکن بھائی کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ لاہور سیکرٹریٹ میں ملازم ہے۔ تاہم انہیں یقین تھا کہ یہ ضرور جن ہے اور لڑکے کو یقین تھا کہ یہ تھانیدار ہے۔ دونوں لاہور سیکرٹریٹ میں پہنچے۔ مزدور نوجوان کے بھائی نے اسے خوش آمدید کہا۔ فرضی پولیس افسر کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے زحمت اٹھائی۔ یہ ناکام و نامراد گھر آئے۔ اسی روز دونوں ناکام دوست اس امید پر ایک دوسرے سے ملے کہ شاید دوسرے کا چلہ کامیاب رہا ہو۔ جب دونوں ایک دوسرے کے حال سے آگاہ ہوئے تو خفت مٹانے کے لئے ہنسنے لگے۔ (ایضاً)

ادبیاتِ شورش کاشمیریؒ

چند دینی شخصیات کے چہرے

ابوالکلام آزادؒ

''میرا خیال ہے جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے مولانا ابوالکلام آزاد سے میری عقیدت کا رشتہ استوار ہے اور اس میں کبھی کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ میں نے راہنماؤں میں سب سے زیادہ محبت انہی سے کی ہے۔ قید خانے میں مجھ سے یوسف مہر علی نے پوچھا اگر تمہیں راہنماؤں میں سے ایک رہنما منتخب کرنے کیلئے کہا جائے اور کتابوں میں سے کوئی ایک کتاب' تو تم کس کا انتخاب کرو گے؟ میں نے لحظہ توقف کیے بغیر جواباً کہا تھا: ''رہنماؤں میں ابوالکلام آزاد ار کتابوں میں ''ترجمان القرآن''! میری زندگی ان دونوں سے متاثر ہے اور میں نے قلم وزبان کے سیاسی سفر میں جو کچھ بھی حاصل کیا وہ انہی کی بدولت ہے۔''

مجھے اپنی بست سالہ سیاسی زندگی میں ہر مکتبِ خیال کے رہنما کی معیت میں کچھ عرصہ رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ بعضوں کو میں نے نزدیک سے دیکھا ہے اور بعض کو قریب سے سنا ہے۔ لیکن ابوالکلام آزاد سب میں آگے اور سب سے الگ ہیں۔ اُن کی بات چیت اتنی شستہ ورفتہ ہوتی ہے کہ کوثر و تسنیم کی لہریں نچھاور ہوتی ہیں۔ اور لہجہ اتنا پیارا کہ الفاظ اس کی تاثیر بیان کرنے سے معذور ہیں۔ وہ واقعی ابوالکلام ہیں' جو کچھ بولتے اور جو کچھ لکھتے ہیں اس سے انسان کا ذہن پرسش کی طرف نہیں بلکہ پرستش کی طرف جاتا ہے وہ الفاظ کو رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں الوہیت کا جامہ پہناتے ہیں۔

حالات سازگار ہوتے تو وہ جمہوریہ ہندوستان کے پہلے صدر ہوتے۔ لیکن اب وہ کوثر و تسنیم کی ایک ایسی لہر ہیں جو گنگ و جمن کی لہروں کے ساتھ بہہ رہی ہے۔ عربوں میں ہوتے تو ابن تیمیہ ہوتے، ہندوؤں میں ہوتے تو اب تک اُن کے بت بکتے ہوتے لیکن وہ مسلمانوں میں تھے اس لئے ان کے حصے میں وہ سب کچھ نہیں آیا ہے جس سے علمائے امت کی جبینیں لبریز ہیں۔

مسلمانوں میں جتنی گالیاں ابوالکلام کو دی گئی ہیں، غالباً تاریخِ انسانی میں اتنی گالیاں کسی اور کو نہیں ملی ہیں۔ لیکن ان سب معرکوں میں اُن کا ایک جواب تھا:

> ''میرے بھائی! کوئی انسان خواہ وہ کسی درجے میں کیوں نہ ہو، گالی دے کر اپنی عزت میں اضافہ نہیں کر سکتا ہے۔ البتہ احوال کا جو نقشہ ہے آپ انہیں موسمی ہوائیں سمجھئے جو بہر حال گزر جاتی ہیں۔''

اور پھر اس کے بعد ایک آہ سرد جو ہونٹوں تک آکر رک جاتی ہے۔

قامت میانہ، بدن اکہرا، رنگ سرخ و سپید آنکھیں...... اس عمر میں بھی آہوانِ صحرا دیکھ لیں تو چوکڑی بھول جائیں۔ نجیب الطرفین، ذات سیّد، پیشہ وزارت، ان کا مجسمہ بے نیازی کی تصویر، انجمن آرائیوں سے محترز، خلوت آرائیوں کا شیدائی، خطابت میں یگانہ، صحافت میں منفرد، سیاست میں یکتا، عالم متبحر زبردست مجتہد، حسن چہرہ میں ہو یا آواز میں، اس کی دِل پذیری پر جی جان سے فدا۔

دماغ یورپی، طبیعت عجمی، دل عربی، وجود ہندوستانی، مزاج کے اعتبار سے تانا شاہ، یعنی ان کے قالین پر بال ہو اور وہ ان کو چھو جائے یا آپ کی آواز میں حُسن نہ ہو اور آپ الفاظ کی نوک پلک کا خیال کیے بغیر ان کے سامنے بولنے لگیں تو انہیں فوراً نزلہ ہونے لگتا ہے۔ آپ ان کی ایک آدھ کروٹ ہی سے محسوس کر لیں گے۔ کہ اُن کی طبیعت منغض ہو گئی ہے۔ ان کے سامنے بولنا بڑے جی گردے کا کام ہے۔ وہ بولتے ہیں کہ آبشار کی طرح بہتے ہیں۔

ابوالکلام ابوالکلام نہ ہوتے تو تاج محل ہوتے اور اگر تاج محل انسانی پیکر میں ڈھل جائے تو وہ ہر گز ہر گز ابوالکلام نہیں ہو سکتا ہے۔

آفاقہا گردیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

......☆......

مولانا حسین احمد مدنیؒ

بعض یادوں کے ساتھ بعض تصویریں بھی دھندلا گئی ہیں۔ یقین مانیے اس وقت چشم تصور میں مولانا مدنی کی تصویر نہیں آ رہی ہے' لیکن دل پر اب بھی ان کی بڑائی کا نقش کھدا ہوا ہے۔

مولانا محمد الیاس دہلویؒ نے جو اہل اللہ میں سے تھے ایک دفعہ آپ کے سیاسی اشغال پر کہا تھا:

''حسین احمد تمہاری سیاست میری سمجھ میں نہیں آتی ہے' سمجھ میں آتی تو میں تمہارے ساتھ شب و روز چکر کاٹتا...... لیکن تمہاری مخالفت بھی نہیں کرتا کیوں کہ مجھے تمہارے دینی مرتبہ کا علم ہے۔ اور تمہاری مخالفت کر کے میں جہنم کی آگ نہیں خریدنا چاہتا۔''

کہتے ہیں مولانا محمود حسن شیخ الہندؒ کی بوقلموں خوبیاں قدرت نے ان کے چار شاگردوں کو بانٹ دی تھیں:

''حدیث کا علم علامہ انور شاہؒ کے حصہ میں آیا تھا۔ قرآن کا علم مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو ملا تھا۔ سیاسیات کے فہم میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور ایثار و عمل میں مولانا حسین احمد مدنیؒ ان کے جانشیں تھے۔''

مولانا مدنی واقعی ان لوگوں میں سے ہیں جن سے فقر و استغناء کا بوریہ قائم ہے یا جن سے شہنشہی کی جبینوں پر خراش آتی ہے!

مسلم لیگ نے ہندوستانی سیاسیات میں جن لوگوں کو اپنے قہر و غضب کا شکار بنایا اور مختلف الاصل ملاحیوں سے نوازا' ان میں مولانا حسین احمد صاحب مدنی سرفہرست تھے۔ آج ہمارے سیاسی فرماں رواؤں کو ''جن نذر ہاتھوں'' سے گلہ ہے۔ وہ بہت پہلے مولانا کی داڑھی تک پہنچ چکے ہیں۔ مگر کسی مرحلے میں بھی انہوں نے اُف نہیں کی۔ البتہ حضرت شیخ عبدالقادر رائے پوریؒ نے ایک گفتگو میں کہا تھا:

''مسلمانوں نے حسین احمدؒ اور ابوالکلامؒ سے سب و شتم کا جو برتاؤ کیا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہیں حسین احمدؒ کا تقویٰ اور ابوالکلامؒ کا صبر انہیں لے نہ ڈوبے۔''

اور انسان ان سانحات سے ایک گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے کہ جن ہستیوں کو مسلمانوں نے ان کی موت کے بعد دین کے معاملے میں مستند تسلیم کیا۔ ان کی زندگی میں انہیں بُری طرح خوار کیا۔ بلکہ انہیں رسوائی کا تماشا بنانے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی!

مولانا حسین احمد مدنی کے ذاتی عقیدت منداس برصغیر کے ہر گوشے میں موجود ہیں۔ ہر وہ طالب علم جو دیوبند کا فارغ التحصیل اور آج کسی نہ کسی مسجد کا پیش امام یا کسی نہ کسی عربی مدرسہ میں استاد ہے'ان کا ارادت کیش ہے۔

مسلم لیگ کے زمانۂ عروج میں جمعیۃ العلماء کے وجود کا نوے فیصد حصہ مولانا ہی کے ذاتی حلقہ بگوشوں کا مرہونِ منت تھا۔ اُن کا نام تحریک پاکستان کی طرح ہندوستان کے ہر قریے میں موجود تھا۔ سہلٹ سے لے کر خیبر تک کے دیہات میں اُن کے شاگرد موجود تھے۔ اوران کی بدولت ان کا نام بھی لیا جاتا تھا۔ وہ کوئی بڑے سیاستداں نہ تھے۔ انہوں نے انگریز دشمنی کا جذبہ ورثہ میں پایا تھا۔ اُن کا وجود ۱۸۵۷ء کے علماء کی بغاوت کا مظہر تھا۔ وہ گھنٹوں بے تکان بولتے چلے جاتے تھے' لیکن کوئی عظیم خطیب نہ تھے۔ ان کا احترام محض ان کے دینی وجود کی وجہ سے تھا۔ لوگ انہیں مالٹا کے اسیر کی حیثیت سے جانتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ اس شخص نے سالہا سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضے کی جالی کے پاس بیٹھ کر حدیث کا سبق پڑھایا ہے۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ وہ (شاہ جی) دیوبند میں میٹھی نیند سو رہے تھے کہ فجر کی اذان ہوگئی۔ وہ بدستور سوئے رہے۔ اتنے میں کسی نے پاؤں دابنے شروع کیے۔ ہاتھوں کی ملائمت سے غنودگی تیز ہوتی گئی۔ تھوڑی دیر بعد پلٹ کر دیکھا تو مولانا مدنی پاؤں داب رہے تھے۔ شاہ جی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

''حضرت آپ گنہگار کر رہے ہیں......!!''

''شاہ جی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا آپ کو جگا لوں لیکن پھر خیال آیا' آپ تھکے ہوئے ہیں۔ یہی مناسب سمجھا کہ پاؤں دابوں' تھکاوٹ دور ہوگی' آنکھ کھلے گی تو ممکن ہے نماز قضا نہ ہو۔''

اور یہ تھے حسین احمد مدنی' ہندوستان میں اسلاف کی آخری صدا!

مفتی محمد شفیعؒ

دیوبند کے دور افتادہ قافلہ کا سرخیل' قد کوتاہ نہ دراز' سرتاپا پاکباز' گمشدہ زمانوں کے راست باز علماء کی ایک جیتی جاگتی تصویر' قرنِ اول کی سادگی کا نمونہ' طبیعت میں حلم' مزاج میں علم'

مزاج میں انکسار، زبان میں شیرینی، ادب و دین کا مرقع، حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ کا مرید لیکن درباری نہ سرکاری، علم کا رسیا، قرآن کا شیدا، حدیث کا شائق، فقہ کا نباض، بیان میں پیچ نہ قلم میں خم، فقید المثال اساتذہ کا شاگرد اور نامور شاگردوں کا استاد، چہرہ مہرہ شرافت کی دستاویز، کم سخن و کم آمیز، دل خوفِ غیراللہ سے خالی، دماغ غور و فکر کا خزینہ، عیب بینی اور نکتہ چینی سے بیزار، دوستوں کی چوٹوں سے جی خوش کرنے والا اور دشمنوں کے وار کو ہنسی خوشی سہہ جانے والا، مرنجاں مرنج، آنکھوں میں علم و حیا کا رنگ و نور، عمر کہولت کی منزل میں زندگی چشمہ صافی، بے شمار دینی رسائل کا مؤلف، احتشام الحق مولانا یہ مفتی، شیخ سے رشتے کی ہمرنگی کے باوجود دونوں میں زمین و آسمان کا فرق، مولانا احتشام الحق شاہ یہ فقیر، وہ غنچۂ لب بستہ یہ کھلا ہوا پھول، وہ تھانے دار یہ خاکسار، عاجزی مسلک، انکساری مشرب، محبت ان کا طغریٰ ہے، اخلاص ان کا امتیاز، رسول اللہ کے عشق میں ڈوب کر اپنے آپ کو کھو دینے والا، ایک درخشندہ چہرہ جو اس یقین کے ساتھ جی رہا ہے کہ اپنی ہر سانس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کے روبرو جواب دہ ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

مجھے خوشی ہے کہ میں نے شاہ جی کے ساتھ اپنی زندگی کا ایک حصہ بسر کیا ہے۔ ان کی شخصیت اُن یونانی فلسفیوں سے ملتی جلتی ہے، جن کی تصویریں عجائب خانوں میں عہدِ عتیق کے انسانی خدوخال پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ایک امریکی فلم پروڈیوسر نے ان کی تصویر دیکھ کر کہا تھا۔ ہالی وڈ کے فلم سازوں کو مسیح مقدس کی تصویر کے لئے اس سے بہتر چہرہ نہیں مل سکتا۔

ان کی شخصیت کا سراپا ہندوستانی مسلمانوں کا شاندار ماضی ہے۔ وہ کچھ بھی ہیں، ماضی ہی کی گونج ہیں۔ ہندوستان میں عوامی خطابت کے اعتبار سے اُردو زبان نے آج تک اتنا بڑا خطیب پیدا نہیں کیا۔ وہ کہا کرتے ہیں: ''میں لوگوں کی نگاہ سے مضامین چنتا ہوں'' انہیں دیس دیس کی بولی آتی ہے۔ وہ مقامی بولیوں میں بھی اسی ٹھاٹھ سے تقریر کر سکتے ہیں جو ان کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ انہیں کمال حاصل ہے کہ وہ مجمع کی رنگا رنگی کو اکائی میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ انہیں ہزاروں شعر ان گنت ضرب الامثال، بے شمار محاورے اور سینکڑوں تمثیلات زبانی یاد ہیں۔ وہ ایک عظیم خطیب، ایک عظیم انسان اور ایک عظیم بذلہ سنج ہیں۔ ان تینوں کو یکجا کریں تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے۔ وہ راس کماری سے لے کر سری نگر تک اور خیبر سے لے کر کلکتہ تک شعلے بکھیرتے

پھرے ہیں۔انہوں نے ایک وقت میں دس دس گھنٹہ تک لوگوں کو اپنی طلاقت لسانی سے مسحور کیے رکھا ہے اور کئی بار چارپائی پر لیٹ کر تقریر کی ہے وہ کسی نامور مدرسے کے فارغ التحصیل نہیں لیکن ان کے ہاتھ پر علامہ انور شاہ (کشمیری) نوراللہ مرقدہٗ بیعت ہو چکے ہیں اور بڑی بڑی فضیلتوں نے انہیں خراج ادا کیا ہے......اُن کی دل پسند چیزیں دو ہیں' آواز خوش اور چہرہَ خوش۔اُن کی چال خدی خوانوں کی سی ہے اور ان کا چلن ہر عیب سے خالی' وہ سونا نہیں کندن ہیں۔دراز قامت' دوہرا بدن' گول چہرہ' سفید داڑھی' ظالم آنکھیں' طوفانی لہجہ' کوندے تو بجلی' کڑکے تو بادل' اٹھے تو آندھی! دوستوں کے دوست' بلکہ جگری دوست' دشمنوں کے شریف دشمن' لیکن مدت کے بچھڑے ہوئے بغل گیر ہوں تو شہید گنج کا ملبہ بھی بھول جاتے ہیں۔الغرض وہ سمجھنے کی نہیں' پیار کرنے کی چیز ہیں۔

ان (شاہ جیؒ) کے لہجے میں سختی تھی درشتی نہیں' غصہ تھا انتقام نہیں......ان کے ہاں ہر سخن کی ترازو تھی اُن کے الفاظ تُل کر نکلتے تھے ان کے ہاں طنز تھا سخت قسم کا طنز لیکن سب وشتم نہیں جن چیزوں سے نفور تھے ان سے تمسخر بھی روا رکھتے۔

کالی داس نے عورت کے روپ کی تصویر کھینچتے ہوئے کائنات کی جن تصوری اور نظری خوب صورتیوں کو یکجا کیا ہے ان تمام خوبصورتیوں کا مرقع شاہ جیؒ کی خطابت تھی' رعد کی گونج' بادل کی گرج' ہوا کا فرّاٹا' فضا کا سناٹا' صبح کا اجالا' چاندنی کا جھالا' ریشم کی جھلملاہٹ' ہوا کی سرسراہٹ' گلاب کی مہک' سبزے کی لہک' آبشار کا بہاؤ' شاخوں کا جھکاؤ' طوفان کی کڑک' سمندروں کا خروش' پہاڑوں کی سنجیدگی' صبا کی چال' اوس کا نم' چنبیلی کا پیراہن' تلوار کا لہجہ' بانسری کی دھن' عشق کا بانکپن' حُسن کا اغماض اور کہکشاں کی مسجع و مقفع عبارتیں انسانی آواز میں ڈھلتے ہی خطابت کی جو صورتیں اختیار کرتی ہیں اس کا جیتا جاگتا مرقع شاہ جیؒ تھے۔

متفرقاتِ شورش

آتش کدۂ خیال میں حسرتوں کی چنگاریاں

ہم لوگوں پر جیسے مسرت کا دور ہی نہیں آیا لڑکپن اسکول میں گزرا ذرا جوان ہوئے جوان بھی کہاں؟ پس جوانی کی سرحد کو تاکنا شروع کیا تھا کہ جیل کا پھاٹک کھل گیا تقریباً ساڑھے دس سال

اس فرات کا پانی پیتے رہے نتیجۃً لڑکپن نے اپنی عنان بڑھاپے کو سونپ دی۔ جوانی بیچ میں سے اس طرح چھٹ گئی جس طرح کوئی نازنین پہلو چھڑا کر نکل جائے اور آتش کدہ خیال میں حسرتوں کی چنگاریاں رہ جائیں۔'' (پس دیوارِ زنداں)

خورشید.........!

''ثریا اور مسعود چلے گئے میں جین مندر کے پاس کھڑا سوچتا رہا محبت حد بیان سے ماوریٰ ہے اس وقت اور ابھی اندوہ گیں ہو جاتی ہے جب ادھوری رہ جائے...... خورشید جیسی لڑکیاں عشق کی معراج ہوتی ہیں اس نے مجھ سے بے پناہ محبت کی تھی حتیٰ کہ فنا ہو گئی خود بوئے گل تھی اپنے پیچھے نالۂ دل چھوڑ گئی۔ اس شمع کی یاد ہر اداس رات کو جگمگا اٹھتی ہے وہ ایک ناکام محبت تھی؟ اصلاً وہی کامیاب رہی اس نے جان دے کر وفا کی آبرو رکھی...... میرے سامنے اس وقت بھی اس کی تصویر ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ میرے ساتھ شملہ پہاڑیوں کی ٹہنیوں کے سائے میں بیٹھی ہوئی وفا کا عہد کر رہی ہے لارنس گارڈن کی شاخوں میں اس کی مسکراہٹیں ابھی تک پھول بن کر کھلی ہوئی ہیں شاہی مسجد کے میناروں کی سلیں اس کے سرخ رخساروں کی آگ سے دہک رہی ہیں راوی اس کے گیت الاپ رہا ہے بارہ دری نے اس کی گمشدہ یادوں کے تصور سے پریشان ہو کر اپنا سر جھکا لیا ہے وہ لوٹ سکتی تو اس کو ضرور منا لاتا عورت جلد ہی من جاتی ہے وہ تاخیر سے روٹھتی اور تعجیل سے منتی ہے لیکن اسے موت کھا گئی زندہ ہو سکتی تو میں اسے ضرور پوچھتا خورشید کیوں روٹھ گئی ہو، چلی آؤ گھڑی دو گھڑی ہی کے لئے آ جاؤ، ناراضی کی وجہ؟ اچھا میں اب بازی گروں کے اس ناٹک میں نہیں...... لیکن یہ الفاظ کی میناکاری ہے کبھی لفظوں نے بھی موت کا رخ موڑا ہے کبھی نوحے بھی مشیت کے فیصلوں کو بدلنے پر قادر ہوئے ہیں انسان کے آنسوؤں میں جان ہار کے لئے آب حیات کی ایک بوند بھی نہیں۔''

(بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغ محفل)

شہنشاہ جہانگیر اور صاحب جمال

''شہنشاہ اکبر کی داستانہائے نشاط سے تاریخ بھری پڑی ہے، وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے مینا بازار لگوایا' مینا بازار کا تصور ترکستان سے مستعار تھا ہر مہینے کی تیسری تاریخ کو قلعہ معلیٰ میں بازار

لگتا۔ اس کو خوش روز بھی کہتے تھے۔ تمام اہتمام امرائے سلطنت کی عورتوں کے سپرد ہوتا...... جہانگیر نے بزمانہ شہزادگی مینا بازار ہی میں نواب زین خان بہادر کی بیٹی صاحب جمال کو دل دیا تھا۔ مینا بازار کے انگوری پارک سے گزر رہا تھا ایک خادمہ نے عرض کیا۔ صاحب عالم! آپ کو بادشاہ سلامت یاد فرماتے ہیں۔ شہزادہ کے ہاتھ میں کبوتروں کا جوڑا تھا صاحب جمال سامنے سے آ رہی تھی، اس سے کہا لو ذرا ہمارے کبوتر تھامنا، ہم ابھی آتے ہیں۔

واپس آئے تو صاحب جمال کے ہاتھ میں ایک ہی کبوتر تھا، پوچھا:

'دوسرا کبوتر کیا ہوا؟'

'صاحب عالم وہ تو اڑ گیا'

'کیسے'

صاحب جمال نے دوسرا کبوتر بھی چھوڑ دیا اور کہا:

صاحب عالم۔ ''یوں''

اس ''یوں'' پر جہانگیر لٹو ہو گیا بالآخر صاحب جمال اس کے عقد میں آ گئی لاہور کے سیکرٹریٹ میں انارکلی کا جو مقبرہ ہے وہ دراصل اسی صاحب جمال کا ہے۔ بعض افسانہ نگاروں نے کبوتروں کے واقعہ کو نور جہاں سے منسوب کیا ہے جو غلط ہے، اسی طرح انارکلی کا تمام واقعہ بھی فرضی ہے۔'' (اس بازار میں)

''اس بازار'' کی جھلکیاں

ممتاز ''چھوئی موئی'' ہے اس کا رنگ کھلتا ہوا گندمی ہے، وہ طوائف ہونے کے باوجود مرد سے نفرت کرتی ہے۔ اس کا محبوب مشغلہ سگریٹ کے مرغولوں میں لطائف گھڑنا ہے، وہ رات کا دیپک ہے لیکن دن میں اس کا چہرہ ایک سپنا سا محسوس ہوتا ہے اس کی زبان کترنی کی طرح چلتی ہے۔ ہوا میں گرہ لگانا اور پانی پر لکیر کھینچنا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے اس نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی ہے، اپنے پیشے سے باہر کے واقعات کو جانچ تول لیتی ہے بلا کی ذہین ہے، بذلہ سنج ہے، طناز ہے، موقع محل سے شعر پڑھ لیتی ہے، فقرہ باز ہے اس کو الفاظ مسخ کرنے اور ذومعنی جملے کہنے میں کمال حاصل ہے، گاتی بھی خوب ہے لیکن ناچتی نہیں، اس کا خیال ہے ناچنا ہر عورت کے بس کی چیز نہیں اور

وہ بے بس ہے اس کی رائے میں عورت محبت کرنے کی چیز ہے' سمجھنے کی نہیں اور مرد سمجھنے کی چیز ہے محبت کرنے کی نہیں' وہ کسی مرد کو بھی محبت کے قابل نہیں سمجھتی' اس کا لہجہ خواندہ ہونے کے باوجود کبھی کبھار کرخت ہو جاتا ہے لیکن جب وہ چٹکی لیتی ہے تو ایک دفعہ رونی سے رونی صورت بھی مسکرا اٹھتی ہے''۔

(اس بازار میں)

''شہناز نے دور آئینہ پر ایک نظر ڈالی اس کی لم چھڑی آنکھوں میں ان کہے خیالوں کی بتیاں جھلملا رہی تھیں' ادھر دائرہ بنا ادھر ہاتھوں کے گجرے حرکت میں آ گئے' بوٹی بوٹی تھرکنے لگی'...... اس کا ناچ تیز ہوتا گیا' اس کی دھنیں پھیلتی گئیں اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا' اس کی ادائیں نکھرتی گئیں' اس کے پھول کھلتے گئے' اس کے شعلے ٹوٹتے گئے' اس کا روپ سوا ہوتا گیا۔ اس کی جوانی کا الاؤ بھڑکتا گیا' کبھی لہروں کی طرح بڑھی' کبھی پنکھڑیوں کی طرح سمٹی' کبھی خوشبو کی طرح پھیلی' کبھی بجلی کی طرح کوندی' کبھی مینا کی طرح چھلکی' کبھی ساغر کی طرح کھنکی' کبھی گلاب کی طرح مہکی' کبھی بلبل کی طرح چہکی' کبھی گھٹاؤں کی طرح اٹھتی' کبھی میکدے کو نکل گئی' کبھی بتکدے کو آ گئی' کبھی آغوش بن گئی' کبھی امنگوں میں گھلنے لگی اور کبھی رنگوں کا پیکر بن گئی...... لیکن جیسے جیسے وہ ناچتی گئی' اس کا ہر زاویہ سوال بنتا گیا...... فرشتوں کا زہر خند...... قدرت کا نوحہ۔''

شاہوں اور گداؤں میں فرق

''انسان فانی ہے' موت اٹل ہے' زندگی کو دوام نہیں جو پیدا ہوا ہے موت کا مسافر ہے یہ اونچے اونچے محل' یہ دولت کے انبار' یہ جاہ و جلال' یہ شوکت و صولت' یہ دولت و طاقت' یہ شکوہ و دبدبہ' یہ ہمہمہ اور طنطنہ' یہ معرکے اور تسخیریں' یہ اپنی خدائی منوانے کی دھن' یہ نخوت و غرور یہ کبر و توانائی' یہ جاہ و منصب' یہ رعونت و خشونت' یہ کجکلاہی' یہ تخت شاہی' یہ تاج خسروی' غرض انسان کا سارا گھمنڈ اور اس کے مظاہر و آثار ٹکر ٹکر دیکھتے رہ جاتے ہیں' موت آواز دیتی ہے تو انسان بے بس ہو جاتا ہے کسی کو اس سے مفر نہیں' افسوس کہ سامان عبرت بہت ہے اور عبرت پذیری بہت کم۔

قبرستانوں میں چلے جایئے کیسے کیسے لوگ ابدی نیند سو رہے ہیں نہ ان کی پختہ قبریں کام آتی ہیں نہ قد آور کتبے' نہ سنگ مرمر کے چبوترے' نہ سنگی چھتریاں' نہ پھول' نہ سبزہ' نہ کلیاں نہ اعزہ و اقربا کا شیون' نہ خطاب نہ القاب نہ وہ ساز و سامان جو پیچھے چھوڑ گئے ہیں' کیا کام آتا ہے بظاہر وہ نیکیاں'

وہ کارنامے جو عوام کے دلوں پر نقش ہو گئے ہیں۔ بباطن اپنے خالق سے لگائی ہوئی لو...... لاہور ہی کو لیجئے یہاں ایک بادشاہ سو رہا ہے' نورالدین جہانگیر' ایک ملکہ سو رہی ہے...... نور جہاں' ایک شہزادی محو خواب ہے...... زیب النساء' صوبہ کا ایک گورنر بھی سو رہا ہے...... آصف جاہ' زندگی میں ان کے جاہ و جلال کا یہ عالم تھا کہ ''ظل الٰہی'' اور ''عالم پناہ'' کہلاتے تھے اب یہی ظل الٰہی دعا کے محتاج ہیں' یہی عالم پناہ خود پناہ کے طلب گار ہیں۔ نور جہاں زندہ تھی تو قلعہ کی ایک دیوار پر ایک گڈریئے کی نگاہ اس کی موت کا نوشتہ ہو گئی لیکن آج یہی ملکہ ویرانے میں پڑی ہے۔ مزار سیر و تفریح کی چوپال ہے...... اس کے برعکس بھاٹی دروازے سے ذرا آگے ایک فقیر سو رہا ہے علی ہجویری گنج بخش...... اس فقیر کے آستانے پر ہر روز کتنے ہزار لوگ ارادت کی جبین لے کر حاضر ہوتے ہیں دعائیں مانگتے' فاتحہ پڑھتے اور خشیت الٰہی سے اپنے دلوں کو معمور کرتے ہیں...... اس کی زندگی جہانگیر اور نور جہاں کی موت سے صدیوں پہلے اپنا دینوی سفر ختم کر چکی ہے لیکن صدیاں گزر جانے کے باوجود اس کے آستانے کی شہنشاہیت جوں کی توں ہے۔ زمانے کی کوئی سی گردش اور وقت کا ادنیٰ سا تغیر بھی اس کو ہلا نہیں سکتا پھر کیا وجہ ہے کہ انسان تاریخ سے فائدہ نہیں اٹھاتا' موت سے سبق نہیں لیتا بلکہ ان کھلی نشانیوں کے باوجود اس کے اندر سرکشی نسلاً چلی آ رہی ہے' تاریخ کا قافلہ اسی طرح چل رہا ہے...... نہ ظالموں میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے نہ مظلوموں کا نالۂ شب تاب رکتا ہے' قدرت کا احسان جاری ہے' وہ عجلت یا طیش میں آ کر سزا نہیں دیتی بلکہ اس انداز میں سزا دیتی ہے جیسے یہ بھی سورج کے طلوع و غروب ہونے کا ایک سلسلہ ہے...... لیکن دلوں پر جب تالے لگ جاتے ہیں تو پھر جن کے ہاتھ میں عصا ہوتا ہے اور جیب میں سونا' وہ قبر کی شب ہائے دراز کو اپنی احمقانہ غفلت کے حوالے کر دیتے ہیں''۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۴ر ستمبر ۱۹۶۷ء)

جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

''میگھ راج ایک دھان پان نوجوان تھا۔ رنگ گیہوں کے خوشوں کی طرح صاف' گلا نورانی' قامت پستہ اور منحنی' آنکھیں روشن اور متحرک' ماتھا کشادہ' ناک ستواں بڑا ہی خوش اخلاق اور خوش اطوار...... قدرت نے اس کی آواز میں جادو بھرا تھا...... وہ خود بھی غمگین تھا اور اس کی آواز سے بھی آنسوؤں کا ترشح ہوتا تھا۔ عموماً بیدم کی یہ غزل گاتا۔

وہ چلے جھٹک کے دامن مرے دست ناتواں سے
اس دن کا آسرا تھا مجھے مرگ ناگہاں سے

یا پھر میں اس سے یہ گوایا کرتا ۔

وہ حرف راز جو مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں

ایک روز اس نے ڈاکٹر سے چھٹی لی اور بارک میں لیٹ کر ہلکے ہلکے سروں میں گاتا رہا ۔

فرقت میں زندگی مجھے اپنی اکھر گئی
اے مرگ ناگہاں تو کہاں جا کے مرگئی

اس کے گالوں پر آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے تھے۔ میں نے پوچھا میگھ راج! کیا ہو گیا ہے؟ ٹالنے کے لئے ہنسا لیکن آنسو رخساروں پر بے حروف عبارتیں چھوڑ چکے تھے۔ میں نے اپنے استفسار پر اصرار کیا تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ٹپ ٹپ آنسو! آنسو ہی آنسو! آخر اس نے اپنا غم کہہ ڈالا اپنی بیس سالہ بیوی ساوتری اور اپنی کم سن بچی شکنتلا کی یاد میں اشکبار تھا میں نے اس کی سزایابی کا سبب پوچھا پہلے تو ہچکچایا پھر...... مجھے اپنا ایک مخلص دوست سمجھتے ہوئے بیان کیا کہ اس نے اپنی بہن کو قتل کیا ہے دونوں بہن بھائی ماں باپ کی تنہا یادگار تھے...... بہن عمر میں تین چار سال چھوٹی تھی۔ عمر بھر اسے ماں باپ کی لاج سمجھا' پڑھایا لکھوایا اب اس فکر میں تھا کہ اچھا سا بر ملے تو رخصت کر دے مگر یہ راستہ میں بھٹک گئی...... معاً کانوں میں بھنک پڑی کہ پارو نوجوان مہنت کا شکار ہو گئی ہے میگھ نے پیچھا کیا...... مندر کے عقب میں بوہڑ کا درخت تھا اس کی اوٹ میں مہنت اور پارو پیار کا مطلع اٹھا رہے تھے کہ میگھ نے چاقو سے حملہ کر دیا پارو نے آگے ہو کر وار روکا لیکن اتنے میں چاقو اپنا کام کر چکا تھا۔ پارو...... ڈھیر ہو گئی' مہنت دو چار زخم کھا کے بھاگ نکلا...... مقدمہ چلا میگھ کو تین برس قید کی سزا ہوئی...... قاعدہ کے مطابق جیل سے اپیل کی ...... کوئی چار ماہ بعد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل نے مجھے کہا...... جاؤ اس کو لے آؤ...... ہم دفتر پہنچے تو جیلر نے میگھ راج کو حسرت سے دیکھ کر کہا۔ بد بخت تیری قسمت کیوں پھوٹ گئی ہے؟۔

جمعدار سے کہا اس کو پھانسی گھر لے جاؤ اس بدنصیب کی سزا اپیل میں تین سال سے

موت ہوگئی ہے......آخر پھانسی پانے کی تاریخ آ گئی جب اس کو تختہ دار پر لے گئے تو سپرنٹنڈنٹ نے حسب قاعدہ استفسار کیا تمہاری کوئی خواہش ہے؟ تم کوئی سوال کرنا چاہتے ہو؟

میگھ راج نے کہا جی ہاں مجھے شورش کاشمیری سے ملا دیں وہ میرا دوست ہے......اور اس سے پہلے کہ یہ رسہ میرا منکا ڈھلکا دے مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس تختہ پر ایک غزل گاؤں۔

سپرنٹنڈنٹ نے یہ دو خواہشیں پوری کر دیں۔

میگھ راج تختہ دار پر کھڑا تھا اس کے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو ابل پڑے اس نے بھرائی ہوئی آواز میں غالب کا یہ مطلع اٹھایا۔

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

دو تین دفعہ یہ شعر اٹھا بٹھا کر پڑھا پھر اس کی آواز بھرا گئی۔

سپرنٹنڈنٹ، جیلر، مجسٹریٹ، گارڈ، خاکروب سب کے چہرے اشک بار تھے لیکن قانون کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ تھا اس کے چہرے پر کالی ٹوپی ڈال دی گئی سپرنٹنڈنٹ نے اشارہ کیا خاکروب نے ہڑکا کھینچا میگھ راج ساوتری و شکنتلا کہتا ہوا ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا......شکنتلا کا ''لا'' اس کی ہچکی میں ڈوب کر رہ گیا اور ''ت'' ہونٹوں پر جم گئی۔

میں نے بعض ہندو دوستوں کو اس کے انتم سنکار کے لئے کہلا بھیجا تھا اور وہ راولپنڈی جا کر اس کی بیوی اور بچی کو لے آئے تھے لاش باہر نکالی گئی تو سیوا سمتی کے رضا کاروں نے ارتھی تیار کی اور شمشان بھومی لے گئے سنٹرل جیل کے آہنی دروازے جوں کے توں کھڑے تھے، سنگین تماشائی کی طرح بے حس و حرکت، فضا آزردہ، قدرت خاموش، لاش چپ چاپ، دو نسوانی جسم (اہلیہ اور بچی) دو ہتھڑ مار مار کر پیٹ رہے تھے۔ قانون چتا کے شعلوں کی نگرانی کر رہا تھا اور انصاف ارتھی کے گرد اگرد پہرے دار تھا۔

میں مارچ یا اپریل ۱۹۳۹ء میں رہا ہو کر راولپنڈی پہنچا وہاں ساوتری اور شکنتلا سے ملا، دکھ ہوا کہ تین روپے ماہانہ کی ایک کوٹھڑی میں کرشن کی بانسری کا نسوانی روپ اذیت کے دن کاٹ رہا ہے۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں سات برس کے لئے پھر قید ہو گیا۔ ۱۹۴۴ء کے آخر میں رہا ہوا......فسادات بہار کے

دنوں میں پٹنہ گیا تو جس ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا وہاں ''گیا'' کے ایک زمیندار کا نوجوان لڑکا اوپندر عرف بچہ بابو بھی ٹھہرا ہوا تھا...... انتہائی عیاش ہر رات بستر کے لئے کھلونا ڈھونڈتا، میں کوئی کتاب یا اخبار لینے اس کے کمرہ میں گیا تو پلنگ پر ایک نسوانی وجود پڑا تھا...... معاً میری نگاہیں اس کے چہرے پر گڑ گئیں اس نے بھی تاکا فوراً ہی منہ پھیر لیا آنکھیں جھکا لیں...... میں نے کہا 'ساوتری'...... وہ خاموش رہی میں نے...... کہا...... تم کہاں؟...... ساوتری اپنی جگہ سے اٹھی اور تیر کی طرح نکل گئی جاتے جاتے صرف یہ کہا اب میں ایک 'ویشیا' ہوں۔ میگھ راج کی پتنی اس کے ساتھ ہی پھانسی پا گئی تھی...... میں اس ساوتری کا سایہ ہوں انصاف کے دیوتا نے بہن بھائی اور پتنی تینوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

یہ سانحہ بھی بیت گیا تین چار سال بعد ۹ر جون ۱۹۴۹ء کو مجھے ایک خط ملا جو کئی آوارہ پتوں سے ہو کر مجھ تک پہنچا تھا اس میں لکھا تھا

بھیا...... پرنام

میں آپ کے متر میگھ راج کی ودھوا ہوں...... میری بیٹی شکنتلا کو...... بٹوارہ کے وقت راولپنڈی کے لگ بھگ کسی اسٹیشن پر بلوائیوں نے اٹھا لیا تھا...... کچھ پتہ نہیں کہاں ہے؟ آپ کھوج لگا سکتے ہوں تو پتہ دیں۔ آپ کی مہربانی ہوگی آپ کے ایک سورگباشی متر کی آتما کو چین ملے گا۔

''ایک ویشیا''

ساوتری میگھ راج

خط ملا تو میں عرصہ تک بے چین رہا...... ساوتری کے الفاظ خون کے قہقہے اور آگ کے انگارے تھے ایک روح فرسا تصویر آنکھوں میں گھومنے لگی......

میگھ راج...... پھانسی، پارو...... قتل، ساوتری...... ویشیا، شکنتلا...... اغوا

ایک ڈرامہ مختلف سین، ہدایت کار سنگدل قانون کا اندھا ''انصاف''۔

(''پس دیوارِ زنداں'' سے ماخوذ)

بھائی کی موت

''ان دنوں جو درد اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا وہ میرے جواں سال بھائی

یورش کاشمیری کی بیماری تھی۔ وہ تیئس چوبیس سال کا ایک کڑیل جوان بالا بلند خوبصورت وجیہ و شکیل..... اجلا سفید کھدر پہنتا جو اسے گورے چٹے رنگ پر خوب کھلتا تھا..... یورش کا مرض تیسرے درجے میں داخل ہو گیا وہ دن رات ہلکے ہلکے بخار میں پھنکتا اور خون تھوکتا ایک دن اسے قے میں اتنا خون آیا کہ بیٹھک کی نالی سرخ ہو گئی.....اس کی یہ خطرناک حالت دیکھ کر میں گھبرا گیا مجھے خوف محسوس ہونے لگا کہ اب وہ..... چند روز کا مہمان ہے جو علاج ہو رہا تھا وہ علاج نہیں تھا صرف خواہش علاج کی ادھوری سی کوششیں تھیں معلوم ہوتا تھا جیسے افلاس اور مصیبتنے ہمیں انتخاب کر لیا ہے.....شورش کاشمیری کا نام تو ملک کے ہر سیاسی گوشے میں گونجتا تھا..... مگر کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ..... جو شخص ابھی ابھی قید کے پانچ سال گزار کے آیا اور اب نظر بندی کا دوسرا سال گزار رہا ہے اس کی جیب میں چند ٹکے بھی نہیں ہیں۔ والد کی آمدنی قلیل تھی بیماری پر خرچ ہو جاتی میری کوئی مستقل آمدنی نہ تھی.....اس کا مرض اتنا مہنگا اور مہلک تھا کہ ہم لوگ اس کے تصور و تخیل سے بھی پرے تھے.....میو ہسپتال ہمارے لئے بند تھا وہاں مریضوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ نیا داخلہ قریب قریب ناممکن تھا میں نظر بندی کے باعث میو ہسپتال نہیں جا سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ میں ذاتی طور پر کسی ڈاکٹر سے مل ملا کر یا استدعا و التماس کر کے داخلہ حاصل کر لیتا..... حکام کو بارہا لکھا کہ وہ نظر بندی کی حدود گوالمنڈی کے تھانے تک بڑھا دیں تاکہ بھائی کو میو ہسپتال میں لے جاسکوں' سنتا کون؟ مدت تک درخواست پڑی رہی.....انہیں احساس ہی نہ تھا کہ ایک کڑیل جوان تپ دق سے مر رہا ہے۔

یورش موت کی طرف گامزن رہا جو علاج مقدرت میں تھا بے اثر رہا' جہاں تک قیمتی دواؤں کا یا بڑی فیسوں کا سوال تھا بس سے باہر تھیں.....اس بیماری میں ہر سانس روپیہ چاہتا ہے' ستم یہ تھا کہ یورش جس کوٹھری میں رہ رہا تھا وہ بجائے خود بلیک ہول تھی.....اس کی تعمیر ہی ایسی تھی کہ چوبیس گھنٹہ گھپ اندھیرا رہتا.....افلاس اپنے عروج پر تھا' احرار کانفرنسیں شورش کاشمیری زندہ باد کے نعروں سے گونجتی تھیں اور ملاقات کو وہ لوگ بھی آتے جاتے تھے جن کے کتوں کو بھی آب حیات مل سکتا تھا لیکن مریض کو ہم ایک سیب بھی خرید کر نہیں دے سکتے تھے.....خطرناک بیماری' خطرناک غریبی' اور خطرناک عاجزی کے ہاتھوں شکست کھا کر حکیموں کا علاج شروع کیا..... حکیم آفتاب احمد قریشی میرے مخلص دوست تھے انہوں نے اپنے مطب کا ہر قیمتی نسخہ آزمایا لیکن مریض گرتا ہی

رہا..... اس بے بسی میں ایک اور حکیم محمد دین افرائی کا پتہ چلا..... شہرت ان کی یہ تھی کہ تپ دق کے اچھے معالج ہیں..... انہوں نے خود آ کر علاج شروع کیا اور اس شفقت کا ثبوت دیا کہ ایک لحظہ کے لئے اپنی بے مائیگی کا احساس جاتا رہا لیکن دوا مفت مل سکتی تھی غذا نہیں۔ تپ دق کا مریض غذا بھی چاہتا ہے حکیم صاحب نے دوستوں کو بھی مات کر دیا لیکن یورش کا مرض بڑھتا ہی گیا..... معلوم ہوا کہ کلکتہ کے ایک وید شاہ عالمی دروازے کے باہر مطب کرتے ہیں۔ ان کے پاس بڑا مفید نسخہ ہے اس نیک نفس انسان نے بھی علاج شروع کیا پہلے ایک دو روز تو دوائی کا روپیہ ڈیڑھ لیتا رہا پھر چھوڑ دیا ہم نے اصرار کیا نہ مانا' وہ مریض اور گھر دونوں کی حالت دیکھ کر متاثر ہوا ایک دن اس نے بازار سے کوئی دوائی تجویز کی کل دس روپے قیمت تھی' لیکن اس دس روپے نے اس کا علاج بھی چھڑا دیا۔ مریض بزشگال زدہ دیوار کی طرح گر رہا تھا ایک دن اس قدر تڑپا کہ ہم سب مایوس ہو گئے والد اور میں نے بہنوں کو اس کے پاس چھوڑا اور خود بے سوچے سمجھے گھر سے نکل کھڑے ہوئے میرے پاس صرف تین روپے اور بارہ آنے تھے والد کے پاس ایک روپیہ اور دو آنے' ایک سنگین کشمکش نے گھیر رکھا تھا کوئی چار گھنٹے تک میں اور والد موری دروازہ کے باہر گنپت روڈ کے چوک میں ہی کھڑے رہے والد مجھ سے بھی زیادہ خوددار تھے' انہوں نے سوال کرنا سیکھا ہی نہ تھا' غور کیجئے ایک کا جوان بیٹا دوسرے کا جوان بھائی مر رہا ہے اور معاملہ صرف اس پر اٹکا ہوا ہے کہ گرہ میں مال نہیں اور علاج روپیہ چاہتا ہے یہاں کھڑا رہنا بھی علاج نہ تھا لیکن ہم دونوں باپ بیٹا یہاں اس طرح کھڑے تھے جیسے کوئی اجنبی طاقت ہمارے لئے دوائی لا رہی ہے..... گویا ہم نے اپنے نفس کو دھوکا دے لیا کہ اس طرح کھڑا رہنے سے مریض اچھا ہو جائے گا کوئی سی چیز بھی نہ تھی لیکن ہم کھڑے تھے' کبھی چپ رہتے کبھی ایک آدھ لفظ بول لیتے' والد کے منہ سے عاجزی میں نکل گیا..... ''کہاں کہاں جائیں قرض مانگیں تو ملتا نہیں مل جائے تو چکانے کی طاقت نہیں بھیک مانگیں تو عزت جاتی ہے اللہ بے نیاز ہے امیروں کی بیماری غریبوں کو لگ گئی ہے''۔

ان کا یہ آخری فقرہ میرے دل میں ترازو ہو گیا میں یوں ہو گیا جیسے کوئی لاش ہو۔ حضرت شفاء الملک نے کہلا بھیجا کہ وہ ایک طبی بورڈ ترتیب دے کر یورش کو دیکھنا چاہتے ہیں، کیا رائے ہے؟ عرض کیا میری رائے کیا ہو سکتی ہے اس معاملہ میں رائے تو آپ کی ہے لیکن یہ بورڈ کوٹھیوں میں مفید

ثابت ہوسکتے ہیں کوٹھڑیوں میں نہیں۔ مجھے نظر آرہا تھا کہ یورش ختم ہورہا ہے بلکہ ختم ہو چکا ہے اب طبی بورڈ کیا مسیحائی کرسکتے ہیں...... اس کا سپید و سرخ چہرہ زرد ہوکر ماند پڑ گیا تھا اس میں حرکت کرنے کی سکت بھی نہیں تھی وہ چراغ آخر شب تھا میں اسے کن انکھیوں سے تک کر بیٹھک میں چلا آیا اور دروازہ بند کر کے دیر تک بیٹھا رہا۔ میرا بازو ٹوٹ رہا تھا زندگی اس کے لئے مشکل اور موت نے اسے کیوں منتخب کیا ہے...... دماغ میں خیالات کا تانتا بندھا رہتا طرح طرح کے افکار گھومتے پھرتے رہتے...... آخر مشیت ایزدی کے سامنے سر جھکا دیتا۔

میں دو دفعہ سرکار کو خط لکھ چکا تھا کہ میری پابندیاں ہٹادی جائیں تاکہ میں اپنے جواں سال بھائی کا علاج کرسکوں لیکن حکومت کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اور مریض تھا کہ رینگ رینگ کر موت کے دروازے پر آپہنچا تھا امیدوں کے بہت سے چراغ حکومت کی سنگ دلی سے بجھ گئے۔

آخر یورش کا آخری وقت آگیا۔ ۱۷۔ دسمبر ۱۹۴۴ء اس کی زندگی آخری دن تھا اس کی ہر چیز مرچکی تھی صرف آنکھیں کھلی تھیں جن سے وہ ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا یا دل حرکت کررہا اور موت کے انتظار میں دھڑک رہا تھا اس کے پاؤں پر ورم آچکا تھا...... اس نے اس ظلمت خانہ میں جہاں وہ ورم توڑ رہا تھا دیواروں کو واپسیں نظروں سے تکنا شروع کیا اسے بھی یقین ہو چکا تھا کہ اب وہ ختم ہورہا ہے......

ہم سب اس کی چارپائی کے گرد احاطہ کئے ہوئے تھے وہ ایک ایک کو دیکھتا اور نظریں جھکا لیتا تھا......

جب اس پر جانکنی سے پہلے کی رونق آئی تو اس نے اپنے بہنوئی کو انتہائی کرب کے عالم میں کہا...... مجھے خدا کے لئے بچاؤ''۔

لیکن اب اسے کوئی انسان نہیں بچا سکتا تھا اور خدا کی رضا اپنا فیصلہ دے چکی تھی تمام دن اسی تذبذب میں گزر گیا۔

موت نے طول کھینچا میری آنکھ لگ گئی...... آنکھ کھلی تو...... پچھلے دس دنوں کا نقشہ کھینچ کھینچ کے سامنے آتا رہا ہم اس کے لئے کچھ بھی نہیں کرپائے تھے دواؤں کی خرید استطاعت سے باہر تھی اچھی غذا عنقا...... بڑی بہن ہر روز چند پیسوں میں گلے سڑے انار خریدتی اچھے دانوں کو چنتی اور اپنے میلے کچیلے دوپٹے کو دھو کر اس میں نچوڑتی! یہ تھا جوس جو یورش کو موت کے دروازہ تک ملتا رہا۔

آخری دفعہ اس نے کوئی گیارہ بجے شب آنکھیں کھولیں تو صرف یہ کہہ سکا کہ 'غریبی قدرت کی

خوفناک سزا ہے اور غریب قدرت کا خوفناک مذاق! یہ دنیا کچھ نہیں سب اللہ ہی اللہ ہے۔

میں ایک بجے شب بیٹھک میں چلا گیا......

شورش! یہ میرے بہنوئی کی آواز تھی۔

''خیریت ہے؟'' میں نے اوپر ہی سے آواز دی

''یورش کا انتقال ہو گیا ہے''

میں اڑ کے پہنچا تو والد غش کھا کے اس کی پائنتی پر پڑے تھے دو بہنیں پچھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں میں نے سب سے پہلے یورش کا منہ چوما اس کو جھنجھوڑا...... لیکن وہ ہمیشہ کی نیند سو چکا تھا اب اس کا جگانا فضول تھا اس کو مرض سے مکمل آرام آچکا تھا۔

کوئی دس بجے صبح ہم اس کی میت لے کر میانی صاحب کے قبرستان کو چلے تو ایک ہجوم ساتھ تھا...... پرانی انارکلی کے آخری نکڑ یعنی جین مندر تک میری نظر بندی کے حدود تھے میں اس سے آگے نہیں جا سکتا تھا...... نصف فرلانگ پر قبرستان تھا لیکن قانون نے پابہ زنجیر کر دیا تھا کہ اس حد سے آگے بھائی کی جنازہ کو بھی کندھا نہیں دے سکتے ہو......

لوگوں کی واپسی تک میں اسی چوک پر کھڑا رہا لوگ میت دفنا کر گھر پہنچے تو پیسہ اخبار پولیس اسٹیشن کا سب انسپکٹر دروازہ پر کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں ہوم سیکرٹری کا دستخطی حکم نامہ تھا...... گورنر پنجاب بڑی مسرت کے ساتھ شورش کاشمیری پر عائد کردہ ان پابندیوں کو واپس لینے کے احکام صادر کرتے ہیں جن کی رو سے وہ اب تک انارکلی پولیس کے علاقہ میں نظر بند ہے یہ پابندیاں اس کے بھائی کی علالت کے پیش نظر واپس لی جاتی ہیں اس کی نقل و حرکت پر اب اس سے کوئی پابندی نہیں رہی ہے''۔

(بوئے گل)

آغا شورش کے آخری الفاظ

حضرت مولانا خواجہ خان محمد مدظلہ کی قیادت میں قادیانیوں کی سرکوبی اور عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کے لئے جدوجہد جاری رہی۔ یہ خواجہ خان محمد مدظلہ کی امارت سے پہلے کا واقعہ ہے کہ آغا شورش کاشمیریؒ کی رحلت پر ان کی نماز جنازہ کے سلسلہ میں لاہور جانا ہوا۔ آغا صاحب کی رہائش گاہ پر مظفر علی شمسی سے ملاقات ہوئی۔ میرے سلام کرنے پر بینائی کمزور ہونے کی وجہ سے صرف آواز

ہی پہچان سکے۔ فرمانے لگے۔

''بھائی غلام نبی! ادھر میرے پاس بیٹھو۔ میں رات آغا صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ آغا صاحب کی آواز پست ہو چکی تھی۔ مجھے آغا صاحب نے قریب بلایا اور میرے کان میں کہا'' لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' مرزا غلام احمد قادیانی کافر' بے ایمان اور جھوٹا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے بعد کوئی بھی دعویٰ نبوۃ کرے' دجال ہے۔ کافر ہے۔ بے ایمان ہے۔ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ یہ میرا ایمان اور عقیدہ ہے۔ اور پھر اس کے بعد..... شورش دنیا فانی کو چھوڑ کر مولائے حقیقی سے جا ملے۔

اتنا کہہ کر مولانا شمسی زاروقطار رونے لگے۔ حتیٰ کہ ان کی ہچکی بندھ گئی اور فرمانے لگے۔

''آغا صاحبؒ نے مجھے گواہ بنایا ہے۔ میں آپ کو گواہ بناتا ہوں۔'' اس طرح مجلس احرار کا آخری مجاہد بھی ابدی نیند سو گیا۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمی سو گئے داستاں کہتے کہتے

(تحریک کشمیر سے تحریک ختم نبوت تک' از غلام نبی)

رضیہ سلطانہ ایک روشن خیال ملکہ

سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ابو ہریرہؓ نے عرض کیا' یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم مجھے (غالبًا) یمن کی گورنری عطا کیجئے۔ آپ ؐ نے ارشاد فرمایا..... نہیں ابو ہریرہؓ اب نہیں! ایک بات یاد رکھو دنیا میں یہ اقتدار امانت ہے اور آخرت میں رسوائی اور ندامت! اگر اقتدار بن مانگے ملے تو تیری اعانت من جانب اللہ ہوگی اور اگر مانگ کر تو نے اقتدار لیا تو' تو (لوگوں) کے سپرد کر دیا جائے گا۔

یہ کتنے واضح' روشن اور ابدی نقوش ہیں۔ ان پر کسی رائے کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ کامل و مکمل گفتگو پر ردّ و کد اور جرح و قدح کی اسی لئے ضرورت نہیں ہوتی کہ اس گفتگو سے شک و ریب کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ اقتدار کی بھیک لوگوں سے مانگنے کا طریقہ یہودیوں نے ایجاد کیا۔ عوام کو ''رب الارض'' بھی یہودیوں نے بنایا۔ عوام کو اقتدار کا مالک بھی انہی یہودیوں نے بنایا۔ اسی لئے اقتدار کے بھک منگے' منگتے' گداگر..... عوام عوام' غریب غریب' مزدور مزدور کی رٹ لگا کر فنکار پیشہ ور گداگروں کی طرح نہ معلوم کیا کیا بٹورتے اور لے ڈوبتے ہیں۔ یہودیوں کی نظری'

فکری اور عملی اطاعت سے اور یہودیانہ روش اختیار کر کے یہ لوگ بہت کچھ سمیٹ لیتے ہیں یعنی قومی سرمایہ، قومی روپئے، قومی اخلاق، قومی آراء، قومی امن، قومی اتحاد اور اس کے عوض قوم کو دیتے کیا ہیں ؟

بھوک، افلاس، قلاشی، ملاوٹ، غبن، فاحش، قتل، اغوا، زنا، جوا، نشہ، چوری، حرام خوری، حرام کاری، جھوٹ، بدمعاشی، تمام ابلیسی رویئے، گندے غلیظ اور ناپاک جذبے! وہ جذبے جن کی تکمیل کے لئے کوشاں انسان نما شیطانوں، وحشیوں، درندوں، مستبد وسفاک لوگوں کے پشتیبان اور سفارشی ارکانِ اسمبلی ہوتے ہیں جو دھونس، گھمنڈ اور دھاندلی سے ان بدصفات لوگوں کی خواہشیں پوری کرتے ہیں جو کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ سلطان شمس الدین التمش زندگی کے آخری مرحلے میں تھا۔ اس نے امراء اور درباریوں (پارلیمنٹرینز) کو اپنی رائے دی کہ میرے بیٹے نالائق ہیں، تمام ابلیسی اعمال ان میں بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ اپنی بیٹی کو اپنی جگہ بٹھادوں۔ امراء نے مخالفت کی مگر بادشاہوں کی رائے سے اختلاف کا چونکہ نتیجہ اچھا نہیں ہوا کرتا، لہٰذا امراء اور درباری آخر کو چپ ہو رہے اور التمش نے اپنی چہیتی بیٹی رضیہ سلطانہ کو اپنی ''خلیفہ'' بنادیا۔ وہ ملکۂ ہند بن گئی۔ ۱۲۳۶ء سے ۱۲۳۹ء تک تین برس کی مدت میں جہاں اُس نے بہادری اور حُسنِ کارکردگی کا خوب خوب مظاہرہ کیا وہاں تریاہٹ اور تریامت کا جادو بھی سر چڑھ کر بولنے لگا۔ رضیہ سلطانہ ایک حبشی غلام، جمال الدین یاقوت میر اخور سے اپنا دل ودماغ نہ بچاسکی اور اس کی ہوگئی۔ اسے شاہی اصطبل کی نوکری سے اٹھا کر امیر الامراء بنایا، پھر اس سے شادی کرلی۔ بھٹنڈہ کے حاکم نے رضیہ کے یہ کُچھن اور ''روشن خیالی'' کے یہ مظاہر دیکھ کر بغاوت کردی۔ رضیہ حبشی غلام کے ساتھ لشکر کشی کر کے اس کی سرکوبی کیلئے گئی مگر بھٹنڈہ کے حاکم کے سامنے ٹھہر نہ سکی۔ ''یاقوت'' مارا گیا تب رضیہ نے بھٹنڈہ کے حاکم سے شادی رچالی اور کبھی نہ پوری ہونے والی خواہشیں پوری کرتی رہی۔ ادھر امراء نے رضیہ کے بھائی معز الدین بہرام کو حاکم بنالیا۔ وہ ابھی حاکم ہوا ہی تھا کہ بھٹنڈہ کی رانی نے بھائی پر حملہ کرنے کی ٹھانی۔ حاکم بھٹنڈہ اور رضیہ دونوں اپنی معصوم خواہشیں پوری کرتے کرتے اس ناگہانی حملے کی زد میں آ گئے۔ تب دونوں مل کر مردانہ وار اور زنانہ وار گرفتار ہوئے اور دہلی کے نواح میں کیتھوں نامی قصبہ میں دونوں کو اکٹھے ہی ''خواہشوں کے گھاٹ'' اتار دیا گیا۔ پھر اسی ہوسِ اقتدار نے معز الدین بہرام کو بھی ۱۲۴۱ء میں قتل کرادیا۔ اس کے بعد التمش کا داماد آیا وہ بھی اپنے چچا ناصر الدین محمود کے

ہاتھوں ۱۲۴۶ء میں گرفتار ہوا اور جیل میں گل سڑ گیا۔

لوگ تاریخ تاریخ کی رٹ تو لگاتے ہیں مگر تاریخ پڑھتے نہیں۔ حالانکہ تاریخ بھی عقل و ہدایت کے لئے سامان مہیا کرتی ہے اور تاریخ اپنے طعنۂ ارتقا کے پہلو بہ پہلو فلسفۂ زوال بھی لے کے چلتی ہے۔ نہ جانے اقتدار کے بھک منگے' ناپاک اور غلیظ پجاری ان واقعاتِ خونچکاں سے عبرت کیوں حاصل نہیں کرتے؟ شاید یہ عقل سے عاری ہوتے ہیں اور بصارت و بصیرت سے محروم ہوتے ہیں۔ اللہ پاک نے بھی عقل والوں کو ہی عبرت حاصل کرنے کے لئے آواز دی ہے۔

''اے بصارت والو! اے عقل والو! عبرت پکڑو تا کہ تم پاکباز ہو جاؤ'' (القرآن)

جی ہاں! ہوسِ ملک گیری میں آزردہ دلوں کا قتل نہ کرو ورنہ تمہیں بھی یہ تلخ گھونٹ ساغر میں پلایا جائے گا۔

خونِ آزردہ دِلاں از پئے ملک مریز
کہ تُرا نیز ہماں جُرعہ بساغر ریزند

(سید عطاء المحسن شاہ بخاریؒ)

ادبیاتِ قدرت اللہ شہاب

پاکستان کے دووزیروں کا دورۂ آزاد کشمیر

پاکستان کے دووزیروں کا دورہ آزاد کشمیر خاص طور پر میرے دل پر نقش ہے۔ان کی آمد پر کئی سو آدمی اکٹھے ہوگئے۔اور چھوٹے موٹے جلسہ عام کی صورت پیدا ہوگئی' مسلم کانفرنس کے چند کارکنوں نے بڑی جوشیلی استقبالی تقریریں کیں' سامعین میں سے ایک بزرگ صورت شخص نے اٹھ کر رقت بھری آواز میں کہا:

''جناب پاکستان ایک عظیم ملک ہے۔آزاد کشمیر تھوڑا سا علاقہ ہے' آپ اس علاقہ کو لیبارٹری اور ہم لوگوں کو تجرباتی چوہوں کی طرح استعمال میں لائیں۔اسلامی احکامات اور قوانین کو پہلے یہاں آزمائیں' اور پھر اس تجربہ کی روشنی میں انہیں پاکستان میں نافذ کرنے کا سوچیں۔

اس بوڑھے کی یہ بات سن کر سارا مجمع سناٹے میں آ گیا۔ پھر اچانک دونوں میں سے ایک وزیر باتدبیر جوش وخروش سے اٹھ کر فصاحت و بلاغت کے دریا بہانے لگے۔جوشِ خطابت میں انہوں نے کوٹ کی جیب سے ایک لاکٹ نما چیز نکال کر مجمع کے سامنے لہرائی اور بولے۔

بھائیو! آپ اور ہم کس کھیت کی مولی ہیں کہ اللہ کے قانون کو آزما آزما کر تجربہ کریں۔یہ دیکھو یہ اللہ کا قانون ہے جو چودہ سو برس پہلے نافذ ہو چکا ہے اور جس پر عمل کرنا ہم سب کا دینی' اخلاقی اور ایمانی فرض ہے۔

وزیر صاحب کی تقریر میں اسلامی جذبات ایسی شدت سے کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے کہ سامعین میں سے چند رقیق القلب لوگ بے اختیار رو پڑے۔

واپسی پر احتراماً میں ان دو وزیر صاحبان کو کوہالہ کے پل تک چھوڑنے کے لیے ان کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا' ایک وزیر نے دوسرے کی شاندار تقریر پر تحسین وآفرین کے ڈونگرے برسانے کے بعد پوچھا' بھائی صاحب آپ کے پاس قرآن شریف کا لاکٹ بڑا خوبصورت ہے یہ تاج کمپنی کا

بنا ہوا ہے یا کسی اور کا؟

دوسرے وزیر صاحب کھلکھلا کر ہنسے۔ لاکٹ جیب سے نکال کر بولے" ارے کہاں بھائی صاحب! یہ تو محض سگریٹ لائیٹر ہے۔ وزیروں کی یہ جوڑی ملک غلام محمد اور نواب مشتاق احمد خان گورمانی پر مشتمل تھی۔ (شہاب نامہ)

دو بیٹیاں باپ کے ہاتھوں چوکھٹ پہ قربان

عبداللہ جموں کا رہنے والا تھا' اس کی تین بیٹیاں تھیں' ۹ برس کی زہرہ' ۱۲ برس کی عطیہ' اور سولہ برس کی رشیدہ۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جب مہاراجہ کشمیر نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مسلمانوں کو پاکستان بھجوانے کا کہہ کر راستے ہی میں قتل اور اغوا کرانا شروع کر دیا تو عبداللہ پریشان ہو کر پاگل سا ہو گیا' اسے یقین تھا کہ اگر وہ ان کو اپنے ساتھ لے کر کسی قافلہ میں روانہ ہوا تو راستے میں اس کی تینوں بیٹیاں درندہ صفت ڈوگرہ جتھوں کے ہتھے چڑھ جائیں گی۔

اپنے جگر گوشوں کو اس افتاد سے محفوظ رکھنے کے لیے اس نے اپنے دل میں ایک پختہ منصوبہ تیار کر لیا۔ نہا دھو کر مسجد میں کچھ نفل پڑھے' قصاب کی دوکان سے ایک تیز دھار چھری مانگ لایا اور گھر آ کر تینوں بیٹیوں کو عصمت کی حفاظت اور سنتِ ابراہیمی کے فضائل پر بڑا موثر وعظ دیا۔ زہرہ اور عطیہ کم عمر تھیں اور گڑیا گڑیا کھیلنے کی حد سے آگے نہ بڑھی تھیں' وہ دونوں باپ کی باتوں میں آ گئیں' دلہنوں کی طرح سج دھج کر انہوں نے دو دو نفل پڑھے اور پھر ہنسی خوشی دروازے کی دہلیز پر سر نکا کر لیٹ گئیں۔ عبداللہ نے آنکھیں بند کئے بغیر اپنی چھری چلائی اور باری باری دونوں کا سر تن سے جدا کر دیا۔

عجب اتفاق ہے کہ اس روز آسمان کے فرشتے بھی اس قربانی کے لیے دو دنبے لانے سے چوک گئے۔ چنانچہ دہلیز پر زہرہ اور عطیہ کی گردنیں کٹی پڑی تھیں۔ کچے فرش پر گرم گرم خون کی دھاریں بہہ بہہ کر بیل بوٹے کاڑھ رہی تھیں۔ کمرے کی فضا میں بھی ایک سوندھی سوندھی خوشبو رچی ہوئی تھی۔

اور اب عبداللہ اپنے ہاتھوں میں خون آشام چھری تھامے رشیدہ کو بلا رہا تھا۔ لیکن رشیدہ اس کے قدموں میں گری کپکپا رہی تھی۔ تھر تھرا رہی تھی' گڑ گڑا رہی تھی۔ وہ عبداللہ کے قدموں پر سر

رکھے بلک بلک کر رو رہی تھی۔ابا......ابا......ابا......

رشیدہ کی گڑگڑاہٹ پر عبداللہ کے پاؤں بھی ڈگمگا گئے۔ چھری ہاتھ سے پھینک دی۔ بہروپیوں کی طرح اس نے رشیدہ کو ایک بدصورت سی بڑھیا کے روپ میں ڈھالا۔اور کلمہ کا ورد کرتا ہوا اسے ساتھ لے کر ٹرک پر بیٹھ گیا اور پاکستان پہنچ گیا۔ پاکستان کی سرحد میں داخل ہوتے ہی یکا یک عبداللہ کو زہرہ اور عطیہ کی یاد آئی۔جن کے سر جسموں میں دروازے کی دہلیز پر کٹے پڑے تھے اور جو پھٹی پھٹی منجمد آنکھوں سے چھت کی طرف دیکھتی دیکھتی دم توڑ گئی تھیں۔وہ کمر تھام کر سڑک کے کنارے بیٹھ گیا اور رشیدہ کو گلے سے لگائے دیر تک دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔ (شہاب نامہ)

مہاراجہ کشمیر کے دربار میں

(دورانِ تعلیم) لندن سے ایک بین الاقوامی مضمون نویسی کے مقابلہ کا اعلان ہوا۔سب سے چوری چوری میں نے بھی ایک ساٹھ ستر صفحات کا مضمون لکھ کر بھیج دیا۔حسن اتفاق سے پہلا انعام مجھے مل گیا۔اس بات کا بڑا چرچا ہوا۔اخبارات میں تصویریں شائع ہوئیں اور بہت سے ہندو مسلمان مشاہیر کے تہنیتی خط اور تار آئے۔انعام کی مبارک بادی کے دو خط میری جگہ میرے پرنسپل کو آئے۔ایک حیدرآباد دکن کے وزیراعظم سر اکبر حیدری کی طرف سے تھا' اور دوسرا خط مہاراجہ کشمیر کے اے۔ڈی۔سی کی جانب سے تھا' اس میں حکم تھا کہ از روئے الطاف خسروانہ ہز ہائی نس نے مجھے چائے پر مدعو فرمایا ہے۔ پرنسپل کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ مجھے سرکار کی حضوری کے آداب سمجھا کر مقررہ وقت پر راج محل حاضر ہو جانے کی تاکید کریں۔

(مقررہ دن) میں بڑے اہتمام سے سوٹ بوٹ پہن کر شام کے چار بجے مہاراجہ پیلس پہنچ گیا۔ مجھے ایک آراستہ ویٹنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ جہاں دس بارہ آدمی اعلیٰ لباس پہنے چند "پری چہروں" کے ساتھ صبح سے بیٹھے تھے' لیکن "سرکار" نے ابھی تک انہیں یاد نہیں فرمایا تھا۔ میں نے ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد کچھ بے صبری دکھائی لیکن ڈیوڑھی وزیر نے غصہ ہو کر مجھے چپ کرا دیا۔

میں گھنٹہ بھر چپکے سے بیٹھا رہا۔اس کے بعد اپنی خودی کو تھوڑا سا بلند کیا اور ڈیوڑھی وزیر کو برملا کہہ دیا کہ انہوں نے خود مجھے چائے پر مدعو کیا ہے۔اب اگر فرصت نہیں تو میں چلتا ہوں۔ڈیوڑھی وزیر صاحب مجبور ہو کر خالص ڈوگری زبان میں بظاہر زیر لب بڑبڑاتے لیکن حقیقتاً مجھے گالیاں دیتے

اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد دو اے۔ڈی۔سی آئے اور مجھے کشاں کشاں راج محل کے ایک اندرونی برآمدے میں لے گئے۔

وہاں انواع و اقسام کی وردیاں زیب تن کیے بیروں' بٹلروں اور درباریوں کا ہجوم ایک صوفے کے گرد دست بستہ ایستادہ تھا۔ صوفے پر ہزہائی نس راج راجیشور مہاراج' ادھیراج' شری مہاراجہ ہری سنگھ بہادر' اندر مہندر' سپہر سلطنت انگلشیہ' جی۔سی۔ایس' آئی۔جی۔سی' آئی۔ای' کے۔سی۔وی۔ اونڈھال بھینسے کی طرح اوندھے پڑے تھے۔ گوشت پوست صوفے پر یوں بکھرا ہوا تھا جیسے گندے کپڑوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس تیز رفتار گاڑی سے باہر گر کر پھٹ گیا ہو۔

ایک اے۔ڈی۔سی نے مجھے دھکیل کر مہاراجہ کی سرکار میں پیش کیا۔ دوسرے اے۔ڈی۔سی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مہاراجہ کے دست مبارک کے ساتھ ہلکے سے رگڑ دیا۔ ہاتھ ملانے کی اس رسم میں وہ کیفیت تھی' جو مینڈک کے لجلجے پیٹ کو ہتھیلی پر رکھ کر پیدا ہوتی ہے۔

اس تعارف کے بعد مہاراجہ بہادر کے نرخرے سے غت غت کی کچھ آوازیں برآمد ہوئیں جن میں وہ دریافت فرما رہے تھے کہ یہ شخص کون ہے؟ اور یہاں کیوں آیا ہے؟

اے۔ڈی۔سی نے کمالِ ادب سے اطلاع دی کہ سرکار یہ وہی شخص ہے جس کے انعام جیتنے کا اخبار میں پڑھ کر حضور نے بطور رعایا پروری اور کرم گستری چائے پر مدعو فرمایا تھا۔ مہاراجہ بہادر نے بصد استغنا و دریا دلی ہاتھ کے اشارے سے ایک بیرے کو حکم دیا کہ لے جاؤ اسے "پلاؤ چائے وائے' کچھ چیسٹری ویسٹری بھی۔"

غنودگی کے مارے مہاراجہ صاحب اپنا فقرہ بھی نہ پورا کر پائے اور دو تین بیرے میری طرف یوں لپکے جیسے وہ میری مشکیں کس کر چائے پلانے لے جائیں گے۔

اسی روز میں نے اپنے دل میں یہ عزم بالجزم کر لیا کہ میں کسی صورت میں بھی ریاست کشمیر کی ملازمت اختیار نہ کروں گا۔" (شہاب نامہ)

حرم شریف میں داخلہ

میں نے سن رکھا تھا کہ جو شخص حرم شریف میں داخل ہوتا ہے' وہ اپنا جوتا' اپنے گناہوں کی گٹھڑی' اپنی دستارِ فضیلت اور اپنی بزرگی کا عمامہ دروازے کے باہر چھوڑ جاتا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا

کہ جب وہ باہر آئے گا تو اس کا جوتا' یا اس کے گناہوں کی گٹھڑی یا اس کی فضیلت کی دستار' یا بزرگی کا عمامہ اس کو واپس بھی ملے گا یا نہیں۔

بعض لوگوں کے جوتے گم ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کے گناہوں کی گٹھڑی غائب ہو جاتی ہے اور بعض لوگ اپنی فضیلت اور بزرگی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ (شہاب نامہ)

......☆......

جب میں ''ڈربن'' میں وکالت کرتا تھا تو میرے دفتر کے محرر اکثر میرے گھر رہا کرتے تھے' ہمارا مکان مغربی وضع کا تھا' اس کے کمروں میں نالیاں نہیں تھیں' اور ہونا بھی نہیں چاہئے تھیں' ہر کمرے میں ''پاٹ'' رکھ دیئے گئے تھے' مجھے یہ پسند نہیں تھا کہ انہیں کسی مہتر یا نوکر سے صاف کراؤں' اس لیے یہ ''پاٹ'' میں خود اور میری بیوی صاف کر دیا کرتے تھے۔

جو محرر ہم میں گھل مل گئے تھے وہ اپنے ''پاٹ'' خود صاف کر لیا کرتے تھے' مگر ایک نیا عیسائی محرر جس کے ماں باپ ''پنچم'' تھے خود صاف نہیں کیا کرتا تھا۔ اس لیے اس کے کمرے کی صفائی کرنا ہمارا فرض تھا' دوسروں کے پاٹ صاف کرنے میں میری بیوی نے کبھی عذر نہ کیا تھا' مگر جو شخص ''پنچم'' سے عیسائی ہوا تھا' اس کا ''میلا'' اٹھانا انہیں کسی طرح گوارا نہ ہوا۔

اس بات پر ہم دونوں میں اَن بن ہو گئی۔ ان سے نہ تو یہ دیکھا جاتا تھا کہ میں اس شخص کا پاٹ اٹھاؤں اور نہ وہ خود اٹھانا پسند کرتی تھیں' میری آنکھوں میں آج تک وہ تصویر پھرتی ہے کہ وہ پاٹ اٹھائے سیڑھی سے اتر رہی تھیں' آنکھیں غصہ سے لال اور رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے اور مجھے برا بھلا کہہ رہی تھیں صرف ان کا پاٹ اٹھا لینا میرے اطمینان کے لئے کافی نہ تھا' میں چاہتا تھا کہ وہ یہ خدمت خندہ پیشانی سے انجام دیں' اس لیے درشتی سے انہیں کہا:

''مجھے اپنے گھر میں یہ بے ہودگی پسند نہیں''

یہ لفظ ان کے دل میں تیر کی طرح لگے اور انہوں نے جھنجھلا کر کہا ''تمہیں اپنا گھر مبارک ہو' میرا یہاں نباہ نہیں ہو سکتا۔''

......☆......

ایرانی پاسداران انقلاب اور انقلابی حصوں کی تلاشی

میر جاوا ایرانی بلوچستان کا کوئٹہ ہے، لیکن دونوں میں وہی فرق ہے جو پنبہ و آتش، شعلہ و شبنم اور بہار و خزاں میں ہوتا ہے، کوئٹہ اپنی شانِ انا البرق میں یکتا ہے تو میر جاوا اپنی خاکساری میں منفرد، کوئٹے کے چہرے پر حُسنِ لیلیٰ ہے تو میر جاوا کے یمین و یسار میں خاکِ مجنوں، طوفانی ہواؤں کے جھکڑ، آندھیوں کے تھپیڑے اور صحراؤں کے بگولے، ہم سروں سے خاک اڑاتے ہوئے جامہ تلاشی دینے اور پاسپورٹ چیک کرانے کے لئے آگے بڑھے تو پیچھے سے شور اٹھا، پہلے ڈاکٹری معائنہ کرائیے۔ پھر جائیے، لیکن ہمارے برق رفتار دوستوں نے پلٹ کر دیکھے بغیر فیصلہ سنا دیا، ہماری صحت ٹھیک ہے' کپڑوں کی درستی' چہروں کی جھاڑ پونچھ' نماز کی ادائیگی' پاسپورٹ کی چیکنگ، سامان کی تلاشی اور جاموں کی ہاتھ پھیرائی میں کل ایک گھنٹہ صرف ہوا، اپنی پھرتی اور پاسداروں کی چستی دونوں قابلِ تحسین تھیں' جامہ تلاشی کے دوران پاسدارانِ اسلامی انقلاب کی انگلیاں جسم کے انقلابی حصوں کو بھی چھوتی ہوئی گذر گئیں، ہم نے سوچا عجلت کا کرشمہ ہوگا، لیکن اس سے آگے جو مقامات آئے، وہاں آہ و فغاں بھی سمٹ کر رہ گئی، تب جانا کہ جس چیز کو ہم عجلت کا کرشمہ سمجھتے تھے وہ احتیاط کا تقاضا ہے، رفتہ رفتہ عبا و قبا والے دوست بھی اس مشقِ ناز کے عادی ہو گئے، شاید اس خیال سے کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے، ہمارے ایک ذاکر دوست جو اس طرزِ تفتیش کو ''حفاظتی فرض'' کا نام دیتے تھے، ایک موقع پر جب رضا کارانہ طور پر ہاتھ اٹھائے اور ٹانگیں پھیلائے تلاشی دینے کے لئے کھڑے تھے تو میں نے انہیں ٹوکا ____ وہ ہنس کر کہنے لگے

تجھے کیا خبر کہ کیا ہے، رہ و رسم شاہبازی

ایک اور دوست بولے

تلاشی سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی جسم کے امتحاں اور بھی ہیں

میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا اگر اقبال زندہ ہوتے تو تم میں سے ہر مومن کو مخاطب کر کے کہتے

ترا اے کاش کہ مادر نہ زادے

(آتش کدۂ ایران، از اختر کاشمیری ص ۱۸۷ء)

آزادی ہوٹل

ایئر پورٹ سے نکلے تو سابق ''حیات'' اور موجودہ ''آزادی'' ہوٹل میں جا پہنچے، اس ہوٹل کے سابقہ اور موجودہ نام پر غور کیا تو قید حیات سے آزاد ہونے کا تمام مفہوم سمجھ آ گیا، آزادی شمالی تہران کے آخری اور ماڈرن علاقے میں ہے اسلامی انقلاب کے بیشتر دشمن اسی علاقے میں رہتے ہیں۔ آج کل ان سرکشوں کو منافقین خلق کہا جاتا ہے۔ آزادی کے سامنے بلند پہاڑی پر غلامی کی تاریخی یادگار ایون (EVIN) جیل عبرت کا منظر پیش کر رہی ہے شاہ کے دور میں ''ایون'' ساوک کا عقوبت خانہ تھی۔ آج ''پاسدارانِ انقلاب'' کا عبادت خانہ ہے مگر اس کی آنکھ سحر خیز ہے نہ جبیں سجدہ ریز اس کا بیرونی منظر عبرت سرائے دہر ہے، اندرونی منظر خدا جانتا ہے یا اندر جانے والے، ایک بات مشہور ہے کہ جو اس کے اندر گیا، باہر نہیں آیا۔ شاہوں کے دور سے گداؤں کے عہد تک اس کا منہ کھلا رہا۔ کئی انسان اس کے پیٹ میں سما گئے ۔صدائے مزید ہنوز جاری ہے، دور بدلے، زمانے بدلے، عہد بدلے، قرنوں نے انگڑائی لی، انقلاب نو آیا، ایون کا ستارہ جب بھی عروج پر تھا اب بھی عروج ہے۔ کل بھی اس کے محافظ موجود تھے، آج بھی موجود ہیں، یہ اُن کی بھی ضرورت تھی، ان کی بھی ضرورت ہے، یہ وقت اور ماحول کی ضرورت ہے، اہلِ وقت اور اہلِ ماحول کی ضرورت ہے، رندِ خرابات کی ضرورت ہے، قبلہ حاجات کی ضرورت ہے، اہل دھرم کی ضرورت ہے، مجرموں کی ضرورت ہے، محرموں کی ضرورت ہے، ظالموں کی ضرورت ہے، عالموں کی ضرورت ہے ___ سب کی ضرورت تھی اور سب کی ضرورت ہے، نظریہ ضرورت کا قانون اس کے دروازے سے گزرتا ہے، جو شخص اس پر تسلط حاصل کر لیتا ہے ولی کامل دکھائی دیتا ہے، خدائی اختیارات اس کے قبضے میں ہوتے ہیں، اسباب قدرت اس کے اشارے پر کام کرتے ہیں، رفتارِ زمانہ اس کی انگلیوں میں ہوتی ہے، نبض کائنات اس کی مرضی سے چلتی ہے۔ موت وحیات کے فیصلے اس کی جنبش لب سے وابستہ ہوتے ہیں، آزادیاں اور پابندیاں اس کی چشم ابرو کی محتاج ہوتی ہیں، وہ خدا کی زمین پر خدا کے بندوں کا خدا ہوتا ہے، کیونکہ اس کے پاس طاقت ہوتی ہے ___ اور تاریخ گواہ ہے کہ طاقت

نے صداقت کی حکمرانی کو کبھی قبول نہیں کیا، یہ وہ ہستی ہے جو ہر بلندی و پستی کو اپنے ساتھ منسلک کر دیتی ہے۔

(ایضاً ص ۲۵، ۲۶)

حوضہ علمیہ اور قالین تبرائی

حوضۂ علمیہ کی بات آئی ہے تو یہ بتادیا جائے کہ حوضۂ علمیہ کیا ہے؟ عام طور پر یہ نام سنتے ہی ذہن میں کسی یونیورسٹی کا نقشہ آجاتا ہے، فی الواقع ایسا نہیں، قم میں طلباء کے لئے مدارس کے بجائے قیام گاہوں کا بندوبست ہوتا ہے، ان مقامات پر تعلیم نہیں دی جاتی طلبہ کو تعلیم دینے کے لئے ہر مسجد میں اساتذہ موجود ہوتے ہیں، یہ طلبہ کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ کس مسجد میں کونسی کتاب پڑھنا چاہتے اور کس استاد سے پڑھنا چاہتے ہیں؟ اس قسم کی مکتبی مساجد پچاس ساٹھ کے لگ بھگ ہیں اور قم کی انہی مساجد کو حوضۂ علمیہ کہا جاتا ہے۔

مشہد میں حضرت امام علی رضا کا روضہ مرجع خلائق ہے، اس کی عمارت کے ایک حصہ میں آیت اللہ طبسی تشنگانِ علوم کی پیاس بجھاتے ہیں، امام طبسی کی ذاتی لائبریری بڑی شان رکھتی ہے۔ اس لائبریری میں قلمی نوادرات کا بھی بہت بڑا ذخیرہ ہے، امام طبسی سے ملاقات کے بعد اسی شام آیت اللہ شیرازی کی قیام گاہ پر ایک تقریب کا اہتمام تھا، اس تقریب میں پہلے آیت اللہ شیرازی کے نوجوان فرزند دلبند نے خطاب کیا اور بعد ازاں آیت اللہ شیرازی نے اظہارِ خیال فرمایا۔

آیت اللہ شیرازی کی تقریر کے دوران مولانا نثار احمد نے ہال کی دیوار پر لگے ہوئے ایک نمائشی قالین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اسے پڑھئے! میں نے پوچھا کیا کوئی خاص بات ہے؟

کہنے لگے نیچے سے اوپر ساتویں سطر پڑھ لیں، سب کچھ معلوم ہو جائے گا! میں نے جو اس سطر کو تلاش کر کے پڑھا تو اتحاد اسلامی کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ یہ ایک دعائیہ عبارت تھی جس میں حضرت ابوسفیانؓ، حضرت معاویہؓ اور دوسرے اصحابِ کبار پر لعنت کا ورد کیا گیا ہے۔ اب جو میں نے غور کیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی، کیونکہ اوپر سے ٹھیک ساتویں سطر میں یہی بددعا خلیفۂ اول اور دوئم کے بارے میں موجود تھی، میں نے مولانا نثار احمد سے کہا کہ اب آپ اوپر سے ساتویں سطر پڑھیں اور مسلم اتحاد کے دعوے کی حقیقی بنیاد تلاش کریں!

ہمیں یہ جان کر سخت رنج ہوا کہ آیت اللہ خمینی کے ایک دستِ راست نے چالیس ملکوں کے علماء کے سامنے اس قالین کی نمائش کیوں کی؟ اگر یہ باتیں ان کے عقیدے میں داخل ہیں تو ہوتی رہیں، لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک طرف خمینی کو امامِ اُمت قرار دیا جائے اور دوسری طرف ان کی حکومت کے زیرِ اہتمام پوری امت کی دلآزاری میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی جائے، کیا یہ بات بھی امامِ امت کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ اکابرینِ امت کی توہین کریں؟

چوں کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مُسلمانی

کم از کم یہ تو کوئی بڑی بات نہ تھی کہ جس روز چالیس مسلم ممالک کے علماء کو مدعو کیا گیا، اس روز اس قالین کو ہٹا دیا جاتا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس دلآزار قالین کی نمائش بھی پروگرام کا ایک حصہ تھی۔ گویا ایران کے قابلِ احترام علماء اس بات پر اتحاد چاہتے ہیں کہ امت مل کر اپنے پیغمبر ﷺ کے رفقاء کے خلاف تبرّی بازی شروع کر دے۔ تقریب کے اختتام پر نعرے شروع ہوئے تو سرِفہرست یہ نعرہ تھا: ''یا ایہا المسلمون اتحدوا اتحدوا''۔ یہ نعرہ سن کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے ''اتحدوا'' کی جگہ ''انتشروا انتشروا'' کی صدا لگائی، بظاہر تو اس موقع پر اس صدا کا جواز بھی تھا کہ یہ لوگوں کے منتشر ہونے کا وقت تھا، لیکن میں اچھے انداز میں اپنے میزبانوں کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ آپ کا عمل اتحاد کے خلاف ہے ____ مسٹر مقدس نژاد میری آواز کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولے۔

''پلیز برادر یونٹی یونٹی'' ____ میں نے کہا ''نو یونٹی'' اور اس کے ساتھ ہی ہم ہال سے باہر آ گئے۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی، کاش میں فوٹو گرافر ہوتا، یا کوئی ایسا دوست یہاں موجود ہوتا جو اس قالین کی تصویر بنا لیتا اور میں اپنے ملک کے لوگوں کو اتحادِ اسلامی کی تصویر دکھا کر اپنی بات کی تصدیق کرا سکتا، میں نے دائیں بائیں دیکھا، لیکن کوئی شناسا فوٹو گرافر نظر نہ آیا، دل پہ ہاتھ رکھے، لب پہ آہیں، آنکھوں میں آنسو لئے اور دوش پہ دینی حمیت کا جنازہ اٹھائے واپس آ گئے، قریب ہی سے مرزا غالب کی آواز آئی۔

ہوئے مر کے ہم جو رُسوا، ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

(ایضاً ص ۳۴، ۳۶)

مولانا یوسف بنوریؒ کی وفات پر اظہارِ غم

''موت کے قانون سے نہ کوئی نبی مستثنیٰ ہے نہ ولی نہ عالم نہ جاہل' نہ نیک نہ بد نہ مومن نہ کافر' نہ شاہ نہ گدا' اپنے اپنے وقت پر ہی سب کو جانا ہے لیکن جانے والوں سے کچھ ایسے خوش بخت بھی ہوتے ہیں کہ زندگی ان کے نقشِ پا سے راستہ ڈھونڈتی ہے' قومیں ان کے نور سے روشنی پاتی ہیں۔ انسانیت ان سے غازہ حسن مستعار لیتی ہے' شرافت ان پر ناز کرتی ہے' محبوبیت انہیں دیکھ دیکھ کر اپنے کاکل و گیسو سنوارتی ہے۔ ایوان علم ان کے بہار آفریں وجود سے گل و لالہ بن جاتا ہے' مجروح قلوب ان کے انفاس سے مرہم شفا پاتے ہیں' بے کس و درماندہ افراد ان کے سایۂ عاطفت میں پناہ لیتے ہیں' وہ شمع کی مانند خود پگھلتے ہیں مگر مخلوق خدا پر ضوفشانی کرتے ہیں' خود جلتے ہیں مگر دوسروں کو جلا بخشتے ہیں' خود بے چین و بے قرار رہ کر دوسروں کو راحت و سکون عطا کرتے ہیں' ان کے آئینہ رخ زیبا میں یادِ خدا کی تصویر جھلکتی نظر آتی ہے' ان کی دید دل کو سرور اور آنکھوں کو نور عطا کرتی ہے' ان کی محفل سکینت جنت کا نمونہ پیش کرتی ہے' وہ خاموش ہوں تو ہیبت و وقار پرا باندھے پہرا دیتے ہیں' بات کریں تو موتی رولتے ہیں' مسکرائیں تو پھول برساتے ہیں' ناز کریں تو آسماں سے صدائے لبیک آتی ہے' گڑگڑائیں تو عرش الٰہی کانپ جاتا ہے' دنیا سے یہ بھی جاتے ہیں مگر اس شان سے جاتے ہیں کہ ہر چہار سو صفِ ماتم بچھ جاتی ہے' آسماں و زمین نوحہ کرتے ہیں' انسانیت کا پرچم سرنگوں ہو جاتا ہے' زمانہ تاریخ کی کروٹ بدل دیتا ہے' اور قصرِ ملت میں زلزلہ آ جاتا ہے''۔

(مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کے قلم سے ماہنامہ بینات میں تعزیتی تحریر سے اقتباس)

......☆......

''بٹ صورتیاں''

☆...... قاضی صاحب اپنے اور جاوید اقبال کے والد سے متاثر ہیں۔ گرمی اور سردا بہت کھاتے ہیں۔ جنرل دوستم کو بھی جنرل دو۔ستم کہتے ہیں۔ مجاہد آدمی ہیں۔ کار سے بھی یوں نکلتے ہیں' جیسے مورچے سے نکل رہے ہوں۔ بلاشبہ وہ پاکستان کی مصلّی افواج کے سربراہ ہیں۔

☆...... مولانا نورانی میرٹھ میں پیدا ہوئے مگر پوچھو کہاں پیدا ہوئے تو کہیں گے ''گھر میں''۔

گلوری گلے میں یوں دباتے ہیں جیسے کلرک فائل دباتے ہیں۔ منہ ایسا کہ اس میں پان نہ ہو تب بھی لگتا ہے کہ ہے۔ انہیں دنیا کی ہر زبان آتی ہے جو نہیں آتی اُسے اہم نہیں سمجھتے۔ اردو تک یوں بولتے ہیں کہ ایک صاحب خربوزے بیچ رہے تھے، اُن سے پوچھا ''آپ عدداً بیچتے ہیں یا وزناً؟'' تو دکاندار نے کہا ''مولانا! میں خربوزے بیچتا ہوں۔'' بڑے بذلہ سنج اور بدلہ سنج ہیں۔ بھٹو مرحوم نے ایک دفعہ کہا ''آپ ایک شریف آدمی کی بات پر اعتبار کریں۔'' تو مولانا بولے ''آپ ایک شریف آدمی لے آئیں، میں اعتبار کرلوں گا۔'' موصوف کا گھر محلے میں ہے جبکہ سیاست دانوں کے گھر میں تو کئی محلے ہوتے ہیں۔ پوچھو! ''گھر سجانا ہو تو کیا کرتے ہیں......؟'' کہیں گے ''خود آجاتا ہوں۔''

☆...... حقہ اور نوابزادہ صاحب اس قدر لازم و ملزوم ہیں کہ دونوں کی شخصیت ٹوپی کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ حقے کی نَے منہ میں یوں دبائے ہوئے ہوتے ہیں، جیسے مخالف کی گردن۔ وہ حکم عدولی برداشت کر لیتے ہیں، مگر حقہ عدولی نہیں۔ پرانی چیزیں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ اس لیے کمرے میں شیشہ ضرور رکھتے ہیں۔

☆...... کوثر وہ شاعر ہیں جن کی وجہ سے ایک گھر میں طلاق ہوگئی۔ ایک میاں روز اپنی بیوی سے کہتا ''مجھے کوثر کا یہ شعر پسند ہے۔'' بیوی نے تنگ آ کر کہا ''اگر تمہیں کوثر اتنی ہی اچھی لگتی ہے تو اسے لے آؤ، میں چلی!'' پیر پگاڑہ صاحب نے کہا ''مولانا کوثر نیازی اتنے ہی مولانا ہیں جتنے ہم پیر ہیں۔ اور ہم اتنے ہی پیر ہیں جتنے وہ مولانا ہیں۔'' شورش کاشمیری کے بقول ''بھٹو کی مردم شناسی دیکھئے، اطلاعات بہم پہنچانے والے کو اُنہوں نے مشیر اطلاعات بنا دیا...... یہ علم کا وہ چشمہ ہیں جس میں حکمران غرارے کرتے رہے......'' کہتے ہیں ''صرف معیاری کتابیں پڑھتا ہوں۔'' ٹھیک کہتے ہیں، ہم نے کبھی انہیں اپنی لکھی ہوئی کتابیں پڑھتے نہیں دیکھا۔

☆...... کہتے ہیں پانی پینے والے شاعر کی شاعری زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہتی۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو پھر یہ بھی غلط نہیں کہ شراب پینے والا شاعر خود زیادہ دیر تک نہیں رہتا۔

☆...... مولانا عبدالستار نیازی، عورت کی حکمرانی کے حق میں نہیں۔ اگر ہوتے تو شادی شدہ ہوتے۔ فرماتے ہیں ''میری بیوی نہیں، اس لیے سارا وقت سیاست کو دیتا ہوں۔'' فخر امام صاحب کہتے ہیں ''میری بیوی ہے، اس لیے سارا وقت سیاست کو دیتا ہوں۔''

☆...... اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں پر کتابیں اتاریں۔ کچھ ادیبوں کی کتابیں پڑھ کر تو لگتا ہے، شیطان نے بھی اپنے برگزیدہ بندوں پر کتابیں اتاری ہیں۔ پہلے شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کیا تو شیطان بنا۔ اب اسے شیطان رہنے کے لیے آدم کو روز سجدہ کرنا پڑتا ہے۔

(مزاح نگار یونس بٹ۔ از نقیب ختم نبوت، فروری ۲۰۰۳ء)

✿✿✿✿✿

باب پنجم
متفرقات

متفرقات

وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ

تفسیر مظہری میں بروایت سدی یہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ کفار قریش کے دو سردار اخنس بن شریق اور ابوجہل کی ملاقات ہوئی تو اخنس نے ابوجہل سے پوچھا کہ اے ابوالحکم (عرب میں ابوجہل ابوالحکم کے نام سے پکارا جاتا تھا اسلام میں اس کے کفر و عناد کے سبب ابوجہل کا لقب دیا گیا) یہ تنہائی کا موقع ہے میرے اور تمہارے کلام کو کوئی دوسرا نہیں سن رہا ہے، مجھے محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق اپنا خیال صحیح صحیح بتلاؤ کہ ان کو سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا، ابوجہل نے اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ بلاشبہ محمدؐ سچے ہیں انہوں نے عمر بھر میں کبھی جھوٹ نہیں بولا لیکن بات یہ ہے کہ قبیلہ قریش کی ایک شاخ بنوقصی میں ساری خوبیاں اور کمالات جمع ہو جائیں باقی قریش خالی رہ جائیں تو اس کو ہم کیسے برداشت کریں؟ جھنڈا بنی قصی کے ہاتھ میں ہے حرم میں حجاج کو پانی پلانے کی اہم خدمت ان کے ہاتھ میں ہے، بیت اللہ کی دربانی اور اس کی کنجی ان کے ہاتھ میں ہے اب نبوت بھی ہم ان ہی کے اندر تسلیم کرلیں تو باقی قریش کے پاس کیا رہ جائے گا۔

☆

لنکا والوں کی مسلمانوں سے محبت کا سبب

قدیم عربی کتاب ''عجائب الہند'' میں لنکا کی نسبت لکھا ہے کہ جب یہاں کے رہنے والوں کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے ایک سمجھدار آدمی تحقیق حالات کے لئے بھیجا، جب وہ مدینہ منورہ پہنچا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ حضرت ابوبکر

صدیقؓ بھی وصال پا گئے تھے اور حضرت عمرؓ کا زمانہ تھا' اس نے متجسس حالات سے تمام باتیں تفصیل سے حاصل کیں اور اپنی تشفی کے بعد ہندوستان کی طرف واپس پھرا' راستے میں وہ تو مر گیا' لیکن اس کا ہندو نوکر صحیح سلامت واپس پہنچ گیا۔

اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے فقیرانہ اور درویشانہ طور وطریق کا ذکر کیا' اور بتایا کہ وہ کیسے متواضع اور خاکسار ہیں' پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں' اور مسجد میں سوتے ہیں۔ یہ باتیں لنکا والوں کو پسند آئیں اور مسلمانوں کے ساتھ ان کی محبت بڑھ گئی' چنانچہ عجائب الہند کا راوی لکھتا ہے ''اب یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ جو اس قدر محبت اور میلان رکھتے ہیں وہ اسی سبب سے ہے۔'' (آب کوثر از شیخ محمد اکرم)

......☆......

ہندو مذہب میں ''شودر'' کا مقام

ہندو مذہب میں انسانی طبقات کی چار قسمیں کی گئی ہیں۔ سب سے اعلیٰ طبقہ برہمنوں کا اور سب سے ادنیٰ طبقہ شودروں کا سمجھا جاتا تھا۔

ہندوؤں کے مذہبی قوانین کی رو سے شودروں کے لیے جو تعقیبی دفعات نافذ تھیں ان میں سے چند یہ ہیں:۔

(۱)...... برہمن کے لئے جائز ہے کہ وہ شودر کو اپنی خدمت پر مجبور کرے خواہ اس نے اس کو خریدا ہو یا نہ خریدا ہو۔

(۲)...... شودر کا آقا اگر اس کو آزاد کردے تب بھی اس کو ہر وقت اختیار حاصل ہے کہ جو خدمت چاہے لے' کیونکہ غلامی اس کے وجود کا جزء لاینفک ہے جو آزاد کر دیے جانے پر بھی اس سے منفک نہیں ہو سکتی۔

(۳)...... کسی شودر کے ہاتھ سے اگر کسی برہمن کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو اس کے لئے بجز قتل کے کوئی اور چارہ کار نہیں ہے۔

(۴)...... کسی شودر کی زبان سے کسی برہمن کے لئے گالی کا کوئی کلمہ نکل جائے تو اس کی سزا یہ ہے کہ اس کی زبان پکڑ کر گدی سے کھینچ لی جائے۔

(۵)...... کوئی شودر کسی برہمن یا اس کے خاندان کو حقارت آمیز کلام سے خطاب کرے تو اس کی سزا یہ ہے کہ ایک خنجر جس کا طول دس انگل ہو سخت گرم کرانے کے بعد اس کے منہ میں رکھا جائے۔

(۶)...... جو چیزیں برہمنوں کے واجبات سے متعلق ہیں ان میں سے کسی ایک کی نسبت اگر کسی شودر کی زبان سے کوئی کلمۂ نصیحت ادا ہو تو بادشاہ پر فرض ہے کہ کھولتا ہوا تیل اس کے منہ اور کانوں میں ڈلوائے۔

(۷)...... برہمن اگر کسی شودر کی چوری کرے تو اس کی سزا صرف یہ ہے کہ شودر کو مال کا تاوان دلایا جائے۔ لیکن یہی جرم شودر سے کسی برہمن کے لئے صادر ہوتا تو اس کی سزا یہ تھی کہ شودر کو جلا دیا جاتا تھا۔

(۸)...... کسی حاکم کو مارنے کی جسارت کسی شودر سے سرزد ہو جائے تو چاہئے کہ شودر کو زندہ بھی بھون لیا جائے۔ لیکن کوئی برہمن اگر ایسی حرکت کر بیٹھے تو اس کو صرف تاوان خیانت دینا پڑے گا۔

(اسلام میں غلامی کی حقیقت، از مولانا سعید احمد اکبر آبادی)

......☆......

روس میں غلاموں کی خرید و فروخت

بعض روسی کہتے ہیں کہ ابتداءً روس میں غلامی کا وجود بالکل نہ تھا۔ لیکن وہاں کی دیہاتی آبادی تین طبقوں پر مشتمل تھی۔ ایک غلام' دوسرے آزاد زراعتی مزدور اور تیسرے کسان' اٹھارویں صدی میں ان تینوں جماعتوں کو غلاموں کی ایک جماعت بنا لیا گیا تھا۔ غلاموں کی طرح ان کو خریدا اور بیچا جاتا تھا اور ان کی فروخت کے لئے باقاعدہ اشتہار شائع ہوتے تھے۔ ۱۸۰۱ء کے ماسکو گزٹ میں ایک مرتبہ چند غلاموں اور باندیوں کا ایک اشتہار شائع ہوا تھا اور اس کی عبارت یہ تھی۔

''برائے فروخت موجود ہیں ......تین کام کرنے والے عمدہ تربیت یافتہ اور دو ۲ خوبصورت لڑکیاں جن میں سے ایک کی عمر اٹھارہ ۱۸ سال کی اور دوسری کی پندرہ ۱۵ سال کی ہے۔ یہ دونوں لڑکیاں خوش منظر اور خانہ داری کے مختلف کاموں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اسی گھر میں ان کے علاوہ دو اور بال بنانے والے غلام فروختگی کے لئے موجود ہیں' ایک کی عمر بیس سال کی ہے لکھ پڑھ سکتا ہے اور آلات موسیقی پر گا سکتا ہے اور شکار میں بھی بڑی مدد دے سکتا ہے۔ دوسرا غلام عورتوں

اور مردوں دونوں کے بال سنوار سکتا ہے اور اسی گھر میں پیانو و دیگر آلات غنا بھی بکنے کے لئے موجود ہیں۔" (اسلام میں غلامی کی حقیقت)

......☆......

اسلام میں غلام مقامِ سادات پر

امام زہری کہتے ہیں "میں ایک مرتبہ عبدالملک بن مروان کے پاس گیا تو اس نے مجھ سے پوچھا تم کہاں سے آ رہے ہو؟ میں نے کہا "مکہ سے" اس کے بعد مجھ میں اور عبدالملک میں حسب ذیل گفتگو ہوئی:

☆......عبدالملک: تمہاری روانگی کے وقت (مکہ سے) اہل مکہ کا سردار کون تھا؟"

☆......زہری: عطاء بن ابی رباح!

☆......عبدالملک: عرب ہے یا غلام؟

☆......زہری: غلام!

☆......عبدالملک: "تو پھر عرب کا سردار کیونکر ہو گیا؟"

☆......زہری: "دیانت اور روایت کی وجہ سے"

☆......عبدالملک: "بے شک اہل دیانت و روایت ہی سرداری کے مستحق ہیں"

☆......پھر عبدالملک نے دریافت کیا: "اچھا اہل یمن کا سردار کون ہے؟"

☆......زہری: طاؤس بن کیسان

☆......عبدالملک: عرب ہے یا غلام؟

☆......زہری: غلام!

☆......عبدالملک: تو پھر یمن کا سردار کیونکر ہو گیا؟

☆......زہری: جس بناء پر کہ عطاء اہل مکہ کا سردار ہے!

☆......عبدالملک: بے شک جو شخص عطاء کی طرح صاحب دیانت و روایت ہو اس کو سیادت کا حق ہے۔ اچھا اہل حق مصر کا سردار کون ہے؟

☆......زہری: یزید بن حبیب!

☆......عبدالملک: عرب ہے یا غلام؟

☆......زہری: غلام

اس پر عبدالملک نے پھر وہی کہا کہ غلام عرب کا سردار کیونکر ہوگیا اور زہری نے بھی حسب معمول وہی جواب دیا' اور اس کو سن کر عبدالملک نے پھر وہی کہا کہ بے شک صاحب دیانت ورِوایت شخص سیادت کا مستحق ہے۔ عبدالملک نے گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے پھر پوچھا اہل شام کا سردار کون ہے؟

☆......زہری: مکحول الدمشقی!

☆......عبدالملک: عرب ہے یا غلام؟

☆......زہری: غلام اور غلام بھی کیسا! حبشی' قبیلہ ہذیل کی ایک عورت کا آزاد کردہ غلام ہے۔

☆......عبدالملک: اہل جزیرہ کا سردار کون ہے؟

☆......زہری: میمون بن مہران!

☆......عبدالملک: عرب ہے یا غلام؟

☆......زہری: غلام!

☆......عبدالملک: اچھا اہل حرم کا سردار کون ہے؟

☆......زہری: ضحاک بن مزاحم!

☆......عبدالملک: عرب ہے یا غلام؟

☆......زہری: غلام!

☆......عبدالملک: بصرہ کا سردار کون ہے؟

☆......زہری: حسن بن ابی الحسن!

☆......عبدالملک: عرب ہے یا غلام؟

☆......زہری: غلام!

☆......عبدالملک: اچھا اہل کوفہ کا سردار کون ہے؟

☆......زہری: ابراہیم النخعی!

☆......عبدالملک: عرب ہے یا غلام؟

☆......زہری: عرب!

عبدالملک نے ابراہیم النخعیؒ کا نام سنا جو عرب تھے تو فرط مسرت میں کہنے لگا: ''زہری تو برباد ہو! تو نے اب میری تشویش کو دور کر دیا' اس کے بعد خود ہی کہا ''اللہ کی قسم غلاموں کو بڑے بڑے لوگوں پر سردار ہونا چاہئے' یہاں تک کہ ان کے نام کے خطبے برسر منبر پڑھے جائیں اور عرب ان کے نیچے بیٹھے ہوئے ہوں۔

☆......زہری کہتے ہیں ''میں نے کہا: ہاں بے شک اے امیر المومنین سرداری اللہ کا حکم اور اس کی دین ہے' جو کوئی اس کی حفاظت کرے گا سردار ہوگا اور جو اس کو ضائع کر دے گا ذلیل و خوار ہوگا۔

(تفسیر روح البیان علامہ آلوسی بغدادیؒ جلد ۳ ص ۳۲۱)

......☆......

شوق کافی ہے

استاد یوسف دہلوی (م ۱۹۷۷) مشہور خوشنویس تھے۔ ان کو فن خطاطی پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار جلی کا خط کا مقابلہ ہوا۔ جمنا کے کنارے ریت کے میدان میں بہت سے خطاط جمع ہوئے۔ استاد یوسف آئے تو ان کے ہاتھ میں بانس کا ایک بڑا ٹکڑا تھا۔ انہوں نے بانس سے ریت کے اوپر لکھنا شروع کیا۔ الف سے ش تک پہنچے تھے کہ تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ ہوگیا۔ لوگوں نے کہا کہ بس کیجئے۔ استاد یوسف نے کہا، میں نے جو لکھا ہے اس میں رنگ بھر دو اور پھر ہوائی جہاز سے چھوٹے سے سائز میں ان کا فوٹو لے لو، مجھے یقین ہے کہ فوٹو میں وہی خط رہے گا جو میرا اصل خط ہے۔ اس کے بعد کسی اور کو اپنا فن پیش کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

تقسیم کے بعد وہ پاکستان چلے گئے تھے۔ وہاں شاہ سعود کی آمد پر ان کو ایک محراب کا مضمون لکھنے کے لئے دیا گیا۔ استقبال کی تیاریوں کا بچشم خود معائنہ کرنے کے لئے گورنر جنرل آئے۔ اس دوران انہوں نے استاد یوسف کا لکھا ہوا محراب بھی دیکھا۔ اس شان کا خط دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ کس خطاط نے لکھا ہے۔ چنانچہ استاد یوسف کو بلایا گیا۔ گورنر جنرل نے ان کے کام کی تعریف کی اور پوچھا کہ اس کو لکھنے میں آپ کا کتنا وقت لگا۔ استاد یوسف

نے کہا کہ سات دن۔ گورنر جنرل نے فوراً اپنے سیکرٹری کو حکم دیا کہ استاد کو ان کی خدمت کے اعتراف میں سات ہزار روپے پیش کرو۔ چنانچہ اسی وقت ان کو اتنی رقم کا چیک دے دیا گیا۔

استاد یوسف سے ایک شخص نے پوچھا کہ خوشنویسی کا فن آپ نے کس استاد سے سیکھا ہے۔ انہوں نے کہا کہ کسی سے نہیں۔ ان کے والد خود ایک مشہور خوش نویس تھے۔ مگر انہوں نے اپنے والد کی شاگردی بھی نہیں کی۔ پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ میں نے خوش نویسی کا فن لال قلعہ سے سیکھا ہے۔ لال قلعہ میں مغل دور کے استادوں کی وصلیاں (تختیاں) رکھی ہوئی ہیں۔ ان تختیوں میں لکھے ہوئے قطعات فن خطاطی کے شاہکار نمونے ہیں۔ استاد یوسف دس سال تک برابر یہ کرتے رہے کہ لال قلعہ جا کر ان تختیوں کو دیکھتے۔ ہر روز ایک قطعہ اپنے ذہن میں بٹھا کر واپس آتے۔ اس کو اپنے قلم سے بار بار لکھتے۔ اور پھر اگلے دن اپنا لکھا ہوا کاغذ لے کر لال قلعہ جاتے۔ وہاں کی محفوظ تختی سے اپنے لکھے ہوئے کو ملاتے اور اس طرح مقابلہ کر کے اپنی غلطیوں کی اصلاح کرتے۔ اس طرح مسلسل دس سال تک ہر روز لال قلعہ کی قطعات کی تختیوں سے وہ خود اپنی اصلاح لیتے رہے اور ان کو دیکھ دیکھ کر مشق کرتے رہے۔ یہی دس سالہ جدوجہد تھی جس نے انہیں استاد یوسف بنا دیا۔

اگر آدمی کے اندر شوق ہو تو نہ پیسہ کی ضرورت ہے اور نہ استاد کی نہ کسی اور چیز کی۔ اس کا شوق ہی اس کے لئے ہر چیز کا بدل بن جائے گا۔ وہ بغیر کسی چیز کے سب چیز حاصل کر لے گا۔

(راز حیات، وحید الدین خان)

کمزوری نعمت ثابت ہوئی

گاندھی جی (مہاتما) اپنی کتاب تلاش حق (My Experiments with Truth) میں لکھتے ہیں کہ وہ پیدائشی طور پر شرمیلے تھے۔ ان کا یہ مزاج بہت عرصہ تک باقی رہا۔ جب وہ تعلیم کے لئے لندن میں تھے تو وہ ایک ویجیٹیرین سوسائٹی کے ممبر بن گئے۔ ایک بار انہیں سوسائٹی کی میٹنگ میں تقریر کے لئے کہا گیا۔ وہ کھڑے ہوئے۔ مگر کچھ بول نہ سکے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اپنے خیالات کو کس طرح ظاہر کریں۔ بالآخر وہ شکریہ کے چند کلمات کہہ کر بیٹھ گئے۔ ایک اور موقع پر ان کو مدعو کیا گیا کہ وہ سبزی خوری کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کریں۔ اس بار انہوں نے اپنے خیالات ایک کاغذ پر لکھ لئے۔ مگر جب وہ کھڑے ہوئے تو وہ اپنا لکھا ہوا بھی نہ پڑھ سکے۔

ان کی یہ حالت دیکھ کر ایک شخص نے مدد کی اور ان کی لکھی ہوئی تحریر کو پڑھ کر سنایا۔

گاندھی جی نے وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد بمبئی میں پریکٹس شروع کی۔ مگر یہاں بھی ان کا شرمیلا پن ان کے لئے رکاوٹ بن گیا۔ پہلا کیس لے کر جب جج کے سامنے کھڑے ہوئے تو حال یہ ہوا کہ ان کا دل بیٹھنے لگا اور وہ کچھ بول نہ سکے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے موکل سے کہا کہ میں تمہارے کیس کی وکالت نہیں کرسکتا۔ تم کوئی دوسرا وکیل تلاش کرلو۔

بظاہر یہ سب کمی کی باتیں ہیں۔ مگر گاندھی جی لکھتے ہیں کہ یہ کمیاں بعد کو میرے لئے بڑی نعمت (Advantage) ثابت ہوئیں۔ اس سلسلے میں ان کے الفاظ یہ ہیں:

''بولنے میں میری ہچکچاہٹ جو کبھی مجھے تکلیف دہ معلوم ہوتی تھی، اب وہ میرے لئے ایک مسرت ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے مجھے مختصر الفاظ میں بولنا سکھایا۔ میرے اندر فطری طور پر یہ عادت پیدا ہوگئی، کہ میں اپنے خیالات پر قابو رکھوں۔ اب میں اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بمشکل ہی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی لایعنی لفظ میری زبان یا قلم سے نکلے۔''

گاندھی جی اپنی اس خصوصیت میں مشہور ہیں کہ وہ بہت سوچی سمجھی بات بولتے تھے اور سادہ اور مختصر الفاظ میں کلام کرتے تھے۔ مگر یہ امتیازی خصوصیت ان کو صرف ایک غیر امتیازی خصوصیت کے ذریعہ حاصل ہوئی۔ وہ یہ کہ وہ اپنے شرمیلے پن کی وجہ سے ابتداءً لوگوں کے سامنے بول ہی نہیں پاتے تھے۔ (ایضاً)

کوئی چیز مشکل نہیں

ہیرا ہماری تمام معلوم دھاتوں میں سب سے زیادہ سخت ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ہیرے سے زیادہ سخت نہیں ہوتی۔ شیشہ کا فریم بنانے والے کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ ''قلم'' کی صورت کی ایک چیز شیشہ کے تختہ پر گزارتا ہے اور شیشہ کٹ کر دو ٹکڑے ہوجاتا ہے۔ اس قلم میں ہیرے کا ٹکڑا لگا ہوتا ہے۔ ایسا اس لئے ممکن ہوتا ہے کہ ہیرا انتہائی سخت چیز ہے، خواہ وہ قدرتی ہو یا مصنوعی۔

تمام دوسری معدنیات کے برعکس ہیرے پر کسی قسم کا ایسڈ (تیزاب) اثر نہیں کرتا۔ آپ کو ہیرے کو خواہ کسی بھی تیزاب میں ڈالیں وہ ویسا کا ویسا باقی رہے گا۔ مگر اسی سخت ترین ہیرے کو اگر

ہوا کی موجودگی میں خوب گرم کیا جائے تو وہ ایک بے رنگ گیس بن کر اڑ جائے گا۔اور یہ گیس کاربن ڈائی آکسائڈ ہوگی۔

اسی طرح ہر چیز کا ایک ''توڑ'' ہوتا ہے۔اگر آپ کسی مشکل کا مقابلہ وہاں کریں جہاں وہ اپنی سخت ترین حیثیت رکھتی ہے تو ممکن ہے کہ آپ کی کوشش کامیاب نہ ہو۔مگر کسی دوسرے مقام سے آپ کی یہی کوشش انتہائی حد تک نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔

جب بھی آپ کا مقابلہ کسی مشکل سے پیش آئے تو سب سے پہلے یہ معلوم کیجئے کہ اس کا کمزور مقام کون سا ہے اور جو اس کا کمزور مقام ہو وہیں سے اپنی جدوجہد شروع کیجئے۔ایک چیز کسی اعتبار سے ناقابل شکست ہو سکتی ہے، مگر وہی چیز دوسرے اعتبار سے آپ کے لئے موم ثابت ہوگی۔

ایک شخص جس کو آپ کڑوے بول سے اپنا موافق نہ بنا سکے اس کو آپ میٹھے بول سے اپنا موافق بنا سکتے ہیں۔اپنے جس حریف کو آپ لڑائی کے ذریعہ دبانے میں کامیاب نہ ہو سکے اس کو آپ اخلاق اور شرافت کے ذریعہ دبانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ایک ماحول جہاں آپ مطالبہ اور احتجاج کے ذریعہ اپنا مقام حاصل نہ کر سکے وہاں آپ محنت اور لیاقت کے ذریعہ اپنا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

ہیرا تیزاب کے لئے سخت ہے مگر وہ آنچ کے لئے نرم ہو جاتا ہے۔یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ایک آدمی اگر ایک اعتبار سے سخت نظر آئے تو اس کو ہمیشہ کے لئے سخت نہ سمجھ لیجئے۔اگر وہ ایک اعتبار سے سخت ہے تو دوسرے اعتبار سے نرم ہو سکتا ہے۔

ہر چیز کا حال یہ ہے کہ وہ کسی اعتبار سے سخت ہے اور کسی اعتبار سے نرم،ایک شخص ایک انداز سے معاملہ کرنے میں بے لچک نظر آتا ہے مگر وہی دوسرے انداز سے معاملہ کرنے میں ہر شرط پر راضی ہو جاتا ہے۔یہی وہ حقیقت ہے جس کو جاننے میں زندگی کی تمام کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

(راز حیات)

......☆......

زوجہ داہر کی بہادری

راجہ داہر کی بیوی بہت ہی جرأت مند اور بہادر عورت تھی،اس نے اپنے بیٹے کے ساتھ

برہمن آباد جانے سے انکار کر دیا اور پندرہ ہزار راجپوت سواروں کا ایک زبردست لشکر لے کر قلعے سے باہر نکلی اور مسلمانوں کے مقابلے پر آئی۔ محمد بن قاسم نے ایک عورت کا مقابلہ کرنا مناسب نہ سمجھا چنانچہ رانی قلعے میں محصور ہوگئی اور اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچنے لگی۔

مسلمانوں نے قلعے کا محاصرہ کر لیا جو ایک عرصے تک قائم رہا۔ اہل قلعہ محاصرے کی طوالت کی وجہ سے سخت پریشان ہوئے جب اس مصیبت سے نجات کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو انہوں نے آگ کا ایک بڑا الاؤ روشن کر کے اپنے بیوی بچوں کو اس میں جھونک دیا اور قلعے کے دروازے کھول دیئے۔ راجپوت راجا داہر کی بیوی کی نگرانی میں قلعہ سے باہر نکلے اور مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے لگے۔ یہ تمام راجپوت اس حد تک لڑے کہ رانی سمیت مارے گئے اس کے بعد مسلمانوں کا لشکر قلعے میں داخل ہوا۔ انہوں نے چھ ہزار راجپوتوں کو قتل اور بیس ہزار کو قید کیا۔ ان قیدیوں میں راجا داہر کی دو لڑکیاں بھی تھیں جن کو محمد بن قاسم نے خلیفہ کے پاس بطور تحفہ ارسال کیا۔

ملتان کی فتح

محمد بن قاسم نے دیبل کا تمام ملک عربی امراء میں تقسیم کر دیا۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ ملتان بھی راجہ داہر کے قبضے میں تھا تو اس نے اس شہر کو بھی فتح کر لیا۔ محمد بن قاسم نے ملتان کو پایہ تخت بنایا اور یہاں کے تمام مندروں کو مسمار کر کے ان کی جگہ مسجدیں تعمیر کیں۔

داہر کی بیٹیاں اور خلیفہ ولید

حجاج بن یوسف نے راجہ داہر کی دونوں بیٹیوں کو خلیفہ کے پاس دمشق روانہ کر دیا' یہ لڑکیاں خلیفہ کے محل میں رہنے لگیں۔ ایک عرصے بعد خلیفہ ولید کو ان لڑکیوں کا خیال آیا اور اس نے انہیں اپنے پاس بلایا۔ خلیفہ کے پوچھنے پر ان لڑکیوں نے اپنے نام بتائے، بڑی کا نام سرلا دیوی اور چھوٹی کا نام پرمل دیوی۔ سرلا دیوی ولید کو بہت پسند آئی اور اسے اپنے محل میں داخل کرنے کا ارادہ کیا۔ سرلا کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے کہا "میں آپ کے محل میں داخل ہونے کے قابل نہیں ہوں، کیونکہ محمد بن قاسم تین راتیں میرے ساتھ گزار چکا ہے، کیا مسلمانوں میں یہی رواج ہے کہ عورت پر پہلے تو ملازم اپنے ہاتھ صاف کریں اور بعد میں اپنے خلیفہ کے پاس بطور تحفہ روانہ کر دیں۔"

محمد بن قاسم کا عبرتناک انجام

یہ سن کر خلیفہ ولید سخت طیش میں آ گیا اور اس نے اسی وقت اپنے ہاتھ سے یہ فرمان لکھا:
''محمد بن قاسم جہاں کہیں بھی ہو فوراً اپنے آپ کو گائے کی کھال میں بند کر کے پایہ تخت پہنچ جائے۔''
محمد بن قاسم کو جب یہ فرمان ملا تو اس بے چارے نے مجبوراً خلیفہ کے حکم کی تعمیل کی، اس نے خود کو گائے کی کھال میں لپیٹا اور اپنے آدمیوں سے کہا ''مجھے ایک صندوق میں بند کر کے خلیفہ کے پاس پہنچادو'' ایسا ہی کیا گیا اور بے بس و بے کس محمد بن قاسم کو دمشق پہنچا دیا گیا۔

صندوق میں بند (مرا ہوا) محمد بن قاسم جب خلیفہ کے سامنے پہنچا تو ولید نے سرلا دیوی کو بلا کر کہا ''دیکھو میں مجرموں کو ایسی ہی عبرتناک سزا دیتا ہوں۔''

سرلا نے ولید سے کہا ''آپ کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ آپ بغیر تحقیق کسی کی بات کا یقین کریں ہر بات کو آپ پہلے میزانِ عقل پر تولا کریں اور اس کے بعد کوئی فیصلہ کیا کریں۔ آپ نے محمد بن قاسم کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ عقل سے بے بہرہ ہیں اور محض خدا کے سہارے حکومت کر رہے ہیں۔ محمد بن قاسم نے میری طرف کبھی دستِ تصرف نہیں بڑھایا اور ہمیشہ مجھے اپنی بہن کی طرح اپنے ساتھ رکھا۔ چونکہ اس نے ہماری قوم کو تباہ و برباد کیا تھا اس لئے میں نے انتقامی جذبے کے تحت اس پر الزام تراشی کی۔ مجھے خوشی ہے کہ میں محمد بن قاسم سے انتقام لینے میں کامیاب ہوگئی ہوں۔'' ولید سرلا دیوی کی زبان سے یہ کلمات سن کر بہت شرمندہ ہوا لیکن اب کیا ہوسکتا تھا جو کچھ ہونا تھا وہ ہو کر ہی رہا۔

......☆......

استاد کی بے ادبی کا وبال

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، مورخ اسلام علامہ سید سلیمان ندویؒ کے تذکرہ میں رقمطراز ہیں:

وہ (مولانا سید سلیمان ندویؒ) چاہتے تھے کہ فرزندان ندوہ کے سامنے وہی شخصیتیں قابل تقلید اور منتہائے کمال نہ ہوں جو علم و ادب اور تاریخ کے لئے ایک رمز و علامت بن گئی ہیں' بلکہ وہ اپنی تحریک کے داعیوں اور اپنی درسگاہ کے بانیوں میں سے ان لوگوں کو بھی مثالی نمونہ کے طور پر

سامنے رکھیں اور ان کی پیروی کی کوشش کریں جو اپنی دینداری اور صلاح اور اپنی دینی و دینوی اور علمی و ادبی جامعیت میں بھی امتیاز خاص کے مالک تھے، مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ دارالعلوم کی عمارت کے عقبی حصے سے نکلتے ہوئے فرمایا کہ مولوی علی صاحب ہر جماعت اور ہر دانش گاہ کے لئے ایک آئیڈیل ہوتا ہے، وہ اس کے تمام افراد کے دل و دماغ اور تخیل پر چھایا ہوا ہوتا ہے، اس سے اس ان کو اپنی زندگی کے لئے پیام اور اپنے کاموں کے لئے جوش و نشاط حاصل ہوتا ہے، میرے نزدیک دارالعلوم کے لئے آئیڈیل چار شخصیتیں ہو سکتی ہیں، مولانا محمد علی مونگیریؒ مولانا شبلی نعمانی، آپ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی اور نواب سید علی حسن خاں کہ یہ سب علم و دین کے مختلف شعبوں پر حاوی تھے، اور ان سے مل کر ایک جامعیت پیدا ہوتی ہے۔

سید صاحب کے ان نئے رجحانات نے طلباء میں وہ مقبولیت اور کامیابی حاصل نہیں کی جو ان کے مقام کے لحاظ سے متوقع تھی، بلکہ اس سے ایک ذہنی کشمکش پیدا ہوئی، اس کا نقطہ عروج و ارتقاء طلباء کی وہ اسٹرائک تھی جو ۱۹۴۳ء کو پیش آئی آغاز اس کا اگرچہ کچھ انتظامی معاملات سے ہوا لیکن اس کے اندر بے اطمینانی اور کشمکش کی یہی روح کام کر رہی تھی، اس اسٹرائک کی قیادت ہمارے بعض عزیز شاگرد کر رہے تھے، جو دارالعلوم کے بہترین طلباء تھے اور ان سے ہم نے اور دارالعلوم نے بڑی بڑی توقعات قائم کی تھیں، ان میں سب سے زیادہ نمایاں میرے عزیز ترین شاگرد علی احمد کیانی تھے، میں نے اپنے دس سال کے تدریسی دور میں اور اس کے بعد بھی جب میں نے بحیثیت نائب معتمد کے کام کیا اس نوجوان سے زیادہ ذہین، ذی استعداد اور سلیم الطبع طالب علم نہیں دیکھا، دوسرے اور تیسرے ہی درجہ سے اس کا یہ حال تھا کہ صرف و نحو کی غلطی اس سے ہونی بہت مشکل تھی، میرے استاد خلیل عرب صاحب نے ایک مرتبہ ان کے امتحان کی کاپی دیکھ کر جب وہ درجہ دوم یا سوم میں پڑھتے تھے، یہ کہا کہ یہ کاپیاں مجھے دے دو اور جتنا کہو میں ندوہ کے لئے چندہ لے آؤں، چوتھے پانچویں درجہ میں پہنچ کر وہ برجستہ عربی میں تقریر کرنے لگے تھے، حافظہ اس بلا کا تھا کہ ہزاروں شاعر اقبال و اکبر اور ظفر علی خاں کے نوک زبان تھے، میرے بعض عربی مقالات کا ترجمہ بھی کیا تھا، وہ اسٹرائک کے بعد کراچی گئے تو اپنی نو عمری کے باوجود کراچی کی علمی مجلسوں میں علامہ کیانی کے نام سے مشہور ہوئے، جیسا کہ طلباء کے ہنگاموں میں ہوا کرتا ہے، وہ طوعاً و کرہاً طلباء کے نمائندہ اور

اسٹرائک کے قائد بن گئے' ان کے سب استادوں کو اور بالخصوص مجھے ان کے اس ہنگامہ میں نہ صرف شریک ہونے بلکہ قائد بننے سے سخت قلق تھا' زیادہ تر اس وجہ سے کہ اس اسٹرائک کی زد سید صاحب کی شخصیت اور ان کی معتمدی پر پڑتی تھی' بلکہ وہ اس وقت ندوہ کے حقیقی مربی اور سرپرست اور اس کے لئے سینہ سپر تھے' سید صاحب کے دل کو بھی اس ہنگامے سے بڑی چوٹ لگی' ان کے دل میں ندوہ کی خدمت اور طلباء کی تربیت کی بڑی بڑی امنگیں تھیں' ان کو اس سے اپنی تمناؤں کا خون اور اپنی کوششوں کی ناکامی کا منظر نظر آیا اور بہت دل شکستہ اور افسردہ ہو گئے' انہی دنوں میں علی احمد مرحوم پر جنون کا دورہ پڑا اور حالت یہاں تک پہنچی کہ ان کو گھر والوں نے رسیوں سے باندھ دیا۔ ان کے بھائی میرے برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم کو انکو دکھانے کے لئے گھر لے گئے' میں بھی خصوصی تعلق کی بنا پر ساتھ ہو گیا' مرحوم کو جب رسیوں سے بندھا ہوا دیکھا تو آنکھ میں آنسو آ گئے کہ یہ نوجوان جو اپنی ذکاوت اور صحیح الدماغی میں اپنے ساتھیوں کے لئے بھی قابل رشک تھا' اس حالت میں ہے' بھائی صاحب نے نسخہ لکھا اور تشریف لے آئے' سید صاحب اس زمانہ میں اتنے دل برداشتہ تھے کہ دارالعلوم میں قیام بھی نہیں فرمایا' ہمارے ہی گھر میں مقیم تھے' میں نے ایک مرتبہ تنہائی میں موقع پا کر عرض کیا کہ میرا خیال ہے کہ علی احمد کی زبان سے آپ کی شان میں کوئی لفظ نکل گیا' اس طوفان بے تمیزی میں کچھ بعید نہیں کہ ان پر جذباتیت غالب آئی ہو' اور ناگفتنی کا ارتکاب کیا ہو' حدیث شریف میں آتا ہے، "من اذی لی ولیاً فقد اذنتہ بالحرب" اور آپ تو ان کے محسن اور مربی بھی تھے' سید صاحب نے اس کے جواب میں تواضع اور فروتنی کے الفاظ فرمائے اور کہا کہ میں کیا چیز ہوں' میں نے دوبارہ عرض کیا اور دعا کی درخواست کی سید صاحب نے اس پر سکوت فرمایا' دوسرے یا تیسرے دن مجھ سے فرمایا کہ مولوی علی صاحب میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کر دی' اب اس واقعہ کو سید صاحب کی کرامت سمجھا جائے یا اس کو کسی اور بات پر محمول کیا جائے کہ عزیز موصوف بالکل اچھے ہو گئے اور جہاں تک مجھے علم ہے' یہ دورہ پھر کبھی نہیں پڑا' افسوس ہے کہ یہ شعلۂ مستعجل بالکل نوعمری میں ۱۹۵۰ء میں گل ہو گیا۔

ع حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

(پرانے چراغ)

☆

ماں کی نافرمانی کا عبرتناک واقعہ

میں چیچہ وطنی سے تقریر کر کے جا رہا تھا کچھ ساتھی میرے ساتھ تھے۔ ایک آدمی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ مکھیاں اس کے پاس بھنبھنا رہی تھیں' عجیب حالت تھی' چہرہ زرد ہے' غبار و گرد ہے' عجیب درد ہے' نہ اس کا کوئی ہمدرد ہے' پریشان' حیران گردان ہے' چارپائی ہے' نہ بھلائی ہے' مجھے سمجھ نہ آئی کہ یہ کون ہے' میں قریب آیا تو کہنے لگا او مولانا! ادھر تشریف لائیں' پیلے دانت' ہڈیوں کا ڈھانچہ کمزور سانچہ' قابل غور' عجیب شور' اس کے پاؤں پر ایک کپڑا پڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا مجھے عبرت سے دیکھو۔ میں کون ہوں۔ میں ایک شیر تھا۔ مجھے دیکھ لو مولانا! ابھی آپ کی تقریر کی آواز یہاں آ رہی تھی' کہنے لگا یہ مکان میرا تھا' دکان میری تھی' اب بھیک مانگتا ہوں' مجھے کوئی بھیک بھی نہیں دیتا بلکہ میرے اوپر لعنت کرتے ہیں۔

ذرا غور سے سننا یہ عبرت کی بات بتا رہا ہوں۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور کافی دیر تک روتا رہا' کہنے لگا میں وہ ہوں جس نے اماں کے منہ پر جوتے مارے تھے۔ (استغفر اللہ) میں رات کو سینما دیکھنے گیا۔ غنڈوں کے ساتھ ساری رات میں آوارہ گردی کرتا تھا۔ دیر سے آیا۔ میں نے ماں سے روٹی مانگی' اماں نے کہا شرم نہیں آتی ساری رات آوارہ گردی کرتے ہو۔ کبھی پولیس تمہیں پکڑ لیتی ہے۔ نہ تمہارا ابا ایسا تھا' نہ تیری اماں ایسی ہے۔ تم کن غنڈوں میں پھنس گئے۔ شرم کرو' تمہیں روٹی دے کر حرام کروں' کچھ ناراض ہوئی' مجھے غصہ آیا میں نے جوتا اتار کر ماں کو مارنا شروع کر دیا۔ دو جوتے منہ پر مارے۔ ماں کے منہ سے اتنا سنا کہ عرش والے! اس لئے بچہ دیا تھا کہ آج میں جوتے کھا رہی ہوں' مجھے موت دے دے میں جینے کے قابل نہیں ہوں' مولیٰ! جو بے عزتی ہوئی' ہو چکی' مجھے اپنے پاس بلا لے' میں اب زیادہ جوتے نہیں کھا سکتی' عرش والے! جس نے اماں کی توہین کی ہے اس کتے کو دنیا و آخرت میں برباد کر دے۔

کہنے لگا اس وقت تو میں سو گیا' رات کو پاؤں میں ایک ٹیس اٹھی' درد اٹھا' پاؤں لرزنے لگا' صبح کو پاؤں سوجھ کر اتنا موٹا ہو گیا۔ ڈاکٹر کو دکھایا' لاہور گیا۔ ملتان نشتر ہسپتال گیا۔ انہوں نے آپریشن کیا۔ پاؤں کاٹتے گئے' کاٹتے گئے' اس نے اپنے پاؤں سے کپڑا اٹھایا تو پیپ بہہ رہی تھی۔ کہنے لگا یہ زخم نہیں' یہ اماں کی بددعا ہے' خدا کا قہر ہے' اماں ایک ہفتہ رو رو کر مر گئی' کھانا تک نہ کھایا'

کہتی تھی میں سمجھتی تھی کہ بیٹا خدمت کرے گا میں اس عمر میں جوتے کھا رہی ہوں' مجھے اپنے بیٹے کی ضرورت نہیں' اماں رو رو کر اسی غم میں ختم ہوگئی۔ اماں کی آہیں عرش پر پہنچیں' قہار نے سنیں' مجھ پر خدا کا قہر نازل ہوا' جائیداد گئی' مکان بیچا' دکان بیچی' بیوی گئی' بیٹے گئے' چار سال سے یہاں پڑا ہوں' پیپ بہہ رہی ہے' ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کتے کاٹ رہے ہیں' نیند نہیں آتی۔ مکھیاں بھنبھناتی رہتی ہیں۔ گزرنے والے کہتے ہیں یہ وہ لعنتی ہے' جس نے اماں کو جوتے مارے تھے۔ دنیا مجھے عبرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے' کتے کی طرح میرے سامنے روٹی پھینک جاتے ہیں۔ میرا ہاتھ پکڑ کر عجیب چیخ ماری اور گر پڑا کہنے لگا حضرت یہ دنیا کی ذلت ہے پتہ نہیں میری آخرت کا کیا حال ہوگا۔ اتنا کہا پھر گر پڑا روتا رہا۔ پھر اس نے آنکھ نہ کھولی۔ کہنے لگا مولانا مجھے روٹھا رب راضی کروا دو۔ معلوم ہوتا ہے جس سے اماں ناراض ہے خدا بھی اس کے لئے قہار بن جاتا ہے۔ میں اجڑ گیا ہوں' بیٹے آتے ہیں' بلاتا ہوں۔ بیٹھے مجھے ابا نہیں کہتے' میری دنیا برباد ہوگئی ہے' اندھیرا چھا گیا ہے' دنیا کی لعنت برس رہی ہے' اماں کے ایک لفظ نے خدا کے قہر سے مجھے برباد کر دیا''۔

خدا کی قسم یہ میں نے آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اللہ ہمیں ماں باپ کی بددعاؤں سے بچائے۔ (آمین) (مولانا عبدالشکور دین پوریؒ کی تقریر سے اقتباس)

''ناقص العقل'' کی قابل داد عقل و بلاغت

ابوالاسود زیاد بن ربیہ والی عراق کی اولاد کو پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دن ابوالاسود کی اہلیہ نے زیاد کے یہاں اپنے لڑکے کی تولیت کا دعویٰ کر دیا۔ ابوالاسود کی اہلیہ نے امیر کے سامنے بیان دیا کہ یہ میرا لڑکا مجھ سے زبردستی لینا چاہتے ہیں حالانکہ میرا شکم اس کا ظرف' میری چھاتی اس کی سقایہ اور میری آغوش اس کی سواری رہی ہے۔

ابوالاسود نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ کیا تو اس طریقہ سے مجھ کو دبانا چاہتی ہے حالانکہ میں نے اس لڑکے کو تیرے شکم میں رکھا اور تیرے وضع حمل سے پہلے میں نے اس کو (بحالت نطفہ) اپنے شکم میں رکھا اور تیرے وضع حمل سے پہلے میں نے اس کو (بحالت نطفہ) وضع کیا تھا۔ عورت نے کہا کہ تیری اور میری اس سلسلہ میں برابری نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ جس وقت یہ تیرے شکم میں

تھا تو بہت ہلکا تھا اور جب تجھ سے منتقل ہو کر میرے شکم میں آیا تو بوجھل ہو کر رہا۔ تیرے شکم سے وہ شہوت کے ساتھ خارج ہوا لیکن جب میرے شکم سے برآمد ہوا تو سخت تکلیف کے ساتھ نکلا۔

امیر زیاد نے عورت کا بیان سن کر ابوالاسود سے کہا کہ یہ عورت مجھ کو زیادہ عاقلہ معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا آپ اس کا لڑکا اس کو دے دیں۔ یہ اس کی پرورش اچھے طریقے سے کرے گی۔

☆

فتنۂ تاتار کی یادگار ایک نسخۂ مفردات القرآن

شیخ الاسلام مولانا محمد تقی عثمانی اپنے سفرنامہ جہانِ دیدہ میں رقمطراز ہیں:

''شیخ سے رخصت ہو کر ہم مدرسے کے کتب خانے پہنچے' یہ کتب خانہ بھی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ ہی کا قائم فرمودہ ہے' اور تقریباً چالیس ہزار کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس کتب خانے کے صرف مخطوطات کا تعارف پانچ ضخیم جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ علم کے اس سدا بہار گلشن سے استفادے کے لئے تو مہینے درکار تھے' لیکن مختصر وقت میں بہت سے نادر مخطوطات کی زیارت نصیب ہوئی۔ بہت سی نئی کتابوں کا پتہ چلا۔ لیکن ان تمام مخطوطات میں ایک مخطوطہ دیکھ کر دل پر جو کچھ گذری' اسے حیطۂ تحریر میں لانا مشکل ہے۔ میں تفسیر کی ایک کتاب دیکھ رہا تھا کہ ناظم کتب خانہ نے اچانک ایک اور قلمی نسخہ میرے سامنے کر دیا' اور اس طرف متوجہ ہونے کا مشورہ دیا۔ میں نے نظر اٹھائی تو یہ امام راغب اصفہانیؒ کی ''مفردات القرآن'' کا ایک قلمی نسخہ تھا جس کے حروف جگہ جگہ سے اڑے ہوئے تھے' جیسے کبھی ان پر پانی گر گیا ہو۔ ابھی میں اس نسخے کی کوئی خصوصیت دریافت نہ کر سکا تھا کہ ناظم کتب خانہ نے اس ٹائٹل پر لکھی ہوئی ایک عبارت کی طرف اشارہ کیا' اور کہا: ''اسے پڑھیے۔'' میں نے پڑھا تو عبارت یہ تھی:۔

''لقد انتشلت هذا الكتاب من نهر دجلة بعد ان رماه التتر و ذالک سنة ٦٥٦ ه وانا الفقير اليه تعالیٰ عبد الله بن محمد ابن عبد القادر المكي.''

میں نے ٦٥٦ھ میں یہ کتاب دریائے دجلہ میں پڑی ہوئی پائی تھی' جب کہ اسے

تا تاریوں نے وہاں ڈال دیا تھا' میں نے یہ کتاب وہیں سے اٹھالی تھی۔

فقیر عبداللہ بن محمد بن عبدالقادر مکی

اس عبارت نے ذہن میں ساڑھے سات سو سال پہلے کے دلگداز واقعات کی ایک فلم چلادی۔ تاریخ میں پڑھا تھا کہ تا تاریوں نے بغداد پر قبضے کے بعد مسلمانوں کی کتابوں سے دریائے دجلہ پر پل تعمیر کیا تھا' اور کتابوں کی روشنائی سے دجلہ کا رنگ تک متغیر ہو گیا تھا۔ علم و حکمت کے کیسے کیسے خزانے اس وحشت و بربریت کی نذر ہوئے؟ ان کی تفصیل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ لیکن یہ قلمی نسخہ اس تاریخی واقعہ کی اصلیت کی آج بھی شہادت دے رہا ہے۔

(جہان دیدہ)

☆

پاکستان ٹیلی ویژن پر بانئ پاکستان کا ''ذکر خیر''

بانئ پاکستان محمد علی جناح پاکستانی قوم کے مسلمہ ہیرو ہیں، ۱۹۴۷ء سے قبل جن افراد اور تحریکوں نے تقسیم ہند اور قیام پاکستان کی بھرپور مخالفت کی تھی، وہ اور ان کی باقیات بھی سیاسی اختلافات کے باوجود ان کا ذکر عزت و احترام سے کرتے ہیں۔ اور اگر کبھی خدانخواستہ حزب اختلاف کے کسی فرد کی زبان و قلم سے کوئی حرف، کوئی نقطہ یا کوئی شوشہ ایسا نکل جائے، جس سے بانئ پاکستان کی ذات پر انگشت نمائی کا در، وا ہوتا ہو تو پاکستان کا پریس بلا تاخیر حرکت میں آ کر اسے ''دشمن ملک'' و ''غدار ملت'' اور پاکستانی آئین کے تحت قابل گردن زدنی قرار دیتا ہے۔ لیکن کیا یہ بات باعثِ تعجب نہیں کہ اسی ملک کا سرکاری میڈیا اور قومی اخبارات تک بعض اوقات ''بانئ پاکستان''، ''بابائے قوم'' اور ''قائدِ اعظم'' کے بارے میں انتہائی قابل اعتراض ریمارکس پیش کر جاتے ہیں اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی، اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو!

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۳ اپریل ۱۹۹۰ء کے مطابق پاکستان ٹیلی ویژن سے ٹیلی کاسٹ ہونے والے پروگرام ''مہمان خصوصی'' میں سردار شوکت حیات نے کہا:

''قائد اعظم نے مجھے بلایا اور مجھے اپنے پاس بٹھائے رکھا۔ انہوں نے جب

سگریٹ سلگایا تو میں نے سوچا کہ یہ بدتمیز انسان ہے۔جس نے سگریٹ آفر (پیش) نہیں کیا۔ پھر میں نے بھی اپنا سگریٹ سلگایا۔اس دوران میں بیٹھا رہا' مگر انہوں نے میری طرف توجہ ہی نہ دی۔''

جن دنوں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا

(چودھری غلام نبی مرحوم کی یادیں)

ذوالفقار علی بھٹو وزیراعظم پاکستان کو دو باتوں کا مغالطہ لگ گیا اور وہ اسی ادھیڑ بن میں رہے کہ قادیانی اچھے بھلے مسلمان ہیں انہیں کافر کیوں قرار دیا جائے اور قادیانیوں کی اتنی بڑی اور منظم جماعت ہے۔ان کے پاس اسمبلی میں اپنے دفاع کے لئے بہت مواد ہوگا۔وہ اپنا دفاع خوب کرلیں گے۔اس نے اسی غلط فہمی کی وجہ سے (آنجہانی) مرزا ناصر احمد کو اسمبلی میں مسلمانوں کے سوالوں کے جوابات دینے کی دعوت دی اور کہا کہ آؤ مسلمانوں کے سوالوں کے جواب دو' خوب تیاری کر کے تاکہ کسی کے دل میں حسرت نہ رہے۔ یہ مسلمانوں کے لئے بہت ہی اچھا ہوا۔مجلس تحفظ ختم نبوت کے اسلام آباد دفتر میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ نے ڈیرہ لگایا۔مولانا اللہ وسایا، مولانا عبدالرحیم اشعر، فاتح قادیان مولانا محمد حیاتؒ، مولانا محمد شریف جالندھریؒ اور قومی اسمبلی کے رکن اور جمعیت علماء اسلام کے ناظم اعلیٰ مولانا مفتی محمودؒ بھی دفتر سے وابستہ ہوگئے۔مولانا مفتی محمودؒ کو جماعت کی طرف سے قومی اسمبلی میں نمائندہ مقرر کردیا گیا۔صبح سے شام تک آنجہانی مرزا غلام احمد کی کتابیں سامنے رکھ کر حوالوں پر نشان لگائے جاتے اور کیس تیار ہوتا رہتا، جو مولانا مفتی محمود صاحب کے حوالے کردیئے جاتے۔ایک روز (آنجہانی) مرزا ناصر جب قومی اسمبلی میں داخل ہوا تو بھٹو نے وزیر قانون عبدالحفیظ پیرزادہ کی طرف دیکھ کر کہا:

''دیکھو! کیسا بزرگ آدمی ہے۔اس کی اتنی اچھی داڑھی اور نورانی چہرہ ہے' اس کو کافر کہتے ہیں؟''
(تحریک کشمیر سے تحریک ختم نبوت تک)

.....☆.....

مولانا مفتی محمودؒ کا اسمبلی میں خطاب

مولانا مفتی محمودؒ نے اسمبلی میں اپنا کیس پیش کیا۔ سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو مفتی محمود صاحب، آنجہانی مرزا قادیانی کی کتابوں کے حوالے پڑھتے گئے۔ اس وقت قومی اسمبلی کے تمام ارکان مفتی صاحب کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے اور سبھی ہمہ تن گوش تھے۔ مفتی محمودؒ مرحوم فرمانے لگے:

''بھائی! میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ یہ مرزا صاحب کی کتابیں پڑی ہیں، جس کو شک ہے وہ آکر دیکھ لے اور مرزا ناصر اسمبلی میں موجود ہے۔ یہ میرے کسی حوالے کو جھٹلائے تو میں مان لوں گا۔''

آنجہانی مرزا ناصر خاموش تھا اور پانی پیئے جا رہا تھا۔ وہ پسینہ میں شرابور ہو چکا تھا اور بار بار اپنا پسینہ صاف کر رہا تھا۔ اس طرح کئی روز بحث چلتی رہی۔ مفتی محمودؒ صاحب مقدمہ لڑتے رہے۔ مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ نے دفتر میں مصلیٰ بچھا لیا تھا اور ہر وقت دعاؤں میں لگے رہتے۔

''اے اللہ پاک! اپنے محبوبؐ کے صدقے اپنے محبوب کی عزت کی حفاظت فرما اور مسلمانوں کو اس فتنہ سے نجات دے۔''

اس اللہ کے بندے کی دعائیں لگاتار عرش عظیم تک پہنچ رہی تھیں۔ ایک روز مفتی محمودؒ صاحب نے بھٹو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''یہ مرزا غلام احمد قادیانی کی کتاب ہے۔ جس میں یہ لکھا ہے'' مجھے نہ ماننے والے کتیوں اور سورنیوں کی اولاد ہیں۔ ان کی عورتیں جنگلوں کی سورنیاں ہیں اور یہ خود ولد الحرام ہیں۔'' آپ مرزا ناصر سے پوچھئے کہ یہ عبارت غلط ہے؟ بھٹو صاحب مرزا غلام احمد قادیانی نے کسی کو معاف نہیں کیا' اس میں تم بھی آگئے ہو اور ہم بھی۔''

بھٹو صاحب نے (آنجہانی) مرزا ناصر سے پوچھا'' کیا یہ عبارت ٹھیک ہے؟''

جواب: ہاں۔

''تم بھی اسے مانتے ہو؟''

جواب: ہاں۔

مفتی محمودؒ صاحب فرمایا کرتے تھے۔ اس وقت مرزا ناصر بار بار پسینہ صاف کر رہا تھا اور ساتھ پانی بھی پیے جا رہا تھا۔ بھٹو صاحب نے حفیظ پیرزادہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''یہ بہت بے ایمان ہے۔ ہمیں صاف گالیاں دی جا رہی ہیں۔''

اب بحث شروع ہوئی تو مفتی صاحب نے فرمایا:

''اب باقی کیا رہ گیا ہے، دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہو گیا ہے۔''

اس طرح مرزا ناصر کو بری طرح شکست ہوئی اور پوری اسمبلی کے سامنے اس نے مفتی صاحبؒ کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ مفتی صاحب نے فرمایا:

''اب سب مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ یہ کافر ہیں۔ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ اب تم بھی مان لو۔''

اس پر کافی لے دے ہوئی۔ مفتی محمودؒ صاحب فرماتے ہیں:

''رات کا ایک بج گیا۔ بھٹو صاحب بضد رہے کہ کافر تو لکھوا لو مگر غیر مسلم نہ لکھواؤ۔ ہم رات ایک بجے غصہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ اب صبح ہونے دو، دیکھو پھر کیا ہوتا ہے''۔ جب ہم دروازے میں آ گئے تو بھٹو صاحب نے بھاگ کر ہمیں پکڑ لیا اور کہنے لگا کہ مفتی صاحب آؤ! جیسا آپ کہتے ہیں ویسا لکھ دیتا ہوں۔ بالآخر بھٹو صاحب نے ہمارا مطالبہ مان لیا اور قادیانیوں کو کافر اور غیر مسلم قرار دے دیا گیا۔ اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کر لیا گیا کہ قادیانی کلیدی آسامیوں پر فائز نہیں رہیں گے۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ بھٹو صاحب نے دستخط کر دیئے۔ پھر تمام ارکان اسمبلی نے باری باری دستخط کئے' اس طرح متفقہ طور پر قرارداد منظور ہوگئی۔''

مولانا مفتی محمودؒ صاحب اسمبلی ہاؤس سے باہر نکلے اور سیدھے دفتر مجلس تحفظ ختم نبوت آ گئے۔ وہاں مفتی صاحب کا بڑی شدت سے انتظار ہو رہا تھا۔ مفتی صاحبؒ پہنچے تو حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ مصلے پر سجدہ ریز تھے اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگ رہے تھے۔ آنسوؤں سے ان کی داڑھی تر ہو گئی تھی۔ مفتی صاحبؒ تشریف لائے اور انہوں نے آواز دی:

''حضرت! اللہ پاک کا شکر ہے۔ ہمارا مطالبہ مان لیا گیا۔ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا۔''

حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ دوبارہ سجدہ ریز ہوکر شکر بجالائے۔ وہ روتے جاتے تھے اور کہہ رہے تھے:

''اللہ پاک! ہم آپ کا شکر کیسے ادا کریں۔ آپ نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔''

سجدہ سے اٹھتے ہوئے فرمانے لگے:

''اللہ تعالیٰ نے مجھے سرخرو کیا ہے۔ مرنے کے بعد امیر شریعتؒ سے ملاقات ہوئی تو میں کہہ دوں گا کہ آپ کے مشن میں تھوڑا سا حصہ ڈال کر آیا ہوں، آپ نے ختم نبوت کے جس پودے کو پانی دیا تھا، میں اسے پھل لگے ہوئے دیکھ آیا ہوں۔ دوستو! میری بات سن لو، حضرت عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو امیر شریعت کا خطاب اس وقت کے پانچ سو اَجل علماء نے دیا تھا اور میری خوش قسمتی ہے کہ میرے دستخط دوسرے یا تیسرے نمبر پر موجود ہیں۔''

☆

مشہور سیاح ''ابن بطوطہ'' کے چند نوادرات

''مالی'' میں قیام کے دوران میں نے دیکھا کہ حبشیوں سے زیادہ کوئی قوم اپنے بادشاہ کا ادب نہیں کرتی' وہ بادشاہ کی قسم کھاتے ہیں' اور ان کے ہاں یہ رواج ہے کہ جب بادشاہ برج میں بیٹھ کر دربار لگاتا تھا تو جب کسی شخص کو طلب کرتا تو وہ شخص اپنے کپڑے اتار کر پرانے کپڑے پہن لیتا ہے' ایک میلی ٹوپی سر پر رکھ لیتا ہے' اپنے پائینچے آدھی پنڈلی تک چڑھالیتا ہے' اور نہایت ذلت اور بے چارگی کی شکل میں زمین پر کہنیاں ٹیکتا ہوا جاتا ہے۔

جب ان میں سے کوئی شخص بادشاہ سے بات کرتا ہے اور بادشاہ اس کا جواب دیتا ہے تو وہ شخص اظہار تشکر کے طور پر اپنی کمر سے اپنے کپڑے علیحدہ کر دیتا ہے اور اپنے سر پر اور کمر پر اس طرح مٹی ڈالتا ہے' جس طرح غسل کرنے کے وقت پانی ڈالا جاتا ہے' جب بادشاہ دربار میں کوئی بات کرتا ہے تو کل حاضرین اپنے سروں سے عمامہ اتار دیتے ہیں۔ (سفرنامہ ابن بطوطہ)

☆

سوڈانیوں کے جو افعال مجھے ناپسند آئے وہ یہ ہیں کہ لونڈیاں نوکر عورتیں اور چھوٹی لڑکیاں مادرزاد ننگی پھرتی ہیں' رمضان کے مہینے میں اکثر ایسی عورتیں دیکھنے میں آتی ہیں' کیونکہ وہاں

پر رواج ہے کہ ہر ایک امیر، بادشاہ کے محل میں روزہ کھولتا ہے، ہر ایک امیر کا کھانا بیس سے زیادہ لونڈیاں لاتی ہیں اور وہ سب ننگی ہوتی ہیں۔

جب کوئی عورت بادشاہ کے سامنے آتی ہے تو ننگی آتی ہے، خود بادشاہ کی بیٹیاں بھی ننگی ہوتی ہیں، رمضان کی ستائیسویں شب کو میں نے دیکھا کہ بادشاہ کے محل سے سو کے قریب عورتیں کھانا لے کر نکلیں، ان کے ساتھ بادشاہ کی دو بیٹیاں بھی تھیں جو جوان تھیں اور بالکل ننگی تھیں۔

یہ بھی ان میں عیب ہے کہ ادب کے لیے اپنے سروں پر خاک ڈالتے ہیں، شاعر شعر پڑھتے ہوئے مسخروں جیسی شکل بناتے ہیں اور اکثر حبشی، مردار کتے اور گدھے کھا جاتے ہیں۔ وہاں رہتے ہوئے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ساتھ والے ملک میں ایسے حبشی بھی رہتے ہیں جو مردم خور ہیں، ایک دفعہ ان کے کچھ لوگ ادھر آئے تو یہاں کا بادشاہ ان کو روزانہ ایک آدمی کھانے کے لیے دیتا رہا۔ وہ کالے آدمی کا گوشت شوق سے کھاتے ہیں، گورے آدمیوں کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ وہ کچے ہوتے ہیں اس لیے ان کا گوشت کھانا مضر ہے۔ (سفرنامہ ابن بطوطہ)

☆

جزائر مالدیپ کی عورتیں ناف سے اوپر ننگی رہتی ہیں اور بازاروں، گلیوں میں اسی طرح پھرتی رہتی ہیں، جب میں وہاں قاضی مقرر ہوا تو میں نے حکم دیا کہ میری عدالت میں کوئی عورت اس طرح ننگے بدن نہ آئے۔ اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکا۔

میری کنیزیں اہل دلی کی طرح مکمل لباس میں ملبوس رہتی تھیں، وہ عورتیں انہیں اس طرح کپڑے پہنے دیکھ کر برا مناتیں، نکاح اس جزیرے میں بہت آسانی سے ہو جاتا ہے کیونکہ ''حق المہر'' تھوڑا ہوتا ہے۔ یہاں کی عورتیں صرف بیوی نہیں بنی رہتیں بلکہ کھانا لے آتی ہیں، لے جاتی ہیں، ہاتھ دھلاتی ہیں، وضو کے لیے پانی لاتی ہیں اور سوتے وقت پاؤں دباتی ہیں۔

وہاں کی عورتیں اپنے خاوند کے ساتھ ہرگز کھانا نہیں کھاتیں بلکہ خاوند کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کھاتی ہیں، وہاں پر میں نے کئی عورتوں سے نکاح کیا، بعض نے میرے اصرار پر میرے ساتھ کھانا کھا لیا، لیکن بعض نے میرے ساتھ کھانا نہ کھایا، میں نے بہت کوشش کی اور بہت طریقے آزمائے لیکن میں نے انہیں کھانا کھاتے نہ دیکھا۔ (سفرنامہ ابن بطوطہ)

☆

''بیروت'' میں مجھے مزار ''ابو یوسف یعقوبؒ '' کی زیارت کا موقعہ ملا' جو مغرب اقصیٰ کے بادشاہوں میں سے تھے اور جن کے متعلق مشہور ہے کہ اپنے وطن آ کر ملک نورالدین کے ایک باغ میں نگہبان مقرر کیے گئے۔ چھ ماہ کے بعد سلطان نورالدین باغ میں آیا' اور انہیں حکم دیا کہ باغ میں سے کچھ میٹھے انار توڑ کے لاؤ' وہ جو انار توڑ کے لے گئے وہ کھٹے نکلے۔ دوبارہ اور سہ بارہ انہیں بھیجا گیا' لیکن ہر دفعہ وہ جو انار توڑ کے لے آتے وہ کھٹے نکلتے' باغ کے داروغہ نے انہیں کہا کہ چھ مہینے ہو گئے ہیں تمہیں ابھی تک یہ معلوم نہیں کہ کون سے انار میٹھے ہیں؟ ابو یعقوب یوسف نے جواب دیا' آپ نے مجھے باغ کی رکھوالی کے لئے رکھا تھا انار چکھنے کے لئے نہیں۔ بادشاہ کو اس بات کا پتہ چلا تو ان کا بہت اعزاز و اکرام کیا۔ (سفرنامہ ابن بطوطہ)

......☆......

میں ''جاوا'' کے بادشاہ کے پاس گیا۔ اس نے میری بہت پذیرائی کی اور کہا ''تم تین دن تک ہمارے مہمان ہو اس کے بعد جانے کی اجازت ہے''۔ بادشاہ کے دربار میں میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے اپنے گلے پر چھری رکھی اور اپنی زبان میں کچھ کہا پھر چھری کو مضبوط پکڑ کر اپنا گلہ اس طرح کاٹا کہ سر علیحدہ جا پڑا۔

مجھے نہایت تعجب ہوا۔ بادشاہ نے مجھ سے دریافت کیا ''تمہارے ملک میں بھی کوئی اس طرح کرتا ہے؟''

میں نے کہا، ہرگز نہیں۔

بادشاہ یہ سن کر ہنسا اور کہا' یہ میرے غلام ہیں، مجھ سے اس قدر محبت کرتے ہیں کہ مجھ پر اپنی جان قربان کر دیتے ہیں۔

پھر اس کے جلانے کا حکم دیا اور اس کی اولاد کا وظیفہ مقرر کیا۔ ایک شخص نے مجھے بتایا کہ اپنا گلہ کاٹنے سے پہلے اس نے بادشاہ سے کہا تھا کہ بادشاہ اس کو اس قدر پیارا ہے کہ اپنی جان اس پر نچھاور کرتا ہے۔ یہی کچھ اس کے باپ دادا نے بادشاہ کے باپ دادا کے لئے کیا تھا۔

(سفرنامہ ابن بطوطہ)

......☆......

ایک موقعہ پر میں ''ابرہی'' شہر میں موجود تھا' تین ہندو لڑائی میں مارے گئے' تو ان کی بیویوں نے ''ستی'' ہونے کا ارادہ کر لیا' تین دن پہلے وہ گانے بجانے اور کھانے میں مصروف ہو گئیں' چوتھے دن ان کے پاس گھوڑے لائے گئے۔ ہر بیوہ نے بناؤ سنگھار کیا' خوشبو لگائی اور ایک ایک گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ ان کے ایک ہاتھ میں ناریل تھا جسے وہ اچھال رہی تھیں اور دوسرے ہاتھ میں آئینہ تھا جس میں وہ اپنی شکل دیکھ رہی تھیں' برہمن ان کے گرد جمع تھے۔ تمام رشتے دار ان کے ساتھ تھے' آگے آگے نقارے اور نوبت بجتی جا رہی تھی۔ ہر ایک ہندو انہیں کہتا' میرا اسلام میرے ماں باپ' بھائی یا دوست کو کہنا اور وہ کہتی تھیں اچھا اور ہنستی جاتی تھیں۔

میں بھی اپنے دوستوں کے ساتھ ان کے جلنے کی کیفیت دیکھنے گیا' جب یہ عورتیں جلانے والی جگہ پر پہنچیں تو غسل کیا' اپنے کپڑے اور زیورات اتار دیئے اور انہیں خیرات کر دیا' ایک ایک موٹی ساڑھی پہن لی۔ ایک جگہ آگ دہکائی گئی۔ اس پر سرسوں کا تیل ڈال کر اسے دہکایا گیا' پندرہ آدمیوں کے ہاتھ میں لکڑی کے گٹھے بندھے ہوئے تھے' دس آدمیوں نے لکڑی کے بڑے بڑے ٹکڑے اٹھائے ہوئے تھے۔ نقارے اور نفیری والے انتظار میں کھڑے تھے۔

آگ کو ایک رضائی کی اوٹ میں کر لیا گیا تھا' تا کہ ان عورتوں کی اس پر نظر نہ پڑ سکے۔ ان میں سے ایک عورت نے زبردستی وہ رضائی ایک طرف ہٹا دی' اور کہا' کیا میں نہیں جانتی یہ آگ ہے؟ مجھے کیوں ڈراتے ہو؟ پھر اس نے آگ کی طرف دوڑ لگائی اور اس میں کود پڑی۔ اس وقت نقارے اور نفیریاں بجنی شروع ہو گئیں۔ لوگوں نے پتلی لکڑیاں جو ہاتھوں میں اٹھائی ہوئی تھیں آگ پر ڈالنی شروع کر دیں۔ اس کے اوپر لکڑی کے بڑے بڑے ٹکڑے ڈال دیئے گئے۔ تا کہ وہ عورت حرکت نہ کر سکے۔ حاضرین نے بھی شور مچانا شروع کر دیا۔ میں یہ دیکھ کر بے ہوش ہو گیا۔

(سفرنامہ ابن بطوطہ)

......☆......

سر جیمس جینس کا اضطراب و اعتراف

۱۹۰۹ء کا ذکر ہے، اتوار کا دن تھا اور زور کی بارش ہو رہی تھی، میں کسی کام سے باہر نکلا تو جامعہ کیمبرج کے مشہور ماہر فلکیات سر جیمز جینس **(James Jeans)** پر نظر پڑی جو بغل میں

انجیل دبائے چرچ کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے قریب ہو کر سلام کیا۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوبارہ سلام کیا تو وہ متوجہ ہوئے اور کہنے لگے "تم کیا چاہتے ہو" میں نے کہا، دو باتیں۔ اول یہ کہ زور سے بارش ہو رہی ہے اور آپ نے چھاتا بغل میں داب رکھا ہے۔ سر جیمز اپنی بدحواسی پر مسکرائے اور چھاتا تان لیا۔ دوم یہ کہ آپ جیسا شہرۂ آفاق آدمی گرجا میں عبادت کے لئے جا رہا ہے، یہ کیا؟ میرے اس سوال پر پروفیسر جیمز لمحہ بھر کے لئے رک گئے اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا "آج شام کو چائے میرے ساتھ پیو" چنانچہ میں شام کو ان کی رہائش گاہ پہنچا۔ ٹھیک ۴ بجے لیڈی جیمز باہر آ کر کہنے لگیں "سر جیمز تمہارے منتظر ہیں"۔ اندر گیا تو ایک چھوٹی سی میز پر چائے لگی ہوئی تھی، پروفیسر صاحب تصورات میں کھوئے ہوئے تھے' کہنے لگے "تمہارا سوال کیا تھا" اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اجرامِ آسمانی کی تخلیق، ان کے حیرت انگیز نظام' بے انتہا پنہائیوں اور فاصلوں' ان کی پیچیدہ راہوں اور مداروں نیز باہمی کشش اور طوفان ہائے نور پر وہ ایمان افروز تفصیلات پیش کیں کہ میرا دل اللہ کی اس داستانِ کبریا و جبروت پر دہلنے لگا۔ اور ان کی اپنی کیفیت یہ تھی کہ سر کے بال سیدھے اٹھے ہوئے تھے، آنکھوں سے حیرت وخشیت کی دوگونہ کیفیتیں عیاں تھیں' اللہ کی حکمت و دانش کی ہیبت سے ان کے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے، اور آواز لرز رہی تھی۔ فرمانے لگے "عنایت اللہ خاں! جب میں خدا کے تخلیقی کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو میری تمام ہستی اللہ کے جلال سے لرزنے لگتی ہے اور جب کلیسا میں خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر کہتا ہوں "تو بہت بڑا ہے" تو میری ہستی کا ہر ذرہ میرا ہمنوا بن جاتا ہے، مجھے بے حد سکون اور خوشی نصیب ہوتی ہے، مجھے دوسروں کی نسبت عبادت میں ہزار گنا زیادہ کیف ملتا ہے، کہو عنایت اللہ خاں! تمہاری سمجھ میں آیا کہ میں گرجے کیوں جاتا ہوں؟"

علامہ مشرقی کہتے ہیں کہ پروفیسر جیمز کی اس تقریر نے میرے دماغ میں عجیب کہرام پیدا کر دیا' میں نے کہا "جناب والا! میں آپ کی روح افروز تفصیلات سے بے حد متاثر ہوا ہوں' اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یاد آ گئی اگر اجازت ہو تو پیش کروں' فرمایا "ضرور" چنانچہ میں نے یہ آیت پڑھی:

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُوْدٌ ○

وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ط اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ط (فاطر : ۲۸،۲۷)

''پہاڑوں میں خطے ہیں، سفید اور سرخ اور طرح طرح کے رنگ کے اور کالے' اور آدمیوں میں اور کیڑوں میں اور چوپاؤں میں' اسی طرح مختلف رنگ ہیں، اللہ سے ڈرتے وہی ہیں اس کے بندوں میں سے جو علم رکھتے ہیں۔''

یہ آیت سنتے ہی پروفیسر جیمز بولے:

''کیا کہا...... اللہ سے صرف اہل علم ڈرتے ہیں، حیرت انگیز' بہت عجیب' یہ بات جو مجھے پچاس برس مسلسل مطالعہ و مشاہدہ کے بعد معلوم ہوئی، محمد ﷺ کو کس نے بتائی، کیا قرآن میں واقعی یہ آیت موجود ہے؟ اگر ہے تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے، محمدؐ ان پڑھ تھا، اسے یہ عظیم حقیقت خود بخود معلوم نہیں ہو سکتی' اسے یقیناً اللہ نے بتائی تھی' بہت خوب' بہت عجیب......''

(علامہ عنایت اللہ مشرقی۔ نقوش، شخصیات نمبر، صفحات ۹۔۱۲۰۸)

طبیعت کا چڑچڑا پن فطرت کی رسوائی

چڑچڑا پن فطرت کی رسوائی ہے۔ بعض اوقات معدے اور جگر کی خرابی اور قویٰ کی کمزوری سے انسان بھبوکا ہو جاتا ہے۔ اکثر غلط تربیت اور بے جا غرور بھی مزاج کو برہم رکھتے ہیں۔ معدے اور جگر اور قویٰ کی کمزوری کو با قاعدہ علاج اور مناسب ورزش سے درست کرنا چاہئے۔ سب سے اہم یہ کہ سیرت کو ایسی صورت دینی چاہئے کہ بیماری اور مصیبت میں بھی دل میں غصہ اور چہرے پر شکن نہ آنے پائے۔ اللہ کا ذکر بھی اس کا حتمی علاج ہے۔ یادِ حق اور عمل صالح یعنی خدمت ملت

سے بھی غصہ کی آگ فرو ہو جاتی ہے چل پھر کر کسبِ حلال اور خدمتِ خلق میں مصروف رہو۔ کم گوئی اختیار کرو اور زبان پر وردِ اسمائے الٰہی ہو' دل گلزار اور چہرہ پُر بہار ہو جائے گا۔ ہر ملنے والے کو یہی معلوم ہو گا کہ اس کی روح جسم کو چھوڑ کر استقبال کو آ رہی ہے۔ اچھے لوگ اس کی صحبت کو پسند کریں گے اور وہ دوستوں میں ستاروں سے گھرا چاند نظر آئے گا۔

دیوانی جوانی کے بلا خیز طوفانوں میں کہتے ہیں کون ہے جو ڈگمگا نہیں جاتا۔ یہ ان عوام کے لئے سچ ہے جو خدا کے نام کے چپو کے بغیر زندگی کی کشتی کھینچتے ہیں۔ جو نمازوں کی برکت اور ذکر کی کثرت کا سہارا لے کر چلتے ہیں وہ کبھی گرداب بلا میں نہیں پھنسے جونہی قدم غلط راہ کی طرف اٹھتا ہے کوئی نامعلوم ہاتھ کھلے اشاروں سے منع کرتا ہے۔ اکثر اس کے اور گناہ کے درمیان ناقابل عبور دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ عزیز! گناہوں پر جسارت زندگی کے خوش نما باغ کو برباد کر دینے والی چیز ہے۔ لیکن چالاک اور چالباز گلزار کو ویرانہ بنا کر سمجھتے ہیں کہ ہم نے دنیا میں بڑی فتح مندی حاصل کی۔ جوانی کے عیش بڑھاپے میں آگ کے انگارے بن جاتے ہیں۔ عمر کے آخری حصہ میں انسان مصیبت بھری زندگی کا خیال کر کے لمبی راتیں آہیں بھر کر گزارتا ہے۔ جس عیش کا انجام غم ہے اس کو اختیار کر کے بربادی کو کیوں خریدا جائے۔

داغدار کپڑا بے داغ لباس کے برابر نہیں ہوتا لیکن گناہوں کے داغ روح کو ذکر الٰہی اور استغفار کے پانی سے دھویا جا سکتا ہے۔ گناہ اور ظلم کے میدان میں آنکھیں بند کر کے بڑھے چلے جانا دوزخ کی لپیٹ میں آ جانا ہے۔ معصوم فطرت کو پروردگار کے حضور میں لے جانا تو بہت ہی بڑی کامیابی ہے لیکن تائب دل کے ساتھ اس کے حضور میں پیش ہونا کوئی کم کامرانی نہیں۔ کوئی ماں کا جان سے پیارا بچہ نافرمانیوں سے تائب ہو جائے اور گردن جھکا کر ندامت کے آنسو آنکھوں میں بھر لائے ماں کا دل کیا پسیج جانے سے رہے گا۔ یہی حال خدا کی کرم فرمائیوں کا ہے۔ زبان پر اس کا ذکر دل میں اس کی ناراضگی کی فکر ہو اور تڑپ تڑپ کر معافی مانگے تو ؎

رحمت از درِ حق بہر استقبال مے آید

کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ندامت کے آنسو بطور توبہ کے قبول کر لئے جاتے ہیں۔ یہ کارخانۂ قدرت کس کا ہے بس اس کارگاہِ ہستی میں قدیر کے قانون توڑنے والا اس سے معافی کا خواستگار ہو

جائے اور آئندہ خدا کی دی ہوئی قوت وعقل اللہ کی راہ میں لگائے اور خدمتِ خلق میں اتنا مبالغہ کرے کہ قادر پھر اس کی وہی قدر کرنے لگے۔ لیکن اس عزیز کی طرح نہ ہو جو ساری رات دادِ عیش دے کر ہر صبح مصلّے پر بیٹھ کر زار و قطار روتا تھا اور تڑپ تڑپ کر تڑپا دینے والی لے میں یہ شعر پڑھتا تھا۔

کردم ز شراب ناب توبہ
و ز گفتہ ناثواب توبہ

اور پھر شراب کی بدمستیوں میں مبتلا ہو کر ہمسائے میں بسنے والے غریبوں کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ رات کو پینا اور صبح کو توبہ کرنا توبہ سے تائب ہونا ہے۔ سچی توبہ تو طبیعت کا خوشگوار انقلاب ہے اور سوکھے دھانوں کو ندامت کے آنسوؤں سے سینچ کر ہرا کرنا ہے۔

بعض لوگ حماقت سے غلطیوں پر اصرار کیے جاتے ہیں اور شیخی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اختیار کردہ راہ سے ہٹنا خواہ غلط ہی ہو ان کی شان کے خلاف ہے مگر یہ شان مسلمان کا شیوہ نہیں، ایسی جہالت پر کسی ابوجہل کو فخر کرنے کے لئے چھوڑ دو۔ خدارا زندگی کی فرصتوں کو غنیمت جانو اور برے راستوں سے لوٹ آؤ اور اللہ کا راستہ اختیار کرو، اپنی جانوں کو بنی نوع انسان کے لئے مشکلات میں ڈالو تا کہ سب کے کام آسان ہوں۔ دنیا میں راحت طلبی کے معنی دوسروں کے آرام کو قربان کرنا ہے۔ عزیز! ایسے راستوں سے بچ جاؤ۔ آپ پہلے قربان ہو جاؤ تا کہ دنیا میں قربانی کی روح پیدا ہو جائے یوں شاید کسی کو قربانی ہی نہ کرنا پڑے۔ اس طرح شاید سب کے لئے دن عید اور رات شب برأت ہو کر گزرے۔ اس وقت چند بڑے آدمیوں کی سرکشی اور عدوان نے تمام ملت کو مبتلائے مصیبت کر رکھا ہے۔ ان کی آرام طلبیاں اور عیش پسندیاں بڑے رنگ لا رہی ہیں اور یوں ساری قوم کی سیرت فنا ہو رہی ہے۔ (دین اسلام، از چودھری افضل حق)

......☆......

یہی عرب جنہوں نے پوری دنیا کو اسلامی اخوت کا سبق دیا تھا آج غریب مسلمان ممالک کے افراد کا پاسپورٹ دیکھ کر ان کی آنکھوں سے نفرت جھلکنے لگتی ہے اور کافروں کے رخساروں پر ان کی دولت پانی کی طرح بہتی ہے۔ عرب چاہتے تو پٹرول کے خزانے کو استعمال کر کے ساری دنیا کے مسلمانوں کو آزادی دلا سکتے تھے اور اسلام کی عظمت رفتہ کو بحال کر سکتے تھے لیکن وہ تو

خود پٹرول میں بہہ کر غلامی کی دلدل میں جا پھنسے ہیں اور اب ان سے ان کی تہذیب وثقافت اور ان کا دین سب کچھ چھینا جا رہا ہے۔ایک زمانہ تھا (اور یہ زمانہ پھر آئے گا) جب لوگ ایمان بچانے کے لئے حرمین کی طرف دوڑتے تھے۔لیکن آج حرمین والوں کواپنا ایمان بچانے کے لئے افغانستان کے سنگلاخ پہاڑوں کی پناہ لینا پڑتی ہے۔ایک زمانہ تھا جب عرب سوکھی روٹی کھا کر دنیا پر حکومت کرتے تھے لیکن آج وہ سونے چاندی میں نہا کر بھی محکوم ہیں اور اپنے ملکوں میں اجنبی اور غلام بنتے جا رہے ہیں۔اللہ تعالیٰ عربوں پر اور تمام مسلمانوں پر رحم فرمائے۔اب تو بعض عربی قلمکار اسلام کوایک طرف ہٹا کر اپنے عربی ہونے پر فخر کر رہے ہیں۔(مسکراتے زخم از مولانا مسعود اظہر)

......☆......

دنیا کی ریل پیل اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی وقعت نہیں رکھتی۔یہ پاخانے کے ڈھیر کسی کے پاس زیادہ ہوں یا کم اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔چنانچہ شاہ فیصل مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ اگر اس پٹرول کی وجہ سے ہماری اسلامی عزت یا غیرت پر آنچ آئی تو ہم اپنے محلات گرا کر دوبارہ خیموں میں چلے جائیں گے اور تلواروں کے سائے تلے عزت کی زندگی گزاریں گے۔کاش شاہ فیصل مرحوم کی یہ سوچ ان کے جانشینوں میں بھی منتقل ہو جائے اور وہ اپنے دین اور اپنی قوم کا اس قدر ستا سودا نہ کریں جس قدر آج ہو رہا ہے اور یہودی منہ چھپا چھپا کر مسلمانوں پر ہنس رہے ہیں۔میرا جب بھی سعودی عرب جانا ہوتا ہے وہاں کے ایئر پورٹ سے ہی یہ خیالات میرے ذہن کو کچوکے لگاتے ہیں۔سعودی اہلکاروں کی نفرت بھری نگاہوں پر بھی مجھے غصہ کم اور رحم زیادہ آتا ہے۔کیونکہ وہ جس مال کے بل بوتے پر یہ سب کچھ کرتے ہیں وہ مال تو خود ان کے لیے وبال بنتا جا رہا ہے اور ان کی نسلوں سے اسلام اور عربیت نکلتی جا رہی ہے اور دنیا کے بڑے کافروں نے ان عرب شہزادوں کو اپنا بار بردار جانور سمجھ رکھا ہے۔ایسا جانور جوان کے ہر نخرے کو برداشت کرتا ہے۔ہر حکم پر لبیک کہتا ہے اور ان کے کہنے پر اپنی ملت اور قوم تک سے غداری کرتا ہے۔کاش!عربوں کو بھی اپنے میں سے کوئی ملا عمر ملے جو اس قوم کو غیرت عزت واستغناء کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا جا سکے اور دوست دشمن کی پہچان کرائے۔
(ایضاً)

کشمیر کے کئی تالابوں اور چشموں میں اعلیٰ قسم کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں لیکن کشمیر کے

مسلمان اس قیمتی اور لذیذ نعمت خداوندی سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور ان کا یہ عقیدہ بن چکا ہے کہ ان مچھلیوں کا شکار کرنا اور انہیں کھانا ایسا جرم ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت سزا ملتی ہے۔ کشمیریوں کے اس قابل اصلاح نظریئے کا پس منظر یہ بتایا جاتا ہے کہ کشمیر کے پنڈتوں نے جب مسلمانوں کو مچھلی کے گوشت سے فائدہ اٹھاتے دیکھا تو وہ حسد کی وجہ سے جل بھن کر رہ گئے اور ان سے یہ بات برداشت نہ ہوئی کہ غریب مسلمان کوئی اچھی غذا استعمال کریں۔ چنانچہ پنڈتوں کے ایک بڑے مذہبی راہنما نے مہاراجہ کو جا کر بتایا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ آپ کے والد نے مچھلی کی شکل میں دوسرا جنم لے لیا ہے اور مجھے خطرہ ہے کہ مسلمان آپ کے والد کو پکڑ کر کھا نہ جائیں۔ یہ بات سنتے ہی تو ہم پرست مہاراجہ نے مچھلی کے شکار پر پابندی عائد کر دی اور پنڈتوں نے اس پابندی کے ساتھ کئی طرح کی جھوٹی روایات بھی عام کر دیں اور یوں کشمیر کے مظلوم مسلمان ایک اور نعمت سے محروم کر دیئے گئے۔ اب الحمدللہ اکثر مسلمانوں کے ذہن سے یہ بات محو ہو چکی ہے۔ لیکن اب بھی کئی تالابوں اور چشموں پر اس توہم پرستی کے سائے پڑے ہوئے ہیں اور وہاں کے مسلمان ان مچھلیوں کو خاص مخلوق اور اونچی روحیں سمجھ کر ان کا شکار نہیں کرتے۔ بلکہ اگر مجاہدین میں سے کوئی ان تالابوں سے مچھلی پکڑ لے تو اس پر سخت برہم ہوتے ہیں اور ان برتنوں کو پھینک دیتے ہیں جن میں یہ مچھلیاں پکائی گئی ہوں اور عذاب کے ڈر سے اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیتے ہیں۔ (ایضاً)

......☆......

پولیس اور فوج کی حقیقی اصلیت گرفتاری کے بعد نظر آتی ہے۔ ورنہ عام طور سے یہ لوگ معزز افراد کے ساتھ ہمیشہ اخلاق اور شائستگی سے پیش آتے ہیں لیکن اگر کسی مجلس میں انہیں ان معزز افراد کو گرفتار کرنے کا موقع مل جائے تو ان کی شائستگی فوری طور پر تلخی اور بدتمیزی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ ایسے بدتہذیب بن جاتے ہیں جس سے کوئی اس بات کا تصور نہیں کر سکتا کہ یہ کبھی کسی کے ساتھ شائستگی سے پیش آئے ہوں گے۔ میں چونکہ اس سے پہلے کبھی گرفتار نہیں ہوا تھا' اس لئے میں نے پولیس اور فوج کے افسروں کو ہمیشہ اخلاق سے بات کرتے سنا اور دیکھا تھا لیکن اس واقعہ کے بعد جب میری گرفتاریوں کا ایک سلسلہ چل نکلا تو مجھے پولیس اور فوج کے افسران کے اس متضاد رویے کو بار بار دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ لوگ کسی شخص کو عزت کے ساتھ کرسی پر بٹھا کر بات چیت

کرتے ہیں اور اپنی گفتگو میں اخلاق، محبت اور رواداری کی مٹھاس اچھی طرح بھر لیتے ہیں۔ لیکن اگر ان کی بات نہ چلے یا ان کو اپنے اوپر والوں کی طرف سے اس شخص کے بارے میں "کھلا ہاتھ" مل جائے تو فوراً کرسی سے اٹھا کر گالم گلوچ شروع کر دیتے ہیں اور اس بات پر بھی ایذاء پہنچاتے ہیں کہ تم تھوڑی دیر پہلے کرسی پر کیوں بیٹھے ہوئے تھے۔ برصغیر میں پولیس اور فوج کا تربیتی نظام انگریز کا جاری کردہ ہے اور یہ نظام انسان کو اپنے سے طاقتور کی چاپلوسی اور اپنے سے کمزور پر ظلم کا سبق سکھاتا ہے، منافقت اور موقع پرستی اس نظام کی خصوصیات اور اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال اس نظام کا خاصہ ہے، اسی نظام سے تربیت پانے والے افراد مجبوری کی حالت میں بااخلاق جب کہ عام حالات میں ظالم اور بداخلاق ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دوسروں کو بے عزت کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ جب کہ خود ان کی ذاتی اور گھریلو زندگیاں ان کی بری عادتوں اور بداخلاقی کی وجہ سے تباہ ہو جاتی ہیں اور اپنی اس نجی زندگی میں قدم قدم پر ذلیل اور خوار ہونا ان کا مقدر بن جاتا ہے۔ اوپر والے افسروں کا آنکھیں بند کرنے کے حکم دینا اور ماتحتوں کا ہر بات پر "لیس سر کہنا" ان کے اندر سے انسانی بلندی اور اعلیٰ ظرفی اس طرح نکال دیتا ہے کہ ان کے دل سے عہدے کے سوا ہر بات کی قدر نکل جاتی ہے۔ چنانچہ اپنے سے بڑے عہدے والوں کی ہر بے وقوفی کو برداشت کرنا اور اسے قبول کرنا جب کہ اپنے سے کم عہدے والے کی ہر مفید بات کو ٹھکرانا اور بدلنا ان کی عادت بن جاتی ہے۔ بڑا افسر اگر گالی بھی دے یا کوئی نقصان دہ بات کہے تو وہ "جی سر" کہہ کر قبول کرتے ہیں۔ جب کہ کم عہدے والا آدمی اگر انہیں آب حیات کا پتہ بھی بتائے تو "شٹ اپ" کہہ کر اس کی بات مسترد کر دیتے ہیں۔ انگریز کے غیر انسانی اور بے ہودہ نظام کا یہ اثر پولیس اور فوج کے اکثر عہدے دار قبول کر لیتے ہیں۔ جب کہ بعض خوش قسمت اپنی فطری یا خاندانی خوبیوں کی بدولت ان اثرات سے قدرے محفوظ رہتے ہیں۔ (ایضاً)

......☆......

ایک دفعہ ایک ہندو طوائف، جو ناچ گانے میں مشہور ہے، میرے پاس بیٹھی تھی کہ ایک بڑے دہلوی غیر مقلد مولانا صاحب تشریف لے آئے، اور طوائف کو دیکھ کر انہوں نے زور سے لاحول پڑھی، مولانا کی "لاحول" سن کر طوائف کو اپنے گناہ کا احساس ہوا، اور وہ رونے لگی۔ میری اس

کے رونے سے وجد کی سی حالت ہوگئی اور میں نے اس سے کہا۔

''اری سن' سن' میرا اور تیرا تو ایک ہی حال ہے' تو بھی لوگوں کو لوٹنے کے لیے بناوٹی کپڑے اور زیور پہن کر فریب کی شکل بناتی ہے اور میں بھی پرہیزگار مشہور ہونے کے لئے داڑھی اور سر کے بال بڑھاتا ہوں اور لمبا کرتا پہنتا ہوں' تو بھی محفل میں ناچتی ہے اور میں بھی قوالی میں رقص کرتا ہوں۔ مگر تو روتی ہے کیونکہ تجھ کو اپنے گناہوں کا اقرار ہے' اور میری آنکھ میں آنسو نہیں آتا' کہ میں اپنی ریاکاری سے غافل ہوں۔'' (روزنامچہ خواجہ حسن نظامی)

☆......

پٹنہ لائبریری میں سب سے عجیب جو کتاب میری نظر سے گذری' وہ چالیس پاروں کا قرآن شریف تھا۔ شیعوں کا یہ دعویٰ ہے کہ دس پارے قرآن پاک کے تلف کر دیئے گئے ہیں۔ یہ قرآن بھی کتب خانہ عادل شاہیہ کا ہے۔ اس میں ایسی سورتیں ہیں جو متداول نسخے میں نہیں ہیں۔ اور شیعہ سنی میں جو معرکتہ الآراء اختلافی مسائل ہیں وہ ان دس پاروں میں موجود ہیں۔

بہر حال جس ادیب نے یہ دس پارے مرتب کئے ہیں۔ وہ ادب عربی میں عدیم النظیر تھا۔ ان پاروں کی کوئی آیت فصاحت و بلاغت میں تو قرآن کے درجے پر نہیں ہے مگر یہ التزام ہر آیت میں ہے کہ اول و آخر الفاظ بعینہٖ قرآن مجید کے ہیں اور درمیانی عبارت (اُس) جامع القرآن کی (خود ساختہ) ہے۔ (یاد ایام از مولانا عبدالرزاق کانپوری)

☆......

ابا جان کے عقیدت مندوں میں ایک حجازی عرب بھی تھے' جو کبھی کبھار انہیں قرآن مجید سنایا کرتے تھے' میں نے ان سے قرآن مجید پڑھا ہے' ان کی آواز بڑی پیاری تھی' ابا جان جب بھی ان سے قرآن مجید سنتے' مجھے بلا بھیجتے اور اپنے پاس بٹھا لیتے۔

ایک بار انہوں نے ''سورۃ مزمل'' پڑھی تو آپ اتنا روئے کہ تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ جب وہ ختم کر چکے تو آپ نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور مرتعش لہجہ میں بولے!

تمہیں یوں قرآن پڑھنا چاہئے!

اسی طرح مجھے ایک مرتبہ مسدس حالی پڑھنے کو کہا اور خاص طور پر وہ بند جب قریب بیٹھے

میاں محمد شفیع نے دہرایا:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

تو آپ سنتے ہی آبدیدہ ہو گئے۔ میں نے اماں جان کی موت پر انہیں آنسو بہاتے نہ دیکھا تھا مگر قرآن مجید سنتے وقت یا اپنا کوئی شعر پڑھتے وقت یا رسول اللہ ﷺ کا اسم مبارک کسی کی نوکِ زبان پر آتے ہی ان کی آنکھیں بھر آیا کرتیں۔ (یادیں از جسٹس جاوید اقبال)

......☆......

یورپ پر عربوں کا سب سے بڑا احسان کاغذ کا رواج ہے' کاغذ کے اصل موجد چینی تھے' انہوں نے کاغذ کا ایک کارخانہ سمرقند میں بھی قائم کیا تھا' جب ساتویں صدی عیسوی میں عربوں نے سمرقند کو فتح کیا تو وہاں سے یہ صنعت لے لی۔ اہل چین ریشمی کیڑے کے خول سے کاغذ بناتے تھے' عرب پرانے کپڑوں اور کپاس کو بھی اس مقصد کے لئے استعمال کرنے لگے۔ کاغذ سازی کا پہلا کارخانہ ۷۹۴ء کو بغداد میں قائم ہوا' یہ ہارون الرشید عباسی کا زمانہ تھا' اس کے بعد یہ صنعت دمشق' مصر' نیشاپور' شیراز' خراسان' مراکش' قرطبہ' غرناطہ اور سسلی سے ہوتی ہوئی کوئی دو سو سال کے بعد ۱۱۰۰ء میں قسطنطنیہ پہنچی۔ (یورپ پر اسلام کے احسانات، از غلام جیلانی برق)

......☆......

قطب نما عربوں کی ایجاد ہے' یہ آلہ قرون اولیٰ کے تمام تجارتی و جنگی جہازوں میں لگا ہوا تھا' یہ اسی کی رہنمائی کا کرشمہ تھا کہ ہمارے جہاز ''جدہ'' سے ''چین'' تک جاتے تھے' جب ہم نے یہی چیز یورپ کو دی تو اس کا ''کولمبس'' بحر اطلس کی لہروں کو چیر کر امریکہ جا پہنچا اور واسکوڈی گاما ہندوستان تک نکل گیا۔ (یورپ پر اسلام کے احسانات، از غلام جیلانی برق)

......☆......

اکبر کے دور میں لوگوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی گئی کہ:

''اس صاحبِ زمان کا وقت آ گیا ہے' جو ہندو اور مسلمان کے بہتر (۷۲) فرقوں کے اختلاف کا مٹانے والا ہوگا' اور وہ بادشاہ کی ذات قدسی صفات ہے۔''

اسی سے دین الٰہی اکبر شاہی کا آغاز ہوا' جس میں توحید کے بجائے شرک صریح'

(عبادت آفتاب کی شکل میں) کواکب پرستی' ایمان بالبعث کے بجائے عقیدہ تناسخ تھا' اکبر باقاعدہ بیعت لیتا تھا' اس دین میں داخل ہونے والوں سے جو کلمہ پڑھوایا جاتا تھا اس میں لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ اکبر خلیفۃ اللہ بھی شامل کیا جاتا' کلمہ کے ساتھ ایک اقرارنامہ بھی ہوتا تھا جس میں کہا جاتا تھا کہ:

''میں اپنی خواہش اور رغبت و دلی شوق کے ساتھ' مجازی و تقلیدی دین اسلام سے' جو باپ دادوں سے سنا اور دیکھا تھا' علیحدگی اور جدائی اختیار کرتا ہوں اور اکبر شاہی دینِ الٰہی میں داخل ہوتا ہوں اور اس دین کے اخلاص کے چاروں مرتبوں' یعنی ترکِ مال' ترکِ جان' ترکِ ناموس و عزت' ترکِ دین کو قبول کرتا ہوں۔''

(تاریخ دعوت و عزیمت از مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

☆

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا ارشاد فرمودہ ''زبان کا محاسبہ'' یاد آیا' مرحوم نے لکھا ہے کہ:
روس کے ایک حساب دان نے حساب لگا کر بتایا ہے کہ ہم دن میں اگر دس گھنٹے جاگتے ہیں تو وقت کے تین گھنٹے بیس منٹ بولنے میں صرف کرتے ہیں۔ زبان سے ایک منٹ میں پچاس الفاظ ادا ہوتے ہیں اور اس طرح ہر گھنٹے میں تین ہزار لفظ ہماری زبان استعمال کرتی ہے اور اس بولنے والی میعاد (۳ گھنٹے ۲۰ منٹ) میں ہم دس ہزار ۱۰۰۰۰ ہزار تک الفاظ بول جاتے ہیں۔ اب سال بھر کی بولی کی میزان اگر آپ چاہتے ہیں تو اس روزانہ کی تعداد کو ۳۶۵ سے ضرب دیجئے تاکہ میزان کل ۲۰ سال کی عمر کی بولی ہوئی حاصل ہو۔ اور اگر اتفاق سے کوئی صاحب زیادہ باتونی یا بکی قسم کے واقع ہوئے ہیں یا ان کا پیشہ ہی تقریر و خطابت کا ہے تب تو کئی لاکھ کے اعداد آسانی سے کروڑوں میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔

قرآن مجید کے اس فرمان کو یاد کر لیجئے کہ ادھر بندہ کی زبان سے کوئی لفظ ادا ہوا کہ ادھر پہرہ دار یا نگہبان فرشتے نے اسے دیکھ لیا' اور سوچئے کہ جواب عمر بھر میں ادا کئے ہوئے ان کروڑوں لفظوں میں سے ایک ایک کا دینا ہوگا' کیا آپ اس کے دسویں' بیسویں' سویں' ہزارویں اور لاکھویں حصہ کے لئے بھی تیار ہیں؟

جواب کا مطالبہ نہ ٹل سکے گا نہ اس کے لئے کوئی مہلت ملے گی اور نہ جواب میں حیلہ

سازی یا سخن سازی کی کوئی گنجائش کسی حد تک بھی نہ نکل سکے گی' یا قبل اس کے کہ وہ دن آئے خود ہی اپنے دل میں حساب لگا کر دیکھ لیجئے کہ کتنے لفظ شر اور بدی کی طرف لے جانے والے زبان سے نکلے؟ الفاظ کو سوچ کر اور تول زبان پر لانے کی عادت اگر پڑ جائے تو پھر سمجھ لیجئے کہ بیٹھے بیٹھے جنت بھی حاصل ہو گئی۔ (ساعتے با اولیاء، مولانا عبدالقیوم حقانی)

☆

ایک وہ وقت تھا کہ مٹھی بھر مسلمان ساری دنیا کے مقابلے میں بھاری تھے' جدھر قدم اٹھتے تھے آسمانی نصرت ساتھ ساتھ چلتی تھی اور ہر میدان میں نصر من اللہ و فتح قریب کا وعدہ پورا ہوتا دکھائی دیتا تھا۔ اور آج یہ حال ہے کہ ایک ایک ملک میں کئی کئی کرور ہونے کے باوجود ان کا کوئی وزن اور کوئی اثر نہیں ہے۔ اللہ کی مدد سے موجودہ دور کے مسلمانوں کی محرومی کی ایک نہایت عبرتناک اور سبق آموز مثال اسرائیلی حکومت کے مقابلہ میں عرب حکومتوں کی بے بسی ہے۔ کہیں بالشت بھر زمین پر بھی یہودیوں کی کوئی حکومت نہیں تھی' امریکا اور برطانیہ وغیرہ کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں نے اپنی خاص اغراض کے لئے عرب حکومتوں کے سینہ میں یہودی حکومت کا کھونٹا گاڑا۔ لیکن ساری حکومتیں مل کر بھی اس شرارت اور شیطنت کو نہ روک سکیں اور آج تک اس کے مقابلے میں بے بس ہیں اور یہ تو میں نے ایک مثال دی ورنہ مسلمانان عالم پر ہر روز جو کچھ گزرتی ہے اور عالمِ اسلامی میں آئے دن جو واقعات پیش آتے رہتے ہیں وہ اس حقیقت کا روشن ثبوت ہیں کہ اس دور میں مسلمان من حیث القوم اللہ کی خاص مدد سے محروم ہیں۔

وہ ایک وقت تھا کہ مسلمان قوم کی مصلحت کا تقاضہ اگر تیز ہواؤں کے لیے ہوتا تو اللہ کی طرف سے تیز ہوائیں اور آندھیاں چھوڑ دی جاتی تھیں اور جب مسلمانوں کی مصلحت اس میں ہوتی کہ ہوا ساکن ہو جائے تو ہوا ساکن کر دی جاتی اور جب مسلمانوں کے حالات کا تقاضہ یہ ہوتا کہ بارش ہو جائے تو آسمان سے بارش برستی اور جب بارش کے روک دیے جانے میں مسلمانوں کی مصلحت ہوتی تو بارشیں روک دی جاتیں' غزوۂ احزاب اور غزوۂ بدر میں آندھیوں اور بارشوں سے مسلمانوں کی جو مدد دیں کی گئیں ان کا ذکر تو روایات کے علاوہ قرآن مجید میں بھی ہے......۔

بہر حال جب مسلمانوں کی اجتماعی زندگی اللہ تعالیٰ کی رضا اور رحمت والی زندگی تھی تو اللہ

تعالیٰ زمین و آسمان کی مخفی طاقتوں سے ان کی مدد کرتا تھا اور اس کے نتیجے وہ ہوتے تھے جو قرن اول کی تاریخ میں ہم اور آپ پڑھتے ہیں۔ اور جب سے مسلمانوں کی عام زندگی میں شر اور فساد کا غلبہ ہو گیا اور ان کی اجتماعی حالت رحمت اور نصرت کے قابل نہیں رہی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی قانون کے مطابق ان کو اپنی مدد سے محروم کر دیا۔ اور اب دنیا میں ان کی حالت وہ ہے جو ہم اور آپ عرب و عجم میں آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ (مولانا محمد منظور نعمانی)

☆

کستوری (مُشک) کا تعارف اور فوائد

مشک ایک بہت ہی قیمتی اور کمیاب شئے ہے۔ مگر مچھ کے تذکرے میں مشک کے متعلق علامہ دمیری نے قبطیوں کے نظریہ کو بیان کیا ہے۔ مگر قبطیوں کا یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ ''مشک'' اصل میں فارسی لفظ ہے۔ عربی میں اس کو ''مسک'' اور ترکی میں ''بیار'' ہندی میں ''کستوری'' رومن میں ''مورون'' سریانی میں ''سکہ'' کہتے ہیں۔ مشک فی الحقیقت ہرن کی (ایک مخصوص قسم) ناف میں پیدا ہوتا ہے (ناف یا نافہ) ہرن کے بدن کا وہ حصہ جس میں مشک ہوتا ہے) یہ ہرن بمقابلہ دوسرے ہرنوں کے دبلا پتلا ہوتا ہے۔ اس ہرن کی ناف میں بحکم خدا خون منجمد ہوتا ہے اور کچھ عرصہ بعد اس میں بلا کی خوشبو پیدا ہو جاتی ہے اور یہ منجمد خون ہی مشک ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مشک ہرن کی ناف میں ہوتا ہے مگر وہ اس کی مہک سے اتنا مدہوش ہوتا ہے کہ اسے اپنے اردگرد کی بالکل خبر نہیں رہتی) اور وہ اس کی تلاش میں جنگل جنگل سرگردان پھرتا ہے۔ چنانچہ اسی کو لے کر مشہور ہندی شاعر کبیر داس نے کہا ہے ؎

کستوری کنڈلی بے مرگ ڈھونڈے بن ماہی
ایسے گھٹی گھٹی رام ہیں دنیا دیکھے ناہیں

''مشک ہرن کی ناف میں موجود ہے لیکن وہ اس کی تلاش میں جنگل کو چھان رہا ہے۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے مگر انسان اس کو (یعنی اس کی قدرت کو) پہچان نہیں پاتا۔''

مشک بعض اطباء کے نزدیک چار قسم کی ہوتی ہے۔

(۱) یہ قسم سب سے اعلیٰ ہوتی ہے اور یہ ہرن کی ناف سے بطریق حیض بواسیر کے نکل کر پتھر پر منجمد ہوتی ہے۔ نہایت خوشبودار اور نادر الوجود ہوتی ہے۔

(۲) دوسری قسم مشک کی وہ ہوتی ہے جو یہ جانور اپنی ناف کو پتھروں اور درختوں کے تنوں سے رگڑ کر نکالتا ہے۔ کیونکہ مشک کو جب ہرن کی ناف میں کافی دن ہو جاتے ہیں تو اس کی ناف میں خارش اور گرمی ہونے لگتی ہے جس سے پریشان ہو کر ہرن اپنی ناف کو پتھروں اور درختوں کے تنوں سے رگڑتا ہے جس کے نتیجے میں مشک باہر نکل جاتا ہے۔

(۳) تیسری قسم وہ ہے جو شکاری لوگ شکار کرنے کے بعد ناف کو چیر کر نکالتے ہیں۔ یہ منجمد خون نہیں ہوتا بلکہ چیر کر نکالنے کے بعد اسے خشک کرتے ہیں۔

(۴) چوتھی قسم وہ ہے جو شکاری لوگ شکار کرنے کے بعد اس کی ناف کاٹ کر نکالتے ہیں اور پھر اس خون کو اس کی کلیجی اور مینگنی کے ساتھ گوندھتے ہیں اور اس طرح خشک کر کے ٹکڑے بنا لیتے ہیں۔ لیکن یہ قسم بہت ہی گھٹیا اور معمولی خوشبو والی ہوتی ہے۔

بعض حکماء نے صرف دو قسم کی مشک بیان کی ہے۔ ایک وہ جو پتھروں پر حیض یا بواسیر کی شکل میں نکل کر منجمد ہو جاتی ہے اور دوسری وہ جو ہرن خارش اور گرمی کی وجہ سے اس جگہ کو پتھروں اور درختوں کے تنوں سے رگڑتا ہے جس سے اس کا مشک والا حصہ زخمی ہو جاتا ہے اور مشک بشکل خون نکل کر پتھروں وغیرہ پر جم جاتی ہے اور کبھی اس کے بیچنے والے تھوڑی اصلی مشک سے کافی تعداد میں نقلی مشک بنا کر دھوکہ سے فروخت کرتے ہیں۔ نقلی مشک یہ لوگ اس طرح بناتے ہیں کہ کچھ اصلی مشک لے کر اس میں ریوند چینی بکرے کی کلیجی بونگ اور کبوتر کے خون کے ساتھ ملا کر گوندھنے کے بعد یہ ہرن کے نافہ میں (جو وہ کاٹ کر احتیاط سے رکھتے ہیں) بھرنے کے بعد اس کا منہ اس صفائی سے بند کرتے ہیں کہ دیکھنے والے اندازہ نہیں کر پاتے اور اصلی منہ بند (سیل بند) قدرتی نافہ سمجھتے ہیں ان سے مشک خرید لیتے ہیں اس میں خوشبو برائے نام ہوتی ہے۔

مشک کو پہچاننے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک سوئی دھاگہ پرو کر نافہ میں ڈالتے ہیں۔ پھر اس سوت کو نکال کر لہسن کے پانی میں جس میں کافی تعداد میں لہسن ہوتا ہے ڈالتے ہیں۔ اگر خوشبو لہسن کے دھاگے سے آتی ہے تو وہ مشک نقلی ہے۔ بصورت دیگر اصلی ہے۔

دوسری پہچاننے کی ترکیب یہ ہے کہ اگر مشک نافہ کے باہر ہے تو اس میں سے تھوڑی سے لے کر ہتھیلی پر رکھ کر تھوڑا سا پانی ڈال کر ملیں اگر وہ گھل جائے تو اصلی ہے اور اگر نہ گھلے اور بتی بن جائے تو نقلی ہے۔

تیسری پہچاننے کی ترکیب یہ ہے کہ تھوڑی مشک لیں پھر ایک برتن آگ پر رکھیں اور پھر وہ مشک اس برتن میں ڈالیں۔ اگر اس سے تیز اور اچھی خوشبو آئے تو اصلی ہے ورنہ نقلی، مشک زیادہ وقت گزرنے پر بے اثر ہو جاتی ہے۔ نافہ تین سال تک ٹھیک رہتی ہے اور تین سال بعد بے اثر ہو جاتی ہے۔ نافہ سے باہر ایک سال تک رہتی ہے۔ مشک مقوی باہ وقلب ودماغ ہے۔ حواس باطنی و ظاہری کو پاک وصاف کرتی ہے اور سرعت انزال کے لئے مجرب ہے۔

......☆......

کبوتر کی خاص عادتیں

کبوتر کی خاص عادت یہ ہے کہ اگر اس کو ایک ہزار میل کے فاصلہ سے بھی چھوڑا جائے تو یہ اڑ کر اپنے گھر پہنچ جاتا ہے نیز دور دراز ملکوں سے خبریں لاتا اور لے جاتا ہے۔ ان نامہ بروں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک دن میں تین تین ہزار فرسخ کا فاصلہ طے کر لیتے ہیں اور یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر کسی کا پالتو کبوتر کہیں اور کسی وجہ سے پکڑا گیا اور تین تین سال یا اس سے بھی زیادہ مدت تک اپنے گھر سے غائب رہا مگر باوجود اس طویل غیر حاضری کے وہ اپنے گھر کو نہیں بھولتا اور اپنی اثبات عقل، قوت حافظہ اور کشش گھر پر برابر قائم رہتا ہے اور جب کبھی اس کو موقع ملتا ہے اڑ کر اپنے گھر آ جاتا ہے۔

شکار کرنے والے پرندے اس کی گھات میں رہتے ہیں مگر جس قدر یہ باز سے ڈرتا ہے اتنا کسی دوسرے پرندے سے نہیں ڈرتا حالانکہ اس کی پرواز باز سے کافی تیز ہوتی ہے۔ لیکن باز کا خوف اس قدر ہوتا ہے کہ اس کو دیکھتے ہی اس کے بازو ڈھیلے ہو جاتے ہیں اور اس طرح مرعوب ہو جاتا ہے جیسے گدھا شیر کے سامنے، بکری بھیڑیئے کے سامنے اور چوہا بلی کے سامنے بے حس و حرکت ہو جاتا ہے۔

کبوتر کی طبیعت میں ایک عجیب بات یہ ہے جو کہ ابن قتیبہ نے ''عیون الاخبار'' میں شئی

بن ظہور سے نقل کی ہے کہتے ہیں کہ میں نے مرد اور عورت میں ایسی خصلت نہیں دیکھی جو کبوتروں میں نہ ہو۔ چنانچہ میں نے کبوتری کو دیکھا کہ وہ اپنے جوڑے کے نر کے علاوہ کسی دوسرے نر کو جفتی کی قدرت نہیں دیتی اور نہ ہی نر کسی دوسری کبوتری کی طرف مائل ہوتا ہے۔ البتہ جوڑے میں سے کوئی ایک مرجائے یا بچھڑ جائے تو بات دوسری ہے اور میں نے ایک خاص بات یہ دیکھی کہ جب کبوتر اپنی مادہ سے جفتی کا ارادہ کرتا ہے تو کبوتری فوراً بن سنور جاتی ہے، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبوتری اپنے نر کے ہوتے ہوئے بھی کسی دوسرے نر کو اپنے اوپر جفتی کی قدرت دے دیتی ہے لیکن ایسا معاملہ نادر الوقوع ہوتا ہے اس لئے اس کا اعتبار نہیں۔ اور بعض دفعہ کبوتری کبوتر پر چڑھ کر جفتی کرتی ہے۔ مگر کہتے ہیں کہ اس جفتی سے انڈے تو پیدا ہوتے ہیں مگر ان انڈوں سے بچے نہیں نکلتے۔

بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ نر نر پر اور مادہ مادہ پر چڑھ جاتے ہیں۔ ایک اور حیرت انگیز بات جو کبوتر اور انسان کے علاوہ کسی اور جاندار میں نہیں پائی جاتی وہ یہ ہے کہ کبوتر انسان کی طرح جفتی سے پہلے بوسہ لیتا ہے۔ اس کے علاوہ جفتی کی خواہش نہ ہونے پر بھی یہ آپس میں بوسہ بازی کرتے ہیں۔ کبوتر چھ ماہ تک جفتی کرتا ہے اور کبوتری چودہ دن حاملہ رہتی ہے۔ پہلے اور دوسرے انڈے کے درمیان ایک دن اور ایک رات کا فاصلہ ہوتا ہے۔ ایک انڈے سے نر اور ایک سے مادہ بچہ پیدا ہوتا ہے۔ دن کے کچھ حصہ میں نر انڈوں پر بیٹھتا ہے اور باقی حصہ میں مادہ انڈوں کو سیتی ہے اور انڈے دینے کے وقت نیز انڈے دینے کے بعد اگر کبوتری اپنے خانہ میں نہیں جاتی تو کبوتر مار کر اس کو خانہ میں لے جاتا ہے اور مستقل اس کے پیچھے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے کبوتر کو یہ صلاحیت بھی عطا فرمائی ہے کہ جب بچہ نکل آتا ہے تو کبوتر شور مٹی (کھاری مٹی) چبا کر ان کو کھلاتا ہے تا کہ ان کے کھانے کا راستہ صاف ہوجائے. **فسبحان اللطیف الخبیر الذی اتی کل نفس ھداھا** (پس پاک ہے وہ ذات جو لطیف و دانا ہے اور جس نے ہر جاندار کو اس کے مناسب و ضروری ہدایت دی ہے۔)

ارسطو نے کبوتر کی عمر کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ عام طور پر کبوتر کی عمر آٹھ سال ہوتی ہے۔

قرآن پاک کی اس آیت **وربک یخلق ماشاء ویختار** (تحقیق تیرا رب جسے

چاہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہے منتخب کرتا ہے) کی تفسیر میں ثعلبی وغیرہ نے وہب بن منبہ سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چوپاؤں میں سے بکری اور پرندوں میں سے کبوتر کو اختیار کیا ہے (یعنی پسند فرمایا ہے)۔

......☆......

ولادت میں آسانی کے لئے عملیات

(۱)...... عکرمہ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ایک گائے کے قریب سے گزرے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ گائے کے پیٹ میں اس کا ہونے والا بچہ اسپے چین کررہا ہے۔ گائے نے فریاد کی اور کہا کہ اے روح اللہ! آپ میری اس پریشانی سے نجات کے لئے خداوند قدوس سے دعا فرمائیے۔

چنانچہ آپ نے یہ دعا کی:۔

یا خالق النفس من النفس ویا مخرج النفس من النفس خلصها.

بس عیسیٰ علیہ السلام کا یہ دعا کرنا تھا کہ گائے نے بچہ جن دیا۔ اس کے بعد ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اگر کسی عورت کو ولادت کے وقت تنگی یا دشواری پیش آئے تو وہ کلمات بالا کو لکھ کر باندھ لے۔ (کتاب المجالسۃ لاحمد بن مروان المالکی الدینوی)

اسی طرح سعید بن جبیر سیدنا عبداللہ بن عباسؓ کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ اگر کسی عورت کو ولادت کے وقت تنگی یا دشواری پیش آئے تو وہ مندرجہ ذیل کلمات لکھ کر باندھ لے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم . لااله الا الله الحليم الكريم سبحان الله رب العرش العظيم الحمد لله رب العالمين كانهم يوم يرونه ما يوعدون لم يلبثوا الا ساعة من النهار بلاغ فهل يهلك الا القوم الفاسقون .

(۲)...... امام دمیریؒ کہتے ہیں کہ غالباً اسی قسم کا مضمون حدیث میں بھی آیا ہے۔

چنانچہ انسؓ کہتے ہیں:

ولادت کا مجرب اور آزمودہ عمل یہ ہے کہ مندرجہ ذیل کلمات لکھ کر بتلائے دردزہ کو پلادے۔

بسم الله الرحمن الرحیم سورہ فاتحہ بسم الله الرحمن الرحیم سورہ صمد
بسم الله الرحمن الرحیم سورہ فلق بسم الله الرحمن الرحیم سورہ ناس
بسم الله الرحمن الرحیم . اذا السماء انشقت واذنت لربها وحقت واذا الارض مدت والقت ما فیها وتخلت اللهم یا مخلق النفس من النفس یا مخرج النفس من النفس یا علیم یا قدیر خلص فلانة ما فی بطنها من ولدها خلاصا فی عافیه انک ارحم الراحمین.

سینہ کے درد سے نجات حاصل کرنے کے لئے

مسلمہ بن عبدالملک ابن مروان معہ اپنی فوج ولشکر کے جب مقام عموریہ میں داخل ہوئے تو ان کے سینے میں درد ہو گیا جس کی بناء پر وہ لڑائی میں شریک نہ ہو سکے۔ اہل عموریہ نے مسلمانوں سے سوال کیا کہ تمہارے کمانڈر میدان کارزار میں کیوں تشریف نہیں لائے۔ مسلمانوں نے جواب دیا ان کے سینے میں بہت سخت درد ہے وہ لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اہل عموریہ نے مسلمانوں کو ایک لباس دیا کہ یہ اپنے امیر کو پہنا دینا بہت جلد سینے کے درد سے نجات حاصل ہو جائے گی۔ چنانچہ مسلمانوں نے ایسا ہی کیا۔ لباس کے پہنتے ہی مسلمہ بن عبدالملک کے سینہ کا درد فوراً ختم ہو گیا۔ مسلمانوں کو بہت تعجب ہوا کہ اس میں ایسی کون سی چیز ہے جس کی بناء پر درد فوراً جاتا رہا۔ مسلمانوں نے اس لباس کو ادھیڑنا شروع کیا تو اس میں سے ایک پرچہ ملا جس پر مندرجہ ذیل آیتیں لکھی ہوئی تھیں۔

بسم الله الرحمن الرحیم. ذالک تخفیف من ربکم ورحمة. بسم الله الرحمن الرحیم الئن خفف الله عنکم خلق الانسان ضعیفا بسم الله الرحمن الرحیم واذا سألک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوة الداع اذا دعان بسم الله الرحمن الرحیم الم ترالیٰ ربک کیف مد الظل ولوشاء لجعله ساکنا بسم الله الرحمن الرحیم وله ما سکن فی اللیل والنهار وهو السمیع العلیم.

مسلمانوں نے ان عیسائیوں سے پوچھا کہ یہ آیتیں تمہیں کہاں سے ملی ہیں۔ یہ تو ہمارے آقا سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہیں۔ اہل عموریہ نے جواب دیا کہ یہ آیتیں

آپ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے سات سو سال قبل گرجے میں پتھر پر لکھی ہوئی ملی تھیں۔

حافظ ابن عساکر کہتے ہیں کہ سینے میں درد کے لئے مندرجہ ذیل آیتیں لکھ کر باندھنا بھی مفید و مجرب ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم . کٓھٰیٰعٓصٓ ذکر رحمة ربک عبده زکریا اذ نادیٰ ربه نداءً خفیا قال رب انی وهن العظم منی واشتعل الرأس شیبا ولم اکن بدعائک رب شقیا الم تر الیٰ ربک کیف مد الظل ولو شاء لجعله ساکنا کٓھٰیٰعٓصٓ حٰمٓ عٓسٓقٓ کم لله من نعمة فی کل عبد شاکر وغیر شاکر وکم لله من نعمة فی کل عرق ساکن وغیر ساکن اذهب ایها الصدع بعز عزالله وبنور وجه الله وله ما سکن فی اللیل والنهار وهو السمیع العلیم ولا حول ولا قوة الا بالله العلی العظیم وصلّی الله علیٰ سیدنا محمد خاتم النبیین والمرسلین وعلیٰ اٰله واصحابه اجمعین.

اگر کسی شخص کے سر میں درد ہو تو مندرجہ ذیل حروف لکڑی کی تختی پر لکھ کر یکے بعد دیگرے لوہے کی میخ (کیل) سے ان حروف کو دباتا رہے اور یہ آیت پڑھتا رہے

ولوشاء لجعله ساکنا. وله ماسکن فی اللیل والنهار وهوالسمیع العلیم.

وہ حروف یہ ہیں: اح اک ک ح ع ح ام ح۔ انشاء اللہ بہت جلد درد ختم ہو جائے گا۔

علامہ دمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ عمل بہت زیادہ آزمایا ہوا ہے اور سر کے درد کے لئے بہت مفید ترین ہے۔

✿✿✿✿✿

گلہائے رنگارنگ

جن لوگوں نے فراغت، گوشہ چمن اور کتاب کی آرزو کی ہے، بے جا نہیں کی اور جس کسی نے کتاب کو زمانے بھر میں بہترین ہم نشین قرار نہیں دیا، اور جس اللہ کی بندی نے شوہر کے کتابی استغراق کو دیکھ کر کتاب کو سوسوکنوں پر بھاری ٹھرایا تھا، اس دل جلی نے یونہی دل کے پھپولے نہیں پھوڑے تھے۔ اس دنیا میں پورا کر دینے والے صحرا بھی آتے ہیں اور ظلمت میں ڈوبے ہوئے دشت و بیاں باں بھی، ٹمٹماتے ہوئے ستارے بھی دکھائی دیتے اور دل ودماغ کو معطر وتروتازہ کرنے والے پھولوں پر بھی نظر پڑتی ہے۔ کبھی کوئی شعر تڑپا دیتا ہے اور کبھی کوئی جملہ وجد کی سی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ کبھی کوئی حکایات مرّبی اور مرشد کا کام دے جاتی ہے ایسے مواقع پر ایک باذوق قاری کے دل میں بے ساختہ یہ خیال آتا ہے کہ جن مناظر نے مجھے متاثر کیا ہے وہ دوسروں کو بھی دکھادوں جن اشعار اور جملوں نے تڑپایا ہے وہ اوروں کو بھی تڑپائیں جن واقعات و حکایات نے میرے دل کی دنیا تہہ وبالا کیا ہے وہ سب کے دل پر اثر کرے فیض رسانی اور افادہ عام کا یہی وہ جذبہ ہے **گلہائے رنگارنگ** جو جیسی کتابوں کی تالیف وترتیب کا سبب بنتا ہے۔

مولانا محمد اسلم شیخوپوری

4/491 شاہ فیصل کالونی کراچی
Tel: 021-4594144 Cell: 0334-3432345